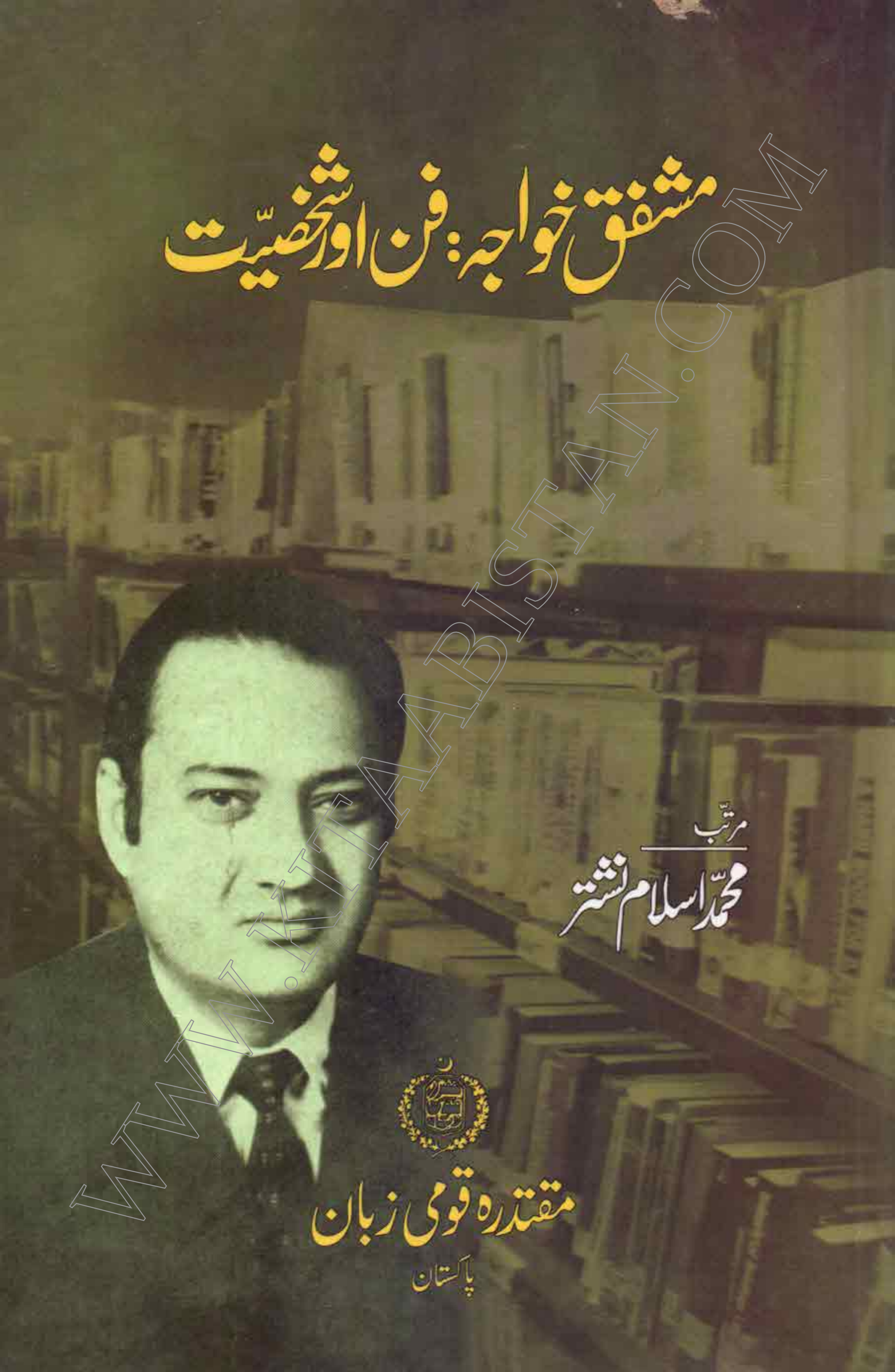

مشفق خواجہ: فن اور شخصیت

مرتّب
محمّد اسلام نشتر

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

Scanning Project 2016

Book No.114

Donated By:
Rashid Ashraf

Special Courtesy :
Salman Siddqui
Amin Tirmizi

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

مشفق خواجہ: فن اور شخصیّت

مرتب

محمدؐ اسلام نشتر

مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان
۲۰۰۸ء

WWW.KITAABISTAN.COM

جملہ حقوق بحق مقتدرہ محفوظ ہیں

سلسلہ مطبوعات: ۴۷۴

عالمی معیاری کتاب نمبر ۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۱۸۴-۰

☆

طبع اول ——— ۲۰۰۸ء
تعداد ——— ۵۰۰
قیمت ——— ۲۵۰ روپے
فنی تدوین وادارت ——— محمد اسلام نشتر
کمپوزنگ ——— طاہر محمود/ مشتاق انجم
ترتیب وصفحہ بندی ——— تنویر احمد/ محمد جواد ہاشمی
پروف خوانی ——— حاجی غلام مہدی
اہتمام ——— محمد جاوید اختر
مطبع ——— ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر ——— پروفیسر فتح محمد ملک
صدر نشین
مقتدرہ قومی زبان
پطرس بخاری روڈ، ایچ ۴/۸
اسلام آباد۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

پیش لفظ

نامور محقق، نقاد اور انشاء پرداز مشفق خواجہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے کام میں ایک ادارہ تھے۔ اُن کے اس دُنیا سے یوں اچانک اُٹھ جانے سے ایک انجمن کا چراغ گل ہو کر اور ایک ادارہ ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر چند مرحوم ہماری تہذیبی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کر گئے ہیں تاہم اُن کے اہلِ خاندان نے اتنے بڑے قومی نقصان کی تھوڑی سی تلافی ضرور کر دی ہے اور وہ یوں کہ انھوں نے علامہ اقبال ٹاؤن میں مشفق خواجہ لائبریری اور ریسرچ سنٹر قائم کر دیا ہے جس میں اُن کے سارے کے سارے ذخیرۂ کتب و مخطوطات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کا ہونہار بھتیجا ناصر جاوید اس ادارے کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر مقرر ہوا ہے۔ یہ اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ محبت اور محنت کے ساتھ اس ادارے کو پاکستان کا ایک عظیم ادارہ بنا دیں گے۔

مرحوم مقتدرہ قومی زبان کی ہیئت حاکمہ کے ایک اہم رکن بھی تھے۔ مقتدرہ قومی زبان اُن کی اس وابستگی پر ہمیشہ نازاں رہے گا۔ ہم اردو زبان و ادب اور مقتدرہ قومی زبان پر اُن کے بے پایاں التفات کے پیشِ نظر یہ کتاب قارئینِ ادب کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ میرے رفیقِ عزیز جناب محمد اسلام نشتر نے مشفق خواجہ مرحوم کے گوناگوں کمالات پر اہلِ علم سے مضامین لکھوائے اور پھر ان مضامین کی بڑی محنت کے ساتھ ترتیب و تدوین سے یہ کتاب تیار کی ہے۔ میں اُن کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کو مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں یہ کتاب شائع کرنے کی سعادت بخشی۔

—— پروفیسر فتح محمد ملک

دیباچہ

مشفق خواجہ کے نام اور کام سے اردو ادب کا ہر طالب علم ہی نہیں اردو زبان کے بین الاقوامی حلقے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ اردو تحقیق سے وابستگی انھیں اپنے والد خواجہ عبدالحی سے ودیعت ہوئی۔ سولہ سترہ سال انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے جہاں انھیں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ساتھ علمی و ادبی کام کرنے کا اعزاز حاصل رہا۔ بابائے اردو نے بھی اس ہیرے کو تراشنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یوں یہ ہیرا آگے چل کر اپنے دور میں اردو زبان و ادب کا نامور ہیرو ثابت ہوا۔ سہ ماہی 'اردو' اور ماہنامہ 'قومی زبان' کے مدیر رہنے کے علاوہ 'قاموس الکتب' کی ادارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ ''خوش معرکۂ زیبا''؛ ''پرانے شاعر نیا کلام''؛ ''ادبیات''؛ ''اقبال''؛ ''غالب اور صفیر بلگرامی''؛ ''جائزہ مخطوطات اردو''؛ ''تخلیقی ادب''؛ ''تحقیق نامہ'' جیسی سنگ میل ادبی کتب لکھنے والے مشفق خواجہ نے جب خامہ بگوش کے قلمی نام سے اخبارات میں ادبی تنقیدی کالم لکھے تو ان کا ایک اور ہی ادبی رنگ منظر عام پر آیا۔ مشاعروں سے دور رہتے تھے مگر خود کمال کی شاعری کرتے تھے۔

مشفق خواجہ کی زندگی کا ایک خوشگوار پہلو اردو زبان و ادب کے نہ صرف نوآموز بلکہ ثقہ محققین کی بھی اپنے کتب خانے سے علمی و ادبی معاونت صدقہ جاریہ تھا۔ چنانچہ انھیں 'خواجہ ادیب نواز' بھی کہا جاتا تھا۔ برصغیر کے ہزارہا لوگ اپنے علمی و ادبی مسائل کے لیے آپ سے کسی نہ کسی صورت رابطہ کرتے اور فیض پاتے۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے مشفق خواجہ کو حُسن کارکردگی کا اعزاز عطا کر دیا تھا مگر ان کا اصل اعترافِ خدمات بعد از وفات اردو ادب کے محققین کا ان پر کیا جانے والا تحقیقی کام ان کا دائمی اعتراف خدمات کہلا سکتا ہے۔

''مشفق خواجہ: فن اور شخصیت'' ان کی وفات کے بعد اہل علم و دانش اور صاحبان زبان و ادب کے دل کی آواز اور ان کے کارہائے نمایاں کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ مشفق خواجہ غالباً وہ واحد اہل قلم ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں اپنی ذات پر کسی سے کبھی کچھ لکھوانا کسرِ شان جانا مگر ان کی وفات کے بعد ان پر اس قدر لکھا گیا کہ لوگ حسرت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ کتاب تین حصوں پر مبنی ہے: اول: آوازِ خلق، دوم: مشفق نامے اور سوم: اندازِ بیاں اور۔ ''آوازِ خلق'' میں اردو کے نامور اہل قلم کے وہ مقالات ہیں جو انھوں نے مشفق خواجہ کے علمی و ادبی مقام و مرتبہ اور سپاس گزاری کے حوالے سے لکھے۔ اس سے ہم بحیثیت انسان مشفق خواجہ کی شخصیت کا تجزیۂ نفسی بآسانی کر سکتے ہیں۔ کتاب میں خواجہ صاحب کے ایسے صائب الرائے احباب کے مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

فہرست

نمبر شمار	عنوان		صفحہ
☆	پیش لفظ	پروفیسر فتح محمد ملک	۳
☆	دیباچہ	محمد اسلام نشتر	۵
	پہلا حصہ: آوازِ خلق		۹
۱۔	مشفق خواجہ...... ایک تعزیت نامہ	ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی	۱۱
۲۔	اے مشفقِ من......	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۹
۳۔	مشفق خواجہ	ڈاکٹر سلیم اختر	۴۱
۴۔	کچھ وقت خواجہ ادیب نواز کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۴۸
۵۔	غروبِ آفتاب	حافظ صفوان محمد چوہان	۶۴
۶۔	ذکرِ خیر مشفق خواجہ کا	ڈاکٹر خلیق انجم	۸۵
۷۔	مشفق خواجہ اور عصری ادب	ڈاکٹر مظفر علی سید	۹۸
۸۔	کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں	پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۰۴
۹۔	مشفق خواجہ سے چند ملاقاتیں	سید محمد عقیل رضوی	۱۱۱
۱۰۔	مشفق خواجہ اور ان کا 'کتب خانہ'	محمد راشد شیخ	۱۱۴
۱۱۔	خامہ بگوش کا اُسلوب	وحید الرحمٰن خان	۱۱۹
۱۲۔	فقیرانہ آئے	ڈاکٹر عائشہ عثمان	۱۴۸
۱۳۔	مشفق خواجہ: نگینہ شخص رخصت ہوا	ڈاکٹر ممتاز احمد خان	۱۵۵
۱۴۔	مشفق خواجہ: سرچشمۂ فیض	ڈاکٹر انور محمود خالد	۱۵۸
۱۵۔	مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں	ڈاکٹر انور محمود خالد	۱۶۶

۱۶۔	میرے مشفق خواجہ	شیخ محمد علی	۱۷۴
۱۷۔	خواجہ اور خامہ	ڈاکٹر آغا سہیل	۱۸۱
۱۸۔	مشفق خواجہ سے ایک یادگار ملاقات	محمد عالم مختار حق	۱۸۸
	دوسرا حصہ۔ مشفق نامے		۱۹۵
۱۹۔	مکاتیب بنام	رشید حسن خان	۱۹۷
۲۰۔	مکاتیب بنام	ڈاکٹر خلیق انجم	۲۰۱
۲۱۔	مکاتیب بنام	محمد حمزہ فاروقی	۲۰۳
۲۲۔	مکاتیب بنام	پروفیسر گیان چند جین	۲۴۵
۲۳۔	مکاتیب بنام	ساقی فاروقی	۲۴۷
۲۴۔	مکاتیب بنام	نیر مسعود	۲۶۴
۲۵۔	مکاتیب بنام	ڈاکٹر اسلم پرویز	۲۶۶
۲۶۔	مکاتیب بنام	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۲۶۸
۲۷۔	مکاتیب بنام	ڈاکٹر انور محمود خالد	۲۸۸
	تیسرا حصہ: اندازِ بیاں اور		۲۹۱
۲۸۔	حیات نامہ		۲۹۳
۲۹۔	میری کالم نگاری		۲۹۶
۳۰۔	انتخاب خامہ بگوش		۳۰۰
۳۱۔	شاعری پر شب خون		۳۱۱
۳۲۔	نمونۂ کلام		۳۱۷
۳۳۔	**مآخذ**		۳۳۰

پہلا حصہ

آوازِ خلق

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

مشفق خواجہ ـــــــ ایک تعزیت نامہ

وہ ۲۰۔ فروری کی رات تھی جب مشفق خواجہ نے اس خاندان میں آخری سانسیں لیں۔ خواجہ کی زندگی میں سب کچھ تھا مگر ڈرامائی کیفیت نہ تھی لیکن ان کی موت کا اچانک پن ایک المیہ ڈرامے کی یاد دلاتا ہے۔

میرے اور مشفق کے تعلقات کی مدت ۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۵ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ مشفق خواجہ ۱۹۵۲ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد لاہور سے کراچی آئے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید حکومتِ پاکستان کے ایک اعلیٰ افسر تھے لیکن ان کی شناخت افسری نہیں بلکہ علم تھا۔ وہ اسلامیات اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ خاصا بڑا تھا۔ کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہ سہی لیکن یہ کتابیں ادب، تاریخ اور اسلامیات کی چنی ہوئی بہترین کتابیں تھیں۔ خواجہ عبدالوحید صاحب اقبال اکیڈمی کے نہایت سرگرم افرادِ کار میں سے ایک تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی رشتہ داری بھی تھی۔ علامہ اقبال کی پہلی بیوی ان کی قریبی رشتہ دار تھیں۔ مشفق خواجہ نے کراچی آ کر اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اسلامیہ کالج اس وقت گرومندر کے اس بنگلے میں قائم تھا جہاں بعد میں اسلامیہ کالج برائے خواتین قائم ہوا۔ اسلامیہ کالج میں طلبہ کی تعداد بہت نہ تھی لیکن اسلامیہ کالج کو اپنے دو استادوں کی وجہ سے شہر میں وقعت حاصل تھی؛ ایک تو پروفیسر کرار حسین اور دوسرے محمد حسن عسکری۔ کئی اور بھی لائق استاد اس زمانے میں اسلامیہ کالج سے وابستہ تھے؛ مثلاً فارسی میں ڈاکٹر عابد علی خان، تاریخ اسلام میں ڈاکٹر ناظم، عربی میں جلیل الرحمٰن اعظمی۔ کالج کے پرنسپل خورشید احمد چشتی تھے جو اینگلو عربک کالج دہلی کے سابق استاد تھے۔ چشتی صاحب اچھے انسان اور اچھے تعلیمی منتظم تھے۔ اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی میں تدریس شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ ایم اے کی تعلیم مقامی کالجوں میں ہوتی تھی۔ اسلامیہ کالج اُردو انگریزی اور عربی میں ایم اے کی تعلیم کے لیے بہت ممتاز تھا۔ میں اسلامیہ کالج میں ایم اے کا طالب علم تھا اور اسی زمانے میں اسٹوڈنٹ لیکچرر مقرر کیا گیا اور یونیورسٹی نے اس تقرری کی منظوری دے دی۔ میرے ساتھ اس زمانے میں دوسرے شعبوں میں کئی ایسے لوگ زیر تعلیم تھے جنھوں نے آگے چل کر اپنے اپنے شعبوں میں بڑا نام کمایا۔ ان لوگوں میں امتیاز حنیف تھے جو اسٹیٹ بینک کے ڈپٹی گورنر ہوئے۔ پروفیسر حسنین کاظمی تاریخ اسلام کے شعبے کے طالب علم تھے۔ انکم ٹیکس کے کمشنر اظہر حسن صدیقی عربی میں ایم اے کر رہے تھے۔ مشہور ادیب سجاد باقر رضوی انگریزی کے طالب علم تھے۔ چند برسوں بعد تابش دہلوی مرحوم نے اسی کالج میں داخلہ لیا۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

پاکستان بننے کے بعد یہ وہ زمانہ تھا جب نگاہوں میں مستقبل کی چمک تھی اور لوگوں میں احساس ذمہ داری تھا۔ استادوں اور طالب علموں کے درمیان محبت اور انسیت کا وہ رشتہ تھا جس کو علم نے مضبوط بنا دیا تھا۔ ہر وقت کتابوں اور علم کا تذکرہ رہتا اور پاکستان سے وابستگی ہم سب میں نشاط کار پیدا کرتی تھی۔ استادوں اور طالب علموں کے درمیان ایک معیاری عددی تناسب تھا۔ اس زمانے میں جب میں نے پڑھانا شروع کیا تو میرے اوّلین طالب علموں میں آمنہ کمال، مشفق خواجہ اور انعام صدیقی شامل تھے۔ ان تین اوّلین طالب علموں میں سے اب آمنہ کمال ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اللہ انھیں صحت کے ساتھ زندہ رکھے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

کلاس کے علاوہ یہ طالب علم شعبۂ جغرافیہ کے کمرے میں میرے ساتھ بیٹھتے اور ہم لوگ نصاب کے علاوہ گھنٹوں ادب اور علم کی باتیں کرتے۔ وقت کا بھی احساس نہ ہوتا اور سارا دن اسی لکھنے پڑھنے میں بیت جاتا۔ ان تینوں کے علاوہ ہماری اس محفل میں سعیدہ آصف علوی، امیر علی امام، مرتضی شفیع بھی موجود ہوتے۔ سعیدہ آصف علوی کموڈور آصف علوی کی بیگم تھیں اور قرۃ العین حیدر کی ہم جماعت۔ خاصے وقفے کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جوڑا تھا۔ امیر علی امام مشہور مسلم لیگی لیڈر اور تحریک پاکستان کے مجاہد حسین امام مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ مرتضی شفیع میرے اسکول کے ساتھی تھے لیکن تعلیمی وقفے کے سبب انھوں نے بعد میں ایم اے کیا۔ ہماری ان محفلوں اور غیر رسمی کلاس میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو جاتے؛ مثلاً سلیم قریشی۔ یہ سیاسیات پڑھاتے تھے اور بعد میں البرٹا یونیورسٹی کناڈا میں پروفیسر اور کلیہ فنون کے ڈین ہوئے۔

میں انعام صدیقی اور مشفق خواجہ کالج کے اوقات کے علاوہ شام میں بھی ایک ساتھ گزارتے تھے۔ ہم لوگ صدر کے چائے خانوں کے اس وقت کے مشہور ادیبوں اور لکھنے والوں کے ساتھ بیٹھتے، چائے نوشی کے ساتھ اپنے ذوق ادب کو پروان چڑھاتے اور ادبی گفتگو کے ساتھ ساتھ غیبت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ کبھی کبھار پشاوری ہوٹل میں صادقین بھی آ جاتے تھے اور ادب کے علاوہ فنون لطیفہ بھی ہمارے دائرۂ گفتگو میں آ جاتے تھے۔ مشفق خواجہ جہانگیر ایسٹ کے ایک کوارٹر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی گلی میں ابن انشا کا مکان بھی تھا۔ دو ایک سال کے بعد ابن انشاء سے میرے تعلقات بڑھے۔ کالج سے نکل کر میں مشفق خواجہ کے ساتھ ان کے گھر آ جاتا اور آرام کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے والد کے کتب خانہ سے استفادہ کرتا۔ یہ قربت صرف میری اور میرے شاگردوں کے درمیان نہ تھی بلکہ دوسرے استاد بھی اپنے شاگردوں کے بے حد قریب تھے۔ جو بزرگ استاد تھے وہ طالب علموں کی ضروریات کو بھی نظر میں رکھتے اور نہایت سلیقے سے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ان کی ضروریات کو پورا کرتے۔ میں، مشفق خواجہ اور انعام صدیقی دوپہر میں فارسی کے استاد عابد علی خان کے گھر میں چلے جاتے۔ خان صاحب ہمیں دیکھتے ہی اپنے چپڑاسی کو بلاتے اور اس سے چائے، بسکٹ، ڈبل روٹی سلائس اور شامی کباب منگواتے پھر خان صاحب علی گڑھ کی اور اپنے استادوں کی باتیں چھیڑ دیتے تھے۔ وہ باتیں کرتے جاتے اور ہم لوگ ان کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ اپنا پیٹ بھی بھرتے جاتے۔ استادوں اور شاگردوں کے ہمہ وقتی تعلقات سے یہ نکتہ ہماری زندگی کی حقیقت بن گیا کہ استاد اور شاگرد ایک دوسرے کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور یہ تعلق صرف کالج کے چند گھنٹوں تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ اس قربت کے نتیجے میں استادوں اور شاگردوں دونوں کی تربیت ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے کی نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی میں جھوٹ، منافقت اور سازشوں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی اور حفظ مراتب قائم رہتا ہے۔ البتہ انقلاب زمانہ کے بعد میں میری ان ہی آنکھوں نے دیکھا کہ طالب علم استاد کے ساتھ سگریٹ پی رہا ہے بلکہ بات تو ہم نوشی تک جا پہنچی۔ ہمارے دور میں نہایت قربت کے باوجود حفظِ مراتب کا لحاظ رکھا جاتا اور یہ بات ہماری زندگی کا آئین تھی کہ

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

مشفق خواجہ اسی زمانے سے اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کی شاعری محض قافیہ بندی تک محدود نہ تھی بلکہ وہ غزل کے اسلوب کو پہچانتے تھے۔ اساتذہ کا اچھا مطالعہ کر لیا تھا اور اپنے ہم عصر شاعروں کے اسلوب سے بھی آگاہ تھے۔ مشفق خواجہ کی حسِ مزاح میں تیزی اور شوخی کے ساتھ ساتھ تہذیب بھی تھی۔ وہ بزرگوں کے سامنے بھی ایسی باتیں کہہ جاتے جن سے سبھی لطف اندوز ہوتے۔

کالج کے چار برسوں میں مشفق خواجہ سے تعلقات میں زیادہ استحکام پیدا ہوا اور ان کی کئی خوبیاں سامنے آئیں۔ وہ کالج کے میگزین کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے اور طے کیا گیا کہ ایک ضرورت مند ادیب سے میگزین چھپوایا جائے تاکہ خاصی معقول رقم انھیں معاوضے کے طور پر دی جاسکے۔ پھر ہوا یوں کہ وہ صاحب بغیر ڈکار لیے پوری رقم ہضم کر گئے۔ اس میں ان کا قصور اتنا نہیں تھا جتنا حالات کا جبر تھا۔ میرا ردِ عمل شدید تھا مگر مشفق خواجہ نے بڑی نرمی سے کہا کہ اس سال اگر میگزین نہ چھپا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ مشفق خواجہ نے اس بات کا خاص لحاظ رکھا کہ بات کراچی کے ادبی حلقوں تک نہ پہنچے۔ خواجہ صاحب نے کئی ادبی نشستیں اس سال برپا کیں جن میں اہم ادیب بلائے جاتے تھے۔ ان محفلوں میں جو خرچ آیا وہ ہم لوگوں نے اپنی جیب سے ادا کیا۔ اس طرح طالب علموں کو یقین ہو گیا کہ میگزین نکالنے کی جگہ ہم لوگوں نے میگزین کا روپیہ ان محفلوں پر خرچ کر دیا۔ یوں ہم پر بھی یکبارگی بوجھ نہیں پڑا اور بات بنی رہی۔

مشفق خواجہ کالج کے اس ابتدائی دور ہی میں سنجیدہ کاموں کی طرف راغب ہو گئے تھے اور تذکروں سے ان کی آگہی بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی خاصی وسیع ہو گئی تھی۔ اسی طرح وہ کام جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں کیا اس کا ڈول وہ کالج ہی کے زمانے میں ڈال چکے تھے۔ اپنی ان ہی محفلوں میں، میں نے مشفق خواجہ کا تنقیدی تعارف یگانہ چنگیزی سے کرایا اور یہ نکتہ ان کے سامنے پیش کیا کہ یگانہ کی غالب شکنی کا باعث لکھنوی شعراء کے خلاف ان کا ردعمل تھا۔ اس ضمن میں، میں نے ان کو یگانہ پر آتش لکھنوی کے اثرات کی طرف متوجہ کیا۔ کلیاتِ یگانہ پر انھوں نے برسوں کام کیا اور ۲۰۰۲ء میں کلیاتِ یگانہ اردو دنیا کے سامنے پیش کی۔ ان کا یہ کارنامہ ادبی تدوین کا ایک شاہکار ہے اور انھوں نے اپنی نسل کو قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ خواجہ صاحب کے کردار کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کے کسی بھی فیض یا استفادے کو احسان کی طرح یاد رکھتے اور اس کا اعتراف کشادہ دلی کے ساتھ کرتے تھے۔ کلیات یگانہ کے دیباچۂ مرتب کا اختتام اس پیراگراف پر ہوتا ہے:

> ''......اور آخر میں ایک اہم بات جو مجھے شروع ہی میں عرض کرنی چاہیے تھی لیکن جی چاہا خاتمۂ کلام اس پر ہو۔ یگانہ سے میری دلچسپی کا باعث میرے دو اساتذہ ہیں۔ کالج میں ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور کالج سے باہر جناب خلیق ابراہیم خلیق نے میرے ادبی ذوق کی تربیت کی۔ یگانہ کے بارے میں ان دونوں کی فکر انگیز گفتگوؤں نے مجھے اس منفرد شاعر سے دلچسپی لینے کا راستہ دکھایا۔ کلیات کی تدوین کے اس کام کو ان ہی دونوں کا فیضان سمجھنا چاہیے۔''

اس چھوٹے سے پیراگراف کو اسلوب کے لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چند لفظوں میں پوری داستان کو سمیٹ لینے کا فن مشفق کو آتا تھا۔ انھوں نے ایک دو جملوں میں جس طرح اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے، اسے استاد فراموشی کے اس دور میں کرامت کہنا چاہیے۔

اس پیراگراف سے مجھے ایک بات یاد آئی۔ کئی باتوں کی وجہ سے مشفق خواجہ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم کے تعلقات میں کچھ رخنے پیدا ہوئے اور ان شگافوں کو دوسروں نے وسیع کر دیا۔ ایک مرتبہ ہندوستان سے ایک ادیب اور استاد ڈاکٹر انصار اللہ آئے۔ ایک شام وہ ڈاکٹر ابواللیث صاحب کے ہاں مدعو تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے اجازت دیجیے، مجھے مشفق خواجہ صاحب کے ہاں جانا ہے۔ لیث صاحب نے کہا چلیے میں آپ کو پہنچاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی گاڑی نکالی اور انصار اللہ صاحب

کے ساتھ ناظم آباد مشفق خواجہ کے گھر تشریف لے گئے۔ خواجہ صاحب کے دروازے پر ڈاکٹر انصار اللہ کو اتارتے ہوئے لیث صاحب نے کہا مجھے ضروری کام سے یونیورسٹی پہنچنا ہے، آپ مشفق خواجہ کو میری دعا پہنچا دیجیے گا، وقت ہوتا تو میں بھی اس صحبت میں شریک ہوتا۔ اس بات کا مشفق خواجہ پر بہت اثر پڑا اور اس کے بعد لیث صاحب کے سلسلے میں ان کا رویہ بالکل بدل گیا۔

ہندوستان سے جو ادیب پاکستان آتے ہیں یا پاکستان سے ہندوستان جاتے ہیں، چند ہی دنوں میں انھیں مقامی ادیبوں کی باہمی رنجشوں اور آویزشوں کا پورا کچا چٹھا معلوم ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں لیث صاحب کا یہ طرزِ عمل ایک استاد کے شایانِ شان تھا۔ جب میرا چھوٹا بھائی ابوالحسنات حقی کچھ دنوں کے لیے پاکستان آیا تو خواجہ صاحب سے کئی مرتبہ ملنے گیا۔ ایک دن خواجہ صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کشفی صاحب نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں ان کا شاگرد ہوں۔ یہ بات ابوالحسنات نے مجھ سے کہی اور میں نے ٹیلی فون پر خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ دور وہ ہے کہ جب شاگرد کہیں کہ وہ میرے استاد ہیں تو شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ خود کہنے کی بات نہیں اور میں نے یہ بات اپنی کتاب ''یہ لوگ بھی غضب تھے'' کے دیباچے میں لکھی ہے۔

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے خواجہ صاحب سے مدتوں میری ملاقات نہیں ہوتی تھی لیکن میں ان سے بے خبر نہیں رہتا تھا۔ گاہ بگاہ فون کر لیتا تھا۔ خواجہ صاحب ہر مرتبہ فون پر نہایت سچے دل سے اپنے نہ آنے کے سلسلے میں معذرت کرتے اور یہ معذرت حقیقی ہوتی تھی کیونکہ کثرت بول کے عارضے کے سبب ان کا کہیں جانا عملِ دشوار تھا۔ کہیں جانے سے پہلے گھنٹوں کے لیے پانی پینا چھوڑ دیتے تھے۔

اسلامیہ کالج سے میں اردو کالج چلا گیا اور پھر ڈاکٹر ابواللیث کے کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبہ منتخب ہونے کے بعد یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث، ڈاکٹر سید شاہ علی اور ڈاکٹر عبدالقیوم کے علاوہ جز وقتی استادوں کا بندوبست کیا گیا۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ شعبۂ اردو ٹانک واڑہ کی ایک عمارت میں قائم ہوا جو مفتی مولانا محمد شفیع کے دار العلوم کے سامنے تھی۔ طالب علموں میں مشفق خواجہ بھی تھے۔ اس زمانے میں ن م راشد، فیض احمد فیض اور کئی مقتدر ادیبوں اور شاعروں نے شعبے کے ادبی جلسوں میں شرکت کی۔ ان جلسوں میں مشفق خواجہ کے تبصرے اس قدر بلیغ ہوتے کہ بسا اوقات مشاہیر ادب ان کا جواب نہ دے پاتے۔

خواجہ صاحب نے ۱۹۵۸ء میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہوئے ایم اے پاس کیا۔ ایم اے کی سند حاصل کرنے سے پہلے ہی وہ ایک ابھرتے ہوئے ادیب کی حیثیت سے اپنا نقش قائم کر چکے تھے۔ ۱۹۵۷ء

میں وہ مولوی عبدالحق کے شخصی معاون کی حیثیت سے انجمن ترقیٔ اردو ادب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ ایک نوعمر ادیب کے لیے تاریخی اعزاز تھا۔ خواجہ صاحب انجمن کی مطبوعات سے بھی وابستہ ہوئے۔ وہ رسالہ ''اردو'' اور ''قومی زبان'' کو ترتیب دیتے رہے۔ ان سے کچھ عرصہ پہلے ۵۵۔۱۹۵۶ء میں، میں بھی کچھ عرصہ قومی زبان کا مدیر رہا۔ رفیق الدین احمد صاحب ہم لوگوں سے پہلے قومی زبان کے مدیر رہے۔

ایک محفل میں رفیق، میں اور خواجہ صاحب اکٹھے تھے۔ خواجہ صاحب کو فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا۔ تین ادیبوں کو فوٹو گرافی سے نسبت خاص رہی ہے۔ محمد حسن عسکری، خاطر غزنوی اور مشفق خواجہ۔ اس محفل میں خواجہ صاحب نے اپنا کیمرا سیٹ کر کے کسی سے کہا ایک تصویر کھینچ دو۔ وہ خواجہ صاحب، رفیق الدین اور میری تصویر تھی۔ خواجہ صاحب نے کہا یہ ایک تاریخی تصویر ہے۔ خواجہ صاحب کو ایسے مواقع کی اہمیت کا خوب اندازہ تھا۔

خواجہ صاحب بابائے اردو کے کاغذات بھی مرتب کرتے رہے۔ ان کے پاس مولوی عبدالحق صاحب کی ایک یا دو ڈائریاں بھی ہیں جن کے اندراجات تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی اشاعت کے بعد ہم عصر تاریخ کے کتنے ہی لوگ حقائق کی روشنی میں سامنے آ جائیں گے۔ مشفق خواجہ نے پرزوں، ٹکڑوں اور ردی کی ٹوکریوں میں پڑے ہوئے نوٹ نکال کر انھیں ادبی دستاویز میں بدلا۔ ان کے پاس کتنے ہی مشاہیر ادب کے متعلق نایاب معلومات جمع تھیں۔ وہ کسی بھی سنجیدہ کام کرنے والے کو اس ذخیرے سے اس کے کام کی چیزیں فراغ دلی کے ساتھ دے دیتے تھے۔ یہ بات، میرے علم کی حد تک، مرحوم خلیل الرحمٰن داؤدی کے علاوہ کسی اور محقق کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ داؤدی صاحب تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کرتے تھے۔

مشفق خواجہ نے ''تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا'' کو دو جلدوں میں مرتب کیا۔ یہ تذکرہ ''مجلسِ ترقی ادب'' لاہور نے شائع کیا۔ پہلی جلد ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۷۲ء میں۔ مولوی عبدالحق اور دوسرے محققوں کی کاوشوں سے اردو کے کئی اہم تذکرے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے جن میں میر، مصحفی، گردیزی اور میر حسن کے تذکرے شامل ہیں۔ سعادت علی خاں ناصر کا ''تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا'' اپنی اہمیت کے باوجود اس سے پہلے سامنے نہیں آیا تھا۔

خواجہ صاحب نے متون کی تدوین کو اردو میں بڑے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔ خواجہ صاحب نے ایسے کام کو اپنے لیے چنا جو اپنی بنیادی اہمیت کے باوجود خود ادیبوں کے لیے ایک اجنبی میدان کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۹ء میں مخطوطاتِ اردو کا ایک جائزہ شائع کیا۔ ان کا ''جائزۂ مخطوطاتِ اردو'' قریباً ساڑھے بارہ

WWW.KITABOSUNNAT.COM

سو صفحات پر محیط ہے اور یہ کام انھوں نے یونیسکو کے لیے مرتب کیا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو بے حد تاخیر کا شکار ہو چکا تھا اور ہندوستان میں اس سلسلے میں بہت کام ہو چکا تھا۔ مشفق خواجہ کی محنت سے پاکستان سرخرو ہوا۔

اسی سال خواجہ صاحب نے احمد دین کی مشہور کتاب ''اقبال'' کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اسے اپنے سیاق و سباق میں اقبال پر پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں بہت سے سوالات اور مسائل تھے۔ خواجہ صاحب نے اس دھند کو تحقیق کی روشنی سے اُجالے میں بدل دیا۔

اردو کا ایک اور عظیم شاعر غالب بھی خواجہ صاحب کے دائرۂ تحقیق و مطالعہ میں شامل تھا۔ ۱۹۸۱ء میں خواجہ صاحب کی کتاب ''غالب اور صفیر بلگرامی'' شائع ہوئی۔

خواجہ صاحب نے بہت سے تحقیقی مقالے لکھے۔ ان کے مقالات کا مجموعہ ''تحقیق نامہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ خواجہ صاحب کے تحقیقی مقالات کی ادبی اور تنقیدی اہمیت بہت نمایاں ہے۔ یہ کتاب یقیناً ایک مستقل مطالعے کی مستحق ہے۔ خواجہ صاحب کی مدون کردہ آخری کتاب ''کلیاتِ یگانہ'' ہے جس کا ذکر اس تعزیتی تحریر کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

خواجہ صاحب کا شعری مجموعہ ''ابیات'' ۱۹۷۸ء یا ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا، خواجہ صاحب کا یہ مجموعۂ کلام مختصر ہے لیکن ان کی جذباتی زندگی کا حاصل ہے۔ زندگی، انسان اور محبت کے بارے میں ان کے تجربات ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ وہ جدید الفاظ اور لغات کی بوقلمونی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ زبان پر ان کی سی گرفت ان کے ہم عصر شاعروں کے ہاں مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ تحقیق کا یہ تخلیقی آدمی زبان کے تخلیقی کردار سے بخوبی آگاہ تھا۔

کالم نگاری اُردو صحافت میں مختلف ادوار سے گزری ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ادیبوں نے اخبارات میں کالم لکھے ہیں جن میں میر محفوظ علی بدایونی، چراغ حسن حسرت، غلام رسول مہر سے لے کر جوش ملیح آبادی، شوکت تھانوی، ابنِ انشاء جیسے کتنے ہی لوگ شامل ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اور عبدالماجد دریابادی نے مختصر شذرہ نویسی کو ادبی صنف بنا دیا۔ خواجہ حسن نظامی نے اردو صحافت کو انشائیہ کے رنگ سے آشنا کیا۔ ان تمام بڑے ناموں کے بعد مشفق خواجہ نے اپنے کالموں کا موضوع ادب کو قرار دیا۔ انھوں نے ''خامہ بگوش'' کے قلمی نام سے کئی سال ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں کالم لکھا۔ ان کے کالم کی قوت کا یہ اعجاز ہے کہ جن لوگوں کو ''تکبیر'' کی پالیسی اور سیاسی رجحانات سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ بھی ''خامہ بگوش'' کا کالم پڑھنے کے لیے ''تکبیر'' خریدتے تھے۔ ان کالموں کا انتخاب تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ''سخن در سخن''

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اور ''سخن ہائے نا گفتی''۔ یہ انتخاب مشہور نقاد مظفر علی سید مرحوم نے کیا تھا۔ ان کالموں میں عصری ادب کے بارے میں تبصروں سے جدید ادب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ کالم بہت سے ناروا رجحانات کو روکنے کا سبب بھی بنا۔

''خامہ بگوش'' کے بارے میں محمد خالد اختر نے لکھا تھا: ''ان کے قلم کا ڈسا پانی نہیں مانگتا''۔ مشفق خواجہ کے ان کالموں میں بڑی حد تک غیر جانبداری ہے۔ وہ کسی مخصوص گروپ کے ادیبوں کو اپنا ہدف نہیں بناتے بلکہ جن کی تحریروں سے ادب کی حرمت پر انھیں حرف آنے کا اندیشہ ہوتا ہے ان سے وہ ادب کا حساب بے باق کر دیتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے کالموں میں ایسے جملے اور بیانات نظر آتے ہیں جو ان تحریروں سے الگ اپنی معنویت اور وجود کو برقرار رکھتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

> ''زندگی تو جیسے تیسے گزر جاتی ہے، آپ بیتی جیسے تیسے نہیں لکھی جا سکتی۔''
>
> ''کشور ناہید شاعری کی پوری عورت ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو تنقید کا نصف بہتر ضرور ہیں''
>
> ''کہا جاتا ہے کہ اچھی کتاب وہ فوراً چھاپتے ہیں اور خراب کتاب فوراً سے پیشتر۔ اس کا بھی ذاتی تجربہ ہے کہ ہمارے کالموں کا انتخاب انھوں نے آناً فاناً چھاپا تھا جیسے وہ مصیبت نہ ہو، آفتِ ناگہانی ہو۔''
>
> ''منیر نیازی اگرچہ غیر سنجیدہ انسان اور غیر سنجیدہ شاعر ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری سنجیدہ نہیں ہوتی۔''
>
> ''اس مجموعہ کے ہر مضمون میں جدید اردو شاعری کے کسی نہ کسی مسئلے کو سمجھنے سمجھانے اور حتی المقدور الجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔''
>
> ''ہم کراچی کے جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں کئی کئی دن تک گولیوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ عام بارش ہوتی تو ہم ایک چھوڑ دو دو کالم لکھ سکتے تھے مگر گولیوں کی بارش میں وصیت تو لکھی جا سکتی ہے مگر کالم نہیں لکھا جا سکتا۔''

مشفق خواجہ ہم سے رخصت ہو چکے ہیں اور ابھی تو ہم اس سانحے سے گزر رہے ہیں۔ ابھی اس سانحے کے مختلف پہلو خود ہم پر روشن نہیں لیکن یقین ہے کہ اردو کے اس باشعور چاہنے والے کی یاد کا موسم آئے گا اور ان پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ دل بیدار کے نغموں کی جزا یہی ہو سکتی ہے۔ نوجوان ادیبوں کو خواجہ کی زندگی یہی سبق دیتی ہے کہ شہرت کے پیچھے نہ بھاگو، کام کرو۔ شہرت تو خود بخود کام کے پیچھے پیچھے آئے گی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

اَے مُشفقِ من ......

(ایک نعرہ مستانہ مشفق خواجہ کی یاد میں)

اے مشفق من اس حال میں تم کس طرح بسر فرماؤ گے
انجان بنے چُپ بیٹھے ہو اور جان کے دھوکے کھاؤ گے

واہ خواجہ صاحب واہ...... مانا کہ آپ داد و ستد کے بڑے کھرے تھے مگر اس قدر عجلت بھی کس کام کی۔ کاش آپ آمنہ بھابھی کی بے قراری دیکھ لیتے۔ اپنے محبان باوفا، یوسفی صاحب کا اضمحلال، سعید محمود کے چہرے کی پژمُردگی، نسیم کی آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں، صوفی کی گریہ وزاری اور ہم سب کے ذہنی اور روحانی کرب کا احساس کر لیتے اور پھر جانے کا فیصلہ کرتے۔ نجانے کا ہے کی جلدی تھی مگر یہ فیصلہ آپ کا نہیں تھا۔ خواجہ صاحب! کتابیں شکوہ سنج ہیں کہ اب ایسا قدر دان کتاب شناس کہاں سے آئے گا۔ دوستوں کے دل اور محفلیں ویران ہو گئی ہیں۔ انھیں کون سجائے گا۔ حسرتؔ کے ایک شعر کی معنویت اب سمجھ میں آ رہی ہے ؎

تم تھے تو مری شام میں تھا صبح کا عالم
تم جب سے گئے شام جھلکتی ہے سحر میں

☆

کراچی یونیورسٹی کے دفاتر اور بعض شعبے ان دنوں پرنس اسٹریٹ (اب چاند بی بی روڈ) پر تھے۔ ایک بہت چھوٹے سے کمرے میں شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کا دفتر تھا۔ میجر آفتاب حسن اس کے سربراہ تھے اور اقتدا حسن (اب ڈاکٹر اقتدا حسن) دفتر کے انچارج۔ اقتدا دوست تھے اس وجہ سے آنا جانا رہتا تھا۔ ایک دن ان کے یہاں گیا تو برابر کی کرسی پر ایک نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انھیں متعدد بار ابن انشا کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ غالباً سولجر بازار میں رہتے تھے کیوں کہ میں نے انھیں وہاں بھی دیکھا مگر تعارف نہیں ہوا تھا۔ اقتدا نے تعارف کرایا...... ''مُشفق خواجہ...... انجمن ترقی اردو میں معاون ادبی ہیں۔ علم و ادب کا سارا بار یہی سنبھالے ہوئے ہیں۔'' میں نے خواجہ صاحب کو نظر بھر کر دیکھا۔ دُہرا جسم، گول مُسکراتا چہرہ، روشن آنکھوں پر عینک، فراخ پیشانی، باتیں کرنے میں ہنسے تو سفید دانت چمکے، آدھی آستین کی عمدہ سلی ہوئی بشرٹ۔ اسی کی مناسبت سے پتلون، جوتوں پر پالش، نکھ سے سکھ دُرست۔ ہم دونوں نے تعارف ہوتے ہی ایک دوسرے کے لیے یگانگت کی ایک لہر محسوس کی جو ساری زندگی برقرار رہی۔

WWW.KITAABISTAN.COM

میں اقتدا کے پاس اس غرض سے گیا تھا کہ میری تھیسس مکمل ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ ٹائپ سے کام چلتا تھا۔ ایک اچھے اردو ٹائپ کار کی تلاش میں گیا تھا۔ میں نے مدعا بیان کیا تو خواجہ صاحب نے کہا: ''اگر آپ پسند فرمائیں تو میں مستعد، کارگزار اور پڑھا لکھا ٹائپ کار فراہم کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ضرور فراہم کر دیجیے۔'' یہ طے ہوا کہ وہ دو تین دن میں ٹائپ کار میرے پاس بھیجیں گے۔ میں رخصت ہونے لگا تو خواجہ صاحب نے کہا: ''کبھی انجمن بھی آیئے۔ میں نے سنا ہے کہ پہلے آپ کا آنا جانا رہتا تھا۔'' میں نے کہا: ''جی ہاں، تھیسس کے لیے حوالے تلاش کرنے آتا تھا۔ جب تک قاضی صاحب رہے ان کے پاس آتا تھا۔ اب ان شاء اللہ آپ کے پاس آؤں گا۔''

دو دن بعد خواجہ صاحب کا فون آیا کہ ٹائپ کار آج آپ کے پاس آئیں گے۔ یہ ٹائپ کار شجر نقوی صاحب تھے۔ بڑے محنتی، بڑے مستعد اور بڑے پڑھے لکھے۔ شرائط طے ہوگئیں۔ مسودے کا ایک حصہ میں نے ان کے حوالے کر دیا۔

تین چار دن بعد ریڈیو پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک مذاکرہ تھا۔ مذاکرے سے فارغ ہو کر نکلا تو خیال آیا کہ چلو آج خواجہ صاحب سے ملتے چلیں۔ اب ریڈیو پاکستان سے انجمن کا دفتر بہت دور معلوم ہوتا ہے لیکن وہ زمانہ اور تھا جب زمین پیروں تلے روندتے پھرتے تھے۔ چنانچہ انجمن کا رخ کیا۔ بڑے گیٹ سے اندر گئے۔ دائیں ہاتھ پر اردو کالج، بائیں پر انجمن کی عمارت۔ نیچے دائیں ہاتھ پر زینہ اور کتب خانہ عام۔ بائیں ہاتھ پر کتابوں کا گودام۔ زینے سے پہلی منزل پر پہنچے۔ سامنے ایک چھوٹا سا صحن، بابائے اردو کا کمرہ۔ ان کے پہلو میں جو کمرہ تھا وہاں قاضی احمد میاں بیٹھتے تھے۔ بابائے اردو کے کمرے کے پہلو میں ایک چھوٹی سی کولکی۔ ایک زینہ اور طے کیا۔ بہت بڑے کمرے میں کتب خانہ خاص۔ پہلو میں وہی پہلی منزل والی چھوٹی سی کولکی۔ اُسی کولکی میں ایک میز، تین چار کرسیاں، درمیان میں خواجہ صاحب براجماں، میز پر اخباروں، رسالوں اور ڈاک کا انبار۔ خواجہ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی اخاہ کا نعرہ لگایا، ''آیئے آیئے۔ ڈاکٹر صاحب!'' میں نے کہا: ''آپ کیوں مجھے کانٹوں پر گھسیٹتے ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر نہیں ہوا۔'' بولے: ''تو عنقریب ہو جائیں گے۔'' میرے بیٹھتے ہی خواجہ صاحب نے آواز دی: ''سید صاحب، چائے لایئے۔'' چائے لانے والے سید بدر عالم بھی بابائے اردو کے ایک رتن تھے۔ ان کے خادم خاص۔ بابائے اردو کی طرح انھوں نے بھی گھر بار کا جنجال نہیں پالا تھا۔ خواجہ صاحب کے بقول ان کے دو شوق تھے اخباروں سے فلم ایکٹریسوں کی تصویریں کاٹ کر ایک رجسٹر میں چپکانا اور اگر کوئی شخص گفتگو میں کوئی نیا لفظ استعمال کرے تو اسے یاد کر لینا اور اپنی گفتگو میں

استعمال کرنا۔ ایک دن ان کی موجودگی میں کسی صاحب نے ''ہیچ و پوچ'' کے الفاظ استعمال کیے۔ سید صاحب کو یہ الفاظ بڑے بھلے معلوم ہوئے اور انھوں نے یاد کر لیے۔ استعمال کے منتظر رہے۔

اتفاق یہ کہ دو تین دن کے بعد جگر صاحب انجمن آئے۔ کراچی آئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب سے ملنے آ گئے۔ مولوی صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جگر صاحب اطمینان سے بیٹھے تو شعر خوانی کا آغاز ہوا۔ جگر صاحب کا لحن اور کلام کی رعنائی، سید صاحب مسحور ہو گئے۔ بے اختیار ہو کر بولے، ''ایسا ہیچ و پوچ کلام تو آج تک نہیں سنا۔'' جگر صاحب سناٹے میں آ گئے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹا، ''کیا بکتا ہے۔'' مگر سید صاحب بھی اپنی وضع کے ایک ہی تھے۔ کہنے لگے، ''چاہے مار ڈالو مگر کلام بڑا ہیچ و پوچ ہے۔'' مولوی صاحب نے چھڑی سنبھالی مگر کچھ سوچ کر ٹھہرے۔ پوچھا ''کچھ سمجھتا بھی ہے۔ کیا بک رہا ہے۔'' سید صاحب نے کہا، ''سمجھتا کیوں نہیں۔ بڑا اعلیٰ درجے کا کلام ہے۔'' مولوی صاحب ہنس پڑے۔ پوچھا، ''یہ الفاظ تجھے کس نے سکھائے؟'' سید صاحب نے بتایا، ''فلاں صاحب اس دن آئے تھے۔ انھوں نے یہ الفاظ کہے تھے۔ مجھے اچھے لگے۔ میں نے یاد کر لیے۔'' جگر صاحب یہ سن کر مسکرائے اور سید صاحب کی گلوخلاصی ہوئی۔ اس روایت کے ختم ہوتے ہوتے سید صاحب چائے لے کر آئے۔ بڑی عمدہ چائے تھی۔ بابائے اردو اور خواجہ صاحب دونوں سید صاحب کی سادہ لوحی گوارا کرتے رہتے تھے۔

چائے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ دنیا جہان کی باتیں۔ ادب، شعر، ادیبوں، شاعروں اور ادب دوستوں کی باتیں۔ خواجہ صاحب کی معلومات وسیع تھیں۔ گفتگو کا انداز بڑا دلچسپ تھا برجستہ فقرہ کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ وقت زیادہ ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ خواجہ صاحب نے کہا: ''دو بج چکے ہیں۔ آپ تین بجے سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اس لیے کھانا کھا کر جائیے۔'' میں نے کہا: ''مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ انجمن میں مساکین کے پیٹ بھرنے کا انتظام بھی ہے۔'' خواجہ صاحب نے جواب میں کہا، ''اجی ہر طرح کا انتظام ہے۔'' پھر آواز دی، ''سید صاحب! کھانا لائیے۔''

خواجہ صاحب کی پشت پر ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ سید صاحب نے کھانا اس میز پر رکھ دیا۔ قورمہ اور تندوری روٹیاں۔ معلوم ہوا کہ بندر روڈ پر فیروز سنز کے پہلو میں کیفے شیراز ہے۔ کھانا وہاں سے لایا گیا ہے۔ اچھا خاصا تھا۔ ذائقہ آج تک زبان پر ہے۔ افسوس کہ یہ کیفے مدت ہوئی بند ہو گیا۔ اختتام فیرنی پر ہوا اور سید صاحب پھر چائے لے آئے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

یہ ملاقات بہت زبردست تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا مزاج سمجھ لیا۔ خواجہ صاحب نے بے تکلفی کے باوجود میرا احترام مدنظر رکھا۔ ان کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ کہنے لگے: ''اگر میں ایس ایم کالج کا طالب علم ہوتا تو آپ کا شاگرد ہوتا۔'' میں نے کہا، ''مفروضات بہت سے ہو سکتے ہیں دوستی اور برادرانہ اخلاص حقیقت ہے، باقی سب مفروضے۔'' کہنے لگے: ''آپ نے خود ہی حدود قائم کر دیں۔ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی والا معاملہ ہے۔'' میں برابر خواجہ صاحب کے پاس جاتا رہا اور کھانا کھا کر واپس لوٹتا۔ یہ ایک معمول ہو گیا تھا۔ ایک آدھ دفعہ میں کھانا کھا کر گیا یا کھانا نہیں کھایا تو خواجہ صاحب نے برہمی کا اظہار تو نہیں کیا لیکن افسردہ ضرور ہوئے۔ یہ معمول اس وقت تک جاری رہا جب تک خواجہ صاحب انجمن میں رہے ......میں یونیورسٹی منتقل ہو گیا، تب بھی خواجہ صاحب کے پاس جاتا رہا۔ ناظم آباد میں وہ کبھی کبھی میرے یہاں آتے تھے۔ یونیورسٹی جانے کے بعد یہ سلسلہ ختم کیا ہوا ایک طرفہ ٹریفک بن گیا۔

اس زمانے میں دو دھماکے بڑے زبردست ہوئے۔ پہلا دھماکا بابائے اردو کا انتقال تھا۔ میں نے بابائے اردو کے انتقال پر خواجہ صاحب کی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے دیکھے۔ ہم دونوں نے بہت دن تک صرف بابائے اردو ہی کے بارے میں گفتگو کی تھی۔

دوسرا دھماکا خواجہ صاحب نے خود کیا تھا۔ ہوا یہ کہ ابتدا میں انٹر کی تعلیم کی نگرانی، نصاب کا تعین اور امتحانوں کا انعقاد یونیورسٹی کی ذمہ داری تھی۔ انٹر کا اردو نصاب انجمن کا شائع کردہ تھا۔ غالباً شجاع احمد زیبا نے مرتب کیا تھا۔ یہ متوسط درجے کا سیدھا سادا انتخاب تھا جس کی اشاعت سے انجمن کو ہر سال کچھ مالی یافت ہو جاتی تھی۔ جب یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہو گیا اور صدر شعبہ کا تقرر بھی ہو گیا تو انھوں نے انجمن کا انتخاب نصاب سے خارج کر دیا اور ان کا مرتبہ انتخاب پڑھایا جانے لگا۔

نئے انتخاب میں فرہنگ بھی تھی۔ خواجہ صاحب نے اسے موضوع بنایا۔ یہ فرہنگ عام درسی کتابوں کی فرہنگ کی طرح ناقص اور اغلاط سے پُر تھی۔ خواجہ صاحب نے بڑی محنت سے ''گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو اطہر صدیقی کے رسالے ''سات رنگ'' کے دو تین شماروں میں شائع ہوا۔ اطہر صدیقی خواجہ صاحب کے ہم جماعت اور گہرے دوست تھے۔ پیر کالونی میں میرے چھوٹے بھائیوں کے پڑوسی تھے اور پروفیسر محمد حسن عسکری کے خاص شاگرد تھے۔ خواجہ صاحب کا مضمون تحقیقی ژرف نگاہی، فرہنگ نگاری کی وسیع معلومات اور شگفتہ بیانی کا بڑا اچھا نمونہ تھا۔ تحقیقی ژرف نگاہی آگے چل کر ان کی تحقیقی کتابوں میں مستحکم ہو کر ظاہر ہوئی۔ شگفتہ بیانی ان کے کالموں میں نکھر کر کاٹ، طنز، برجستگی اور شوخی طبع کا عمق

اور وسعت حاصل کی۔ بڑی دھوم مچی اس مضمون کی۔ بڑی واہ واہ بھی ہوئی، بڑی تھڑی تھڑی بھی ہوئی۔ بہت دن تک اس دھماکے کا اثر رہا۔ شعبہ اردو اور یونیورسٹی سے خواجہ صاحب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور مدت دراز تک کشیدہ رہے۔ جلد ہی انٹر بھی میٹرک بورڈ کا حصہ بن گیا۔ اردو کی نئی کتاب مرتب ہو گئی جو پہلی دونوں کتابوں کے مقابلے میں انتخابی عدم صلاحیت کا شاہکار تھی۔ بہر حال اس مضمون سے خواجہ صاحب کی دھاک بیٹھ گئی۔

اسی اثنا میں خواجہ صاحب دلہا بنے۔ بڑی سُتھری اور شان دار تقریب ہوئی۔ گل رعنا کلب میں ولیمہ ہوا۔ کراچی کے تقریباً سارے ہی اہل قلم موجود تھے۔ ولیمے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے پھلجھڑی چھوڑی۔ خواجہ صاحب کو مبارک باد دینے کے بعد کہنے لگے: ''اب اردو آپ کی مادری زبان ہو گئی۔'' بڑے قہقہے لگے۔ خواجہ صاحب اس وقت جواب دینے سے قاصر تھے۔ ذرا دیر بعد فاروقی صاحب نے ایک اور پھلجھڑی چھوڑی، بولے: ''یہ صاحب مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ انجمن میں ایک تو بابائے اردو تھے۔ اب کرتا دھرتا خواجہ صاحب ہیں۔ انھیں کیا کہا جاتا ہے۔ تو میں نے کہا یہ 'داماد اردو' ہیں۔'' اس پر بھی بڑے قہقہے لگے۔ اتفاق یہ کہ بیگم آمنہ مشفق کی چھوٹی بہن عائشہ مصطفیٰ میری بیوی کی ہم جماعت تھیں۔ ملنا جُلنا ساری بہنوں اور خاندان کے دوسرے افراد سے بھی تھا۔ اس وجہ سے خواجہ صاحب سے تعلقات میں کچھ اور استحکام پیدا ہو گیا۔ آمنہ بھابھی شادی سے پہلے ہی 'افکار عبدالحق' لکھ کر اہل قلم کے گروہ میں شامل ہو گئی تھیں مگر شادی کے بعد انھوں نے قلم رکھ دیا۔

بابائے اردو کے بعد اختر حسین انجمن کے صدر ہوئے۔ عالی صاحب سیکرٹری تھے اور ہیں مگر حُکم خواجہ صاحب ہی کا چلتا تھا۔ وہ بدستور اسی کوٹھی میں بیٹھے ایک عالم کو زیر و زبر کرتے رہے۔ سارے مُلکی ادیبوں سے ان کی ذاتی واقفیت تھی۔ بیرون ملک کے ادیبوں اور عالموں سے تعلقات تھے۔ باہر سے جو بھی آتا، انجمن میں خواجہ صاحب سے ضرور ملتا۔ خواجہ صاحب دن بھر اپنی کوٹھی میں بیٹھے رہتے۔ شام کو اُٹھتے۔ صدر میں گلڈ، انجمن کتاب گھر تک ٹہلتے ہوئے جاتے۔ وہاں کچھ دیر ٹھہرتے۔ یہ کتاب گھر بھی انھیں کی کوششوں سے وجود میں آیا تھا۔ کتابوں اور ادیبوں شاعروں کا اچھا مرکز تھا پھر ''خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی۔''

بابائے اردو کی پہلی برسی ہوئی۔ برسی سے کچھ دن پہلے خواجہ صاحب نے فون کیا، ''میں بابائے اردو کی برسی کا مہتمم ہوں۔ آپ کو ایک مضمون پڑھنا ہے۔'' میں نے تعجب سے پوچھا: ''آپ تو جلسے جلوسوں سے دور بھاگتے ہیں۔ پھر یہ ہمیں کاہے کے لیے گھیر رہے ہیں۔'' کہنے لگے: ''ذاتی تعلقات کی بنا پر۔ جانتا ہوں کہ

WWW.KITAABISTAN.COM

آپ انکار نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا: ''شرط یہ ہے کہ آپ کو میرے کالج کی کسی تقریب میں شرکت کرنا پڑے گی۔'' بولے: ''جان و دل سے۔'' برسی کی تقریب میں، میں نے مضمون پڑھا۔ دوسری برسی اور تیسری برسی میں بھی مضمون پڑھے۔ پھر غالباً مضامین کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ قرآن خوانی اور فاتحہ برقرار رہی۔

خواجہ صاحب کے فون برابر آتے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کی انفرادیت ان کے فون کرنے کے انداز سے بھی نمایاں تھی۔ وہ ''ہیلو'' نہیں کہتے تھے۔ ''فرمایئے'' کہتے تھے میں نے انفرادیت کا یہ انداز یا تو خواجہ صاحب میں دیکھا یا محب مکرم واصل عثمانی صاحب کے یہاں یہ انداز نظر آیا۔ وہ ہیلو کے بجائے گفتگو ''السلام علیکم'' سے شروع کرتے ہیں، ورنہ سب ہیلو ہی سے کام چلاتے ہیں۔

ایک دن فون آیا: ''آپ ماشاء اللہ سے ڈاکٹر ہو گئے۔ مقالہ کب تک یونہی رکھا رہے گا۔ اسے شائع کیوں نہیں کرتے۔'' میں نے کہا: ''اتنی ضخیم کتاب کون شائع کرے گا۔'' کہنے لگے: ''انجمن...... اور کون۔'' میں نے پوچھا: ''یہ آپ کہہ رہے ہیں۔'' مجھے ان کی زبانی یہ علم ہو چکا تھا کہ صدر انجمن کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں خاصے سخت ہیں۔ کسی کتاب کی اشاعت کی منظوری دینے سے پہلے وہ یہ دریافت کرتے ہیں کہ اس پر لاگت کتنی آئے گی۔ کتنے عرصے میں فروخت ہو گی۔ انجمن کو کتنا منافع ہوگا۔ اس ''پُرسش احوال'' کا نتیجہ یہ تھا کہ کتابیں کم شائع ہوتی تھیں۔ جب میں نے پوچھا کہ یہ آپ کہہ رہے ہیں، تو انھوں نے کہا: ''جی ہاں۔ میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے منظوری لے لی ہے۔ آپ مسودہ پہنچا دیجیے۔ میں نے مسودہ پہنچا دیا۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے ایک اشاعت کے لیے باقاعدہ معاہدہ کیا اور مسودہ کاتب کے حوالے کیا۔ کتابت ہوتی رہی۔ پروف پڑھے جاتے رہے۔ ضخیم کتاب تھی۔ بڑا وقت صرف ہوا لیکن شائع ہو گئی۔ خواجہ صاحب نے اس فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کہ مجھ سے کہا: ''آپ جن جن صاحبوں کو کتاب بھیجنا چاہتے ہیں ان کے نام اور پتوں کی ایک فہرست مجھے دے دیجیے۔ میں انجمن کی طرف سے بھجوا دوں گا۔'' چنانچہ کتاب اندرون ملک اور بیرون ملک متعدد ادب دوستوں کو ارسال کی گئی۔ پہلی جلد کا اشاریہ بھی خواجہ صاحب نے بنوایا تھا۔ دوسری جلد کا اشاریہ پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے بنایا۔ خواجہ صاحب سے ان کی شناسائی ہو گئی اور آگے چل کر خواجہ صاحب نے ان سے بہت کام لیا۔

کتاب شائع ہو گئی۔ مجھے اس پر داؤد ادبی انعام بھی ملا۔ دعوت بھی ہوئی۔ شریک ہونے والوں میں سے شاہد احمد دہلوی، جالبی صاحب، عالی صاحب، خواجہ صاحب اور پتلے اکرام کے نام ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس دعوت میں خواجہ صاحب کی گل افشانی گفتار اپنے عروج پر تھی۔ ان کی موجودگی سے محفل کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔ برجستہ فقرے، گرما گرم جملے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس تقریب کے روح رواں وہی ہیں۔

WWW.KITAABISTAN.COM

یہ سب کچھ ہو چکا تو خواجہ صاحب نے ایک دن فون کیا، ”اجی ڈاکٹر صاحب! کچھ کام کیجیے۔“ ”کیا کام۔ آپ ہی کوئی کام تجویز کر دیجیے۔“ کہنے لگے: ”تجویز کر چکا ہوں۔ کل انجمن آ جائیے۔“ دوسرے دن گیا تو انھوں نے ایک پرانا چھپا ہوا تذکرہ مجھے دکھایا۔ نام تھا، ”گلشن ہمیشہ بہار۔“ مؤلف تھے۔ مولوی نصر اللہ خان خویشگی ...... میں ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے ان کے نام سے بخوبی واقف تھا۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ یہ تذکرہ ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ چھپا تھا۔ جنگ میں اس کے بیشتر نسخے ضائع ہو گئے۔ یہ ایک نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ اب آپ اسے مدون کر دیجیے۔ میں نے کتاب کا ٹائپ شدہ مسودہ لے لیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ حسن اتفاق یہ کہ انہی دنوں میری ملاقات خویشگی خاندان کے ایک بزرگ ابوبکر خویشگی مرحوم سے ہوئی۔ ان سے مجھے مولوی صاحب کی سوانح عمری دست یاب ہوئی۔ بعض اور کتابیں بھی دیکھیں۔ تذکرہ مدون ہو گیا۔ مقدمہ بھی مکمل ہو گیا۔ مسودہ خواجہ صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ بڑے خوش ہوئے۔ جلد ہی یہ تذکرہ شائع ہو گیا۔ مجھے آج تک حیرت ہے کہ خواجہ صاحب نے ان دونوں کتابوں کی اشاعت کی منظوری کیسے حاصل کی۔

۱۹۷۱ء کی جنگ میں خواجہ صاحب کے جوہر کھُلے۔ اس جنگ میں ہر پاکستانی دامے درمے قدمے سخنے جان و دل سے شریک تھا۔ شاعروں نے ریڈیو کے لیے قومی نغموں کا ڈھیر لگا دیا۔ ”خطہ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام، پاکستانی بڑے لڑیا۔“ نثر نگاروں نے جنگ کے حوالے سے خوب خوب پروگرام لکھے۔ خواجہ صاحب نے بھی کالموں کا ایک سلسلہ ”سنا آپ نے“ کے عنوان سے شروع کیا۔ کاٹ دار، تیز، تند۔ جس نے سنا پسند کیا۔ یہ ان کے ادبی کالموں کا ابتدائی روپ تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو خواجہ صاحب کا کالم بھی ختم ہو گیا۔ اصل میں یہ کام بدر عالم کے مجبور کرنے سے شروع ہوا تھا۔ بدر عالم خواجہ صاحب کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ ان دونوں کراچی ریڈیو سے وابستہ تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کی زوراز وری ریڈیو کے کچھ اور پروگرام بھی لکھے لیکن وہ ریڈیو کے آدمی نہیں تھے۔ ریڈیو سنتے تھے نہ اس کے پروگراموں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا: ”یہ جو آپ اتنی پابندی سے ریڈیو میں وقت ضائع کرتے ہیں، اس سے کیا فائدہ؟“ میں نے کہا: ”چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ ریڈیو کسی حد تک میری شناخت بن گیا ہے۔“ اب غور کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بلا مبالغہ پچھلے پچپن برس میں ہزاروں پروگرام لکھے لیکن گل نغمہ اور پردہ ساز دونوں سے ماورا رہا۔

دن بھر کرسی پر بیٹھے رہنے سے خواجہ صاحب کو ذیابیطس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ شام کو وہ تھوڑی بہت چہل قدمی کرتے تھے لیکن دن بھر کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ اس نامراد بیماری نے انھیں بڑا پریشان کیا۔ ایک

دن انجمن میں ان کے پرانے دوست اور ہم جماعت اطہر صدیقی ان سے ملنے آئے۔ میں بھی موجود تھا۔ دونوں دوستوں میں ملاقات بہت دن بعد ہوئی تھی۔ شکوے شکایتیں ہوئیں۔ اطہر بھی اسی نامراد مرض کے مریض اور کسی حد تک بد پرہیز بھی تھے۔ انھوں نے اپنا احوال بیان کیا۔ خواجہ صاحب نے اپنا حال سنایا۔ دونوں اپنا دردِ دل کہتے رہے۔ میں خاموش سنتا رہا۔ اس دن مجھے خواجہ صاحب کے مرض اور تکلیف کا اندازہ ہوا ورنہ وہ اپنی کوئی تکلیف کبھی بیان نہیں کرتے تھے۔ میں نے یہ تو دیکھا تھا کہ بہت دن سے جب کبھی ان کے ساتھ انجمن میں کھانے کا اتفاق ہوتا تو وہ مٹھاس نہیں کھاتے تھے لیکن میرے لیے مٹھاس ضرور ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب پرہیز کے قائل تھے۔ کبھی کبھی کسی دعوت میں ان سے کہتا کہ آپ کے حصے کی مٹھاس بھی کھانی ہے تو وہ کہتے مگر ثواب میری روح کو پہنچے گا۔ مٹھاس نہ کھانے کی تلافی وہ اس طرح کرتے کہ اگر کھانے میں رائتہ ہوتا تو وہ ایک خالی گلاس میں رائتہ بھرتے اور آہستہ آہستہ پیتے رہتے۔ آمنہ بھابھی بھی اس کام میں اپنے شوہر کی مقلد تھیں......۔

انجمن میں خواجہ صاحب کے گرداگرد ایک پوری کہکشاں تھی۔ کتب خانے میں افسر صاحب تھے، درویش عالم۔ ہر آنے والا ان سے استفادہ کرتا تھا۔ میں نے بھی استفادہ کیا تھا۔ سرفراز صاحب تھے کتاب دار۔ کتابیں ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ کتب خانۂ خاص کی جو فہرست انھوں نے مرتب کی وہ آج بھی مستند اور رائج ہے۔ متعدد نئے لوگ آتے رہے جاتے رہے۔ شمیم احمد، سعید احمد، تحسین سروری، سطوت میرٹھی، ریڈیائی ڈرامے کے ماہر سید احمد رفعت، بزرگ شاعر اور معروف ادیب جلیل قدوائی (خواجہ صاحب کی زورازوری سے انھوں نے اپنی خودنوشت مرتب کی)، عباس احمد عباسی۔ کیسے کیسے موتی تھے جو کراچی کی خاک میں رل گئے۔ اس کہکشاں میں استاد راگ انبالوی کے شاگرد نسیم احمد بھی تھے جو خواجہ صاحب کی دریافت تھے۔ گلڈ انجمن کتاب گھر سے انجمن آئے اور آج بھی خواجہ صاحب کا دم بھرتے ہیں۔ صوفی عبدالرشید مولوی صاحب کے ہم وطن خادم اور خواجہ صاحب کے اور میرے سرپرست۔ میرے سرپرست یوں کہ گاہے گاہے وہ مجھے یاد دلاتے اور دھونس دیتے رہتے ہیں کہ میں آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب آپ پڑھتے تھے اور خواجہ صاحب کے سرپرست یوں کہ شیخ چاند، ہاشمی فرید آبادی، الیاس مجیبی، اختر حسین رائے پوری سے لے کر خواجہ صاحب تک ان کی خدمت کا دائرہ پھیلا ہوا تھا۔ اتوار کے اتوار صوفی خواجہ صاحب کے یہاں آنے جانے والوں کو چائے پیش کرتے تھے اور اپنی اہمیت کا احساس بھی دلاتے تھے۔ اتنے بہت سے لوگوں کو، جن میں سے ہر شخص خود ایک مرکزِ فکر و فن تھا، ایک مرکز پر قائم رکھنا خواجہ صاحب ہی کا کام تھا۔

انجمن زندگی بھر خواجہ صاحب کی شناخت اور حوالہ رہی لیکن وہ ۱۹۷۳ء میں انجمن سے سبکدوش ہو گئے۔ ایک دن فون آیا، "میں نے انجمن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" "انجمن چھوڑنے کا فیصلہ؟" بڑا تعجب ہوا۔ انجمن خواجہ صاحب کے بغیر؟ مگر جانے والے کو کون روک سکتا تھا۔ خواجہ صاحب بھی انجمن سے چلے گئے مگر چلے کیا گئے، انجمن کے کاموں میں پہلے سے زیادہ دخیل ہو گئے۔ شہر کے خبر تراشوں اور افواہ سازوں نے یہ خبر مشہور کر دی کہ خواجہ صاحب کو کسی غیر ملکی ادارے نے نہایت معقول معاوضے پر پاکستانی مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ خواجہ صاحب نے "جائزہ مخطوطات اردو" کی پہلی جلد شائع کی تو دیباچے میں اس افواہ کی واضح طور پر تردید کی۔ اس تردید کا مطلب یہ تھا کہ افواہ خواجہ صاحب تک پہنچ گئی تھی اور انھیں ناگوار گزری تھی۔ خواجہ صاحب اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی تھے۔ تاہم ایک دن میں نے ان سے کہا: "یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔" کہنے لگے: "کر تو سکتا تھا مگر آپ کے پاس جو قلمی کتابیں ہیں وہ مجھے کیسے دیکھنے کو ملتیں۔" بات ہنسی مذاق میں ختم ہو گئی۔ انجمن کے بجائے ناظم آباد کے بلاک نمبر پانچ میں عباسی شہید ہسپتال کے سامنے والی گلی میں "مسکن رحمت" رحمت علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ اب تک وہ وابستگان انجمن میں تھے، اب خود انجمن بن گئے۔

انجمن سے علیحدہ ہو کر خواجہ صاحب نے تالیفی اور تخلیقی کام شروع کیا۔ دو سو قلمی نسخوں کی وضاحتی فہرست جائزہ مخطوطات اردو کے عنوان سے مرتب کی۔ انجمن میں انھوں نے سعادت خان ناصر کا تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" مدون کیا تھا۔ اب منشی احمد دین کی کتاب 'اقبال' ڈھونڈ کر نکالی اور اسے مرتب کیا۔ اس کتاب کا قصہ بھی عجیب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن اقبال کی زندگی میں شائع ہوا تھا مگر جلا دیا گیا۔ خواجہ صاحب نے اسے از سر نو شائع کیا۔ غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات پر کتاب مرتب کی۔ تحقیقی مضامین کا مجموعہ "تحقیق نامہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ تخلیقی ادب کے نام سے ہم عصر تخلیقی ادب کے جائزے اور منتخب تحریروں کے پانچ مجموعے شائع کیے۔ کلیات یگانہ کی تدوین کی۔ کلیات یگانہ کی تدوین میں انھوں نے نو برس صرف کیے۔ جانے کہاں کہاں سے چیزیں ڈھونڈ کر نکالیں۔ انھیں تلاش و جستجو میں ملکہ حاصل تھا۔ برصغیر کے مختلف کتاب خانوں کے قلمی نسخوں سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ کون سا نسخہ کہاں ہے؛ کب کا مرقومہ ہے؛ کس حالت میں ہے؟ میں نے بارہا ان کی اس معلومات سے فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح شعرا اور ادیبوں کے بارے میں بھی ان کا علم بڑا حاضر تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں بے شمار طلبہ کی رہنمائی کی۔ تحقیق کرنے والے ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ وہ خندہ پیشانی سے ہر طالب علم کے سوالوں کے جواب زبانی اور تحریری دیتے تھے اور مختلف اخبارات و رسائل میں چٹ پٹے، کاٹ دار ادبی کالم لکھے۔ خوب لکھے اور دھوم مچا دی۔

یہ برجستگی اور شگفتگی اپنی جگہ مگر برصغیر کے علمائے سلف کی طرح خواجہ صاحب نے بھی اپنی تحقیقی مہارت، تنقیدی بصیرت، جرح وتعدیل کی زکاوت اور ذہنی سرعت کو تدوین وحاشیہ نگاری میں محدود کرلیا تھا۔ وہ تخلیقی حرارت، برجستگی، تازگی اور لطافت، چبھنے والی نشتریت اور زورِ بیان کی ندرت جو ان کے کالموں میں جھلکتی ہے ان کے تالیفی مزاج کا حصہ نہ بن سکی۔ حاشیہ نگاری میں انھوں نے کمال حاصل کرلیا تھا۔ کلیات یگانہ کے حواشی اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں لیکن حاشیہ نگاری تخلیقی اپج کی راہ کھوٹی کرتی ہے۔

ان کالموں کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب نے تنظیمی صلاحیت کا بھی اچھا ثبوت دیا۔ ادارہ یادگار غالب، فیض احمد فیض اور مرزا ظفر الحسن کے اشتراک سے قائم ہوا تھا۔ مرزا نے اسے اپنی زندگی کا مقصد وحید بنا لیا۔ غالب لائبریری کے لیے اپنے شب وروز وقف کردیے۔ کیسے کیسے اور کہاں کہاں سے کتابیں حاصل کیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اکثر اپنی فوکس ویگن میں میرے یونیورسٹی کے مکان پر آتے اور جتنی بھی کتابیں مل جاتیں لے جاتے۔ ان کا یہ رویہ ہر دوست کے ساتھ تھا۔ اس رویے کے دو نتیجے نکلے غالب لائبریری ایک مقتدر ادارہ بن گئی اور مرزا دل کے مریض ہوگئے۔ لائبریری ہی کی تگ ودو میں ان کا انتقال ہوا لیکن ان کی زندہ یادگار غالب لائبریری موجود ہے۔

مرزا صاحب کے بعد خواجہ صاحب نے ادارہ یادگار غالب اور غالب لائبریری کو سنبھالا۔ انھوں نے کوئی عہدہ تو قبول نہیں کیا بس کام کرتے رہے۔ برسوں محنت کی۔ بڑی خاموشی اور لگن سے کام کرتے رہے۔ تحقیق کرنے والوں اور طلبہ کی رہنمائی کے لیے لائق آدمی لائبریری میں رکھے۔ پروفیسر لطیف اللہ نے کچھ دن کام کیا۔ ڈاکٹر مشرف احمد اس کام پر مامور رہے۔ اب شہاب قدوائی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کتابوں میں اضافہ ہورہا ہے۔ ادارے کا رسالہ ”غالب“ اور ادارے کی جانب سے علمی اور ادبی کتابیں مسلسل شائع ہوتی ہیں۔ مرزا صاحب کے دور میں اشاعتی پروگرام نہیں تھا۔ یہ تشکیل وتعمیر کا دور تھا۔ خواجہ صاحب نے اشاعتی پروگرام کے اضافے سے ادارے کو بہت زیادہ فعال بنادیا۔ ان کی تنظیمی صلاحیت اور منصوبہ بندی سے ادارے کو بہت فائدہ ہوا۔

خواجہ صاحب کالم بڑے اہتمام سے لکھتے تھے۔ ایک دن میں نے فون کیا۔ چند مسائل پر بات کرنا تھی مگر انھوں نے کہا: ” آج کالم کا دن ہے۔ آج لمبی بات نہیں ہوگی۔“ ان کے کالم تیز وتند اور برجستہ فقروں سے مزین ہوتے تھے۔ پہلودار اور کاٹ دار، متعدد اخباروں اور رسالوں میں نقل ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب کے کالموں کے مستقل ہدف دو اشخاص تھے، ان میں سے ایک استاد اختر انصاری اکبرآبادی۔ بڑی دلچسپ

چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ بڑے گرما گرم فقرے ہوتے تھے مگر قابل غور بات یہ ہے کہ اس ساری چھیڑ چھاڑ کے باوجود جب اختر انصاری کا انتقال ہوا تو گھر میں قطب بن کر بیٹھے رہنے والے مشفق خواجہ حیدر آباد گئے اور ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ غالباً سارا انتظام بھی انھوں نے کیا تھا۔

دوسرا ہدف کراچی کے ایک ادبی رسالے کے مدیر تھے۔ ان کے بارے میں خواجہ صاحب کا یہ فقرہ کہ ''موصوف اپنے رسالے کا اداریہ تک نہیں لکھتے''، بڑا مقبول ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے بارہا ان کے بارے میں لکھا کہ موصوف صاحب ثروت اور تندرست و توانا ہونے کے باوجود معذور ادیبوں کے فنڈ سے پنشن وصول کرتے ہیں۔ وہ ان کے رسالے کے خریدار تھے۔ باقاعدہ سالانہ چندہ ادا کرتے تھے۔ کہتے تھے میں ان کا رسالہ مفت نہیں پڑھتا۔ جب تک خواجہ صاحب کا کالم چلتا رہا، موصوف کی مدح میں پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔ بڑے برجستہ اور گرما گرم فقرے پڑھنے میں آتے رہے۔

ایک کام خواجہ صاحب نے اور شروع کیا لیکن یہاں ان کی تنظیمی صلاحیت ان کے لیے مالی نقصان کا سبب بن گئی۔ ناتجربہ کاری بھی آڑے آئی۔ انھوں نے مکتبہ اسلوب کے نام سے علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا ذاتی ادارہ قائم کیا۔ کتابیں شائع کیں اور اس زمانے میں انھوں نے مجھ سے کہا: ''میری کتاب اشاعت کے تیسرے دن ملک کے دور دراز گوشوں میں بھی پہنچ جاتی ہے۔'' پہنچ تو جاتی تھی لیکن فروخت نہیں ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب نے جو کتابیں شائع کیں ان میں سے بیشتر علمی تھیں۔ علمی کتابوں کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مالی نقصان مسلسل ہوتا رہا اور آخر کار خواجہ صاحب کو مکتبہ اسلوب بند کرنا پڑا...... یہی ایک ایسی مہم تھی جس میں سپر ڈالنا پڑی۔

مکتبہ اسلوب کی وجہ سے مالی نقصان ہوا سو ہوا۔ ایک دفعہ ایسی صورت حال بھی پیدا ہوگئی جس سے دھماکا ہو سکتا تھا مگر اس کی روداد بیان کرنے سے پہلے میں پس منظر کے طور پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خواجہ صاحب میں یہ صفت تھی کہ ہر نو وارد کراچی کو کلیجے سے لگاتے تھے۔ بوڑھوں سے استفادہ کرتے، نوجوانوں کو تربیت دیتے۔ انھوں نے بہت سے نئے آنے والے بزرگوں سے استفادہ کیا اور بہت سے نوجوانوں کو علمی اور ادبی تربیت دے کر ادبی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔ استفادے اور تربیت کی مہم میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ خواجہ صاحب کے لیے ''نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ'' کی نوبت بھی آ گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ایک بزرگ عالم کی کتاب شائع کی۔ کتابیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان پر رسالوں، اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی سے تبصرے بھی ہوتے رہتے تھے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ایک دن ٹی وی سے فون آیا کہ کل فلاں کتاب پر تبصرہ ہے۔ آپ شام کو آٹھ بجے تشریف لے آئیے اور تبصرہ کر دیجیے۔ میں نے کہا: ’’خواجہ صاحب نے یہ کتاب مجھے بھجوائی ہے نہ میں نے دیکھی ہے۔ کتاب پڑھے بغیر تبصرہ کیسے ہو سکتا ہے۔‘‘ پروڈیوسر صاحب میرے بہت عزیز شاگرد تھے۔ انھوں نے کہا: ’’کتاب آپ کو ملتی کیسے۔ کل ہی تو چھپ کر آئی ہے۔ پروگرام پہلے سے بن چکا تھا۔ اب آپ ایسا کیجیے کہ مغرب پڑھ کر یہاں آ جائیے اور آرام سے میرے کمرے میں بیٹھ کر کتاب دیکھ لیجیے۔‘‘ ان کے اصرار تاجورانہ کے سامنے میری کلاہ درویشی کو جھکنا پڑا۔ چنانچہ اگلے دن میں ٹی وی اسٹیشن پہنچ گیا۔

پروڈیوسر صاحب نے مجھے آرام سے بٹھایا۔ کتاب میرے حوالے کی۔ میں نے مطالعہ شروع کیا۔ پڑھتا جاتا تھا اور کھولتا جاتا تھا۔ مؤلف نے اختراعی اور وضعی روایتوں کے سہارے بڑے معصوم انداز میں اکابر کی کردار کشی کی تھی۔ خدا معلوم کہاں کہاں کی خرافات جمع کر دی تھیں۔ میں نے پروڈیوسر صاحب سے کہا کہ اس کتاب پر بے لاگ تبصرے سے میری عافیت اور تمھاری ملازمت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور کتاب کے مندرجات عام ہونے پر ایک فرسٹ کلاس فساد بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بڑے پریشان ہوئے۔ پروگرام منسوخ ہوا اور میں ناک کان سلامت لے کر گھر آ گیا۔

گھر آ کر میں نے خواجہ صاحب کو فون کیا۔ وہ شام کو عموماً سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے تھے۔ گھر پر ذرا مشکل ہی سے ملتے تھے مگر اس دن اتفاق سے گھر پر موجود تھے۔

پوچھنے لگے: ’’تبصرہ ریکارڈ ہو گیا‘‘؛ میں نے کہا: ’’کیا آپ نے اس کتاب کا مسودہ دیکھا تھا؟‘‘ بولے: ’’نہیں، کیا ضرورت تھی، ایک بزرگ کرم فرما کی کتاب ہے، ٹھیک ہی ہو گی۔‘‘ میں نے کہا: ’’آپ صرف ابتدائی پچیس صفحے پڑھ کر ایک گھنٹے بعد مجھے فون کیجیے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔‘‘

خواجہ صاحب کا فون ایک گھنٹے سے پہلے ہی آ گیا۔ کہنے لگے: ’’بڑا غضب ہوا۔ یہ صورتِ حال میری غفلت سے پیدا ہوئی۔ صبح وہ ساری کتابیں واپس منگوا لوں گا جو بازار میں بھیجی ہیں۔ اس وقت اگر آپ کے علاوہ کوئی اور تبصرہ کر دیتا تو آفت ہو جاتی۔ آپ کی وجہ سے صورتِ حال خراب ہونے سے بچ گئی۔‘‘ میں نے کہا: ’’بچانے والا اللہ ہے۔ آپ کی کوئی نیکی کام آ گئی۔۔۔ چونا لگانے والے بڑی مشکل سے پہچانے جاتے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔۔۔ لیکن بقول جوش

قدم پست و بلند دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی بچ کر کوئی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

خواجہ صاحب نے خوش طبعی سے کام لیا۔ کہنے لگے: ''میں تو پان ہی نہیں کھاتا مگر چونا لگ جاتا ہے۔'' اس طرح یہ آئی بلا ٹل گئی۔

☆

جب آصف نے لکھنا پڑھنا شروع کیا تو انھوں نے بڑی حوصلہ افزائی کی۔ آصف نے ممتاز شیریں کی کتاب ''نوری نہ ناری'' مرتب کی تو خواجہ صاحب نے اسے اپنے مکتبہ سے شائع کیا۔ آصف کے مرتب کردہ ادیبوں اور شاعروں کے مصاحبوں کے مجموعے کا نام تجویز کیا۔ انہوں نے اس کی اشاعت کا انتظام بھی کیا تھا لیکن ان کا مکتبہ ہی بند ہو گیا۔ وہ آصف کی ادبی کاوشوں کو پسند کرتے تھے اور مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ آصف کبھی آزردہ ہوتے تو خواجہ صاحب سمجھاتے کہ شکر کرو تم محسود ہو، کبھی حاسد نہ بننا اور حسد کرنے والوں کا جواب نہ دینا۔'' کبھی آصف کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہتے: ''یہ آپ کی سب سے وقیع تصنیف ہے۔'' ان کے اس فقرے پر میں لاجواب ہو جاتا۔

کراچی یونیورسٹی میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد میری سبکدوشی کا وقت آیا۔ اس وقت سے کچھ پہلے مختار زمن مرحوم نے کہ میرے بزرگ بھی تھے اور دوست بھی تھے، اپنے معمول کے بے تکلفانہ انداز میں کہا: ''یار اسلم، تم انجمن میں آ جاؤ۔'' وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس نظماء کے رکن تھے۔ پھر ایک دن نور الحسن جعفری صاحب نے فون کیا: ''آپ انجمن آ جائیے۔'' وہ انجمن کے ناظم اعلیٰ تھے۔ انھوں نے کہا: ''ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔'' میں نے معذرت کی کہ کچھ دن آرام کر لینے دیجیے مگر انھوں نے کہا: ''آرام وارام کا خیال چھوڑیے کام کیجیے۔'' چنانچہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوتے ہی میں مشیر علمی و ادبی کی حیثیت سے انجمن پہنچ گیا۔

انجمن جانے سے پہلے میں نے خواجہ صاحب سے مشورہ کیا۔ وہ میری بات سن کر ہنسے۔ بولے کہ مجھے سب خبر ہے۔ آپ بے کھٹکے آ جائیے۔ وہ بھی انجمن کی مجلس نظما کے رکن تھے۔ قدرت اللہ شہاب مرحوم صدر انجمن تھے۔ عالی صاحب جنرل سکریٹری اور جالبی صاحب خازن، تاہم خواجہ صاحب فعال ترین رکن تھے۔ سارے معاملات انہی کی صوابدید سے طے ہوتے تھے اور ان کے فیصلے قطعی سمجھے جاتے تھے۔

انجمن میں رجوع بکار ہوتے ہی مجھ میں اور خواجہ صاحب میں ایک خاموش معاہدہ ہو گیا۔ اس کی ہم دونوں نے پوری پوری پاسداری کی۔ معاہدہ یہ تھا کہ میں ان کے کسی منصوبے کی مخالفت یا تردید نہیں کروں گا اور وہ میری کسی رائے سے اختلاف نہیں کریں گے۔ اس خاموش معاہدے سے انجمن بہت سے مخمصوں سے محفوظ رہی۔

انجمن کے جنرل سیکرٹری عالی صاحب ادیبوں، شاعروں، اساتذہ اور دانش وروں کے لیے ہمیشہ سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ادارہ مصنفین پاکستان میں انھوں نے ادیبوں کی بھلائی کے بہت سے کام کیے۔ آج بھی وہ اپنی اسی روش پر قائم ہیں۔ ان کی اس فراخ دلی سے ہمارے لیے بعض اوقات کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بزعم خویش محقق کو دو متاخرین کے ایک شاعر کا مخطوطہ حاصل ہو گیا۔ انھوں نے فوراً اسے نقل کیا۔ ایک الٹا سیدھا دیباچہ لکھا اور عالی صاحب کے حوالے کیا کہ انجمن اسے شائع کر دے۔ عالی صاحب نے یہ مخطوطہ مجھے بھجوا دیا۔ میں نے پہلا صفحہ پڑھا تو دماغ گھوم گیا۔ نقل را چہ عقل کے مصداق جناب محقق نے نوے فی صد مصرعے ناموزوں کر دیے تھے۔ حمد یہ قصیدہ تھا۔ دقیق اور غریب الفاظ کا حلیہ اس طرح بگاڑا تھا کہ آب آئینہ زنگار آئینہ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بڑا بھنایا۔ خواجہ صاحب کو فون کیا۔ صورت حال بتائی۔ انھوں نے کہا ”میرے پاس بھیج دیجیے۔“ چنانچہ مسودہ انھیں بھیج دیا گیا۔ انھوں نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا اور مسودے کے نقائص کو پوری طرح آشکار کر دیا۔ میں نے خواجہ صاحب کی رائے کی تائید کی اور مسودہ عالی صاحب کو واپس بھجوا دیا۔ خدا معلوم انھوں نے جناب محقق سے کیسے پیچھا چھڑایا مگر مجھ سے یا خواجہ صاحب سے کوئی شکایت نہیں کی۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ یہ بھی پہلے ہی واقعے کی طرح کا ہے۔ ایک صاحب نے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا۔ مقالے پر ڈگری بھی مل گئی۔ اب انھیں شوق اشاعت دامن گیر ہوا۔ عالی صاحب سے رجوع کیا اور انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ یہ مقالہ علمی دید و دریافت کا شاہکار ہے۔ عالی صاحب نے مقالہ خواجہ صاحب کو بھجوا دیا۔ انجمن کی اشاعتی کمیٹی کے تین رکن تھے: عالی صاحب، خواجہ صاحب اور مشیر علمی و ادبی حیثیت سے یہ خاکسار۔ خواجہ صاحب نے مقالہ پڑھ کر مجھے فون کیا کہ اسے آپ سنبھالیں۔ میں نے مقالہ پڑھا تو نزاعی اور مختلف فیہ مسائل کا مجموعہ نظر آیا۔ چنانچہ میں نے پوری دیانت داری سے بے لاگ رائے لکھ کر خواجہ صاحب کو بھیج دی۔ انھوں نے میری رائے پر تائیدی نوٹ لکھ کر عالی صاحب کو بھجوا دیا۔ پھر کیا ہوا۔ یہ مجھے نہیں معلوم لیکن انجمن ایک اشاعتی صدمے سے بچ گئی۔

انجمن میں، میں نے خواجہ صاحب کی تائید سے بزرگ ادیبوں کو مدعو کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پیر و مرشد حضرت استاذی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب قبلہ نے زحمت فرمائی۔ بزرگ ادیب اشرف صبوحی آئے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو بلایا۔ قاسمی صاحب کو بلایا۔ توسیعی خطبات کا آغاز کیا۔ ہندوستان سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی آئے۔ ڈاکٹر نثار فاروقی نے غالب پر خطبہ دیا۔ ان کے خطبے کے بارے میں روزنامہ ڈان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کے ادبی رپورٹر نے غضب کا فقرہ لکھا تھا:

> ***"The Learned Professor came all the way from Delhi to tell us that Ghalib was a pious Musalman."***

عزیز حامد مدنی نے جدید شاعری پر خطبہ دیا جس کی بڑی دھوم ہوئی۔ بعد میں مدنی صاحب نے اسے توسیع دے کر کتابی شکل دے دی۔ یہ کتاب انجمن نے دو حصوں میں شائع کی۔

یہ سب کچھ ہوا۔ بے شمار لوگ ان جلسوں اور تقریبوں میں آ گئے مگر نہیں آئے تو خواجہ صاحب۔ کسی ایک جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ادبی جلسوں میں نہ جانے کے فیصلے پر قائم رہے اور صاف دامن بچا گئے لیکن میں نے ان کی اصول شکنی بھی دیکھی۔ آغا خان میڈیکل یونیورسٹی نے مشتاق احمد یوسفی صاحب کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ ڈاکٹروں کو ادب سے کیا واسطہ مگر جب پہنچا تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بمشکل بیٹھنے کی جگہ ملی۔ یوسفی صاحب کا مضمون اور ان کے پڑھنے کا انداز۔ ایک ہندی دوہے کا پہلا مصرع یاد آتا ہے، ''ایک تو مدھ بھرے نینا دوجے انجن سار''۔ میں نے بہت سے شاعروں کو مشاعرے لوٹتے اور سماں باندھتے دیکھا ہے لیکن نثر نگار یا تو من من کر کے چلے جاتے ہیں یا مضمون نہیں پڑھتے۔ گھاس کاٹتے ہیں۔ یوسفی صاحب کا پڑھنا جیسے قوس قزح کے سارے رنگ بکھر گئے ہوں، جیسے کلیاں چٹک رہی ہوں، جیسے دلوں میں گدگدی ہو رہی ہو اور کبھی کبھی حد رفتار بھی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب یوسفی صاحب مضمون پڑھ کر چائے کے لیے باہر آئے تو ان کے ساتھ خواجہ صاحب بھی تھے۔ 'حق یوسفی' ایسا زبردست تھا کہ خواجہ صاحب نے عہد شکنی گوارا کر لی۔ اس تقریب کے علاوہ میں نے انھیں کسی اور ادبی تقریب میں نہیں دیکھا۔ یوسفی صاحب سے ان کے بڑے برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ میں نے دعوتوں میں دونوں کو یکجا دیکھا ہے اور بارہا دونوں کی پرلطف گفتگو سے محظوظ ہوا ہوں۔ فاطمہ حسن کے یہاں ہر کھانے میں یوسفی صاحب اور خواجہ صاحب ضرور ہوتے تھے۔ بڑی رونق رہتی تھی۔

خواجہ صاحب انجمن میں فیصلے بڑی قطعیت سے کرتے تھے۔ بے لاگ رائے دیتے تھے۔ میٹنگوں میں بات کرتے تو لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ انجمن کے تمام کاموں پر نظر رکھتے تھے۔ کسی مسل پر کچھ لکھتے تو مسئلے کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لیتے تھے۔ انھیں انجمن کا مفاد عزیز تھا۔ اس وجہ سے وہ ہر ایسے اقدام کی ڈٹ کر مخالفت کرتے تھے جو انجمن کے لیے نقصان دہ ہو۔

ایک دفعہ نورالحسن جعفری مرحوم نے جو ان دنوں صدر انجمن تھے خود بخود فیصلہ کر لیا کہ کتب خانہ خاص میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور لاطینی کی جو کتابیں موجود تھیں انھیں کسی اور کتب خانے میں دے دیا جائے تاکہ اردو کی مزید کتابوں کے لیے جگہ نکل آئے۔ جب انھوں نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو میں بڑا پریشان ہوا۔ بہتیرا سمجھایا کہ یہ سب کتابیں اردو زبان کی ابتداء، تاریخ، لسانی نظریات اور تاریخ اسلام کے مستند حوالوں کی بنیادی کتابیں ہیں۔ انھیں انجمن ہی میں رہنا چاہیے مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تنگ آ کر میں نے خواجہ صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ خواجہ صاحب نے جعفری صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہنے لگے: ''بابائے اردو نے جو حوالہ جاتی ذخیرہ ایک عمر کی محنت سے جمع کیا تھا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ بالکل برباد ہو جائے۔'' ان کے کہنے پر جعفری صاحب اس خیال سے باز رہے اور غیر ملکی زبانوں کی نادر کتابوں کا ذخیرہ محفوظ رہا۔ اس طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کی سوجھ بوجھ اور اثر سے صورتِ حال خراب ہونے سے بچ جاتی تھی۔

آخر کار تمام اچھی چیزوں کی طرح اس برادرانہ رفاقت اور اشتراک کا بھی حسنِ خاتمہ آ پہنچا۔ تمت بالخیر ہوا۔ میں نے خرابیِ صحت کی وجہ سے انجمن سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پہلے روزانہ کم از کم چار فون ہوتے تھے۔ اب دن بھر میں ایک فون کی نوبت آ گئی مگر یہ فون بھی دو تین پر بھاری ہوتا تھا۔ فون پر اس ہیچ مدان کی آزمائش بھی ہوتی رہتی تھی۔

وہ شعرائے اردو کے سارے تذکروں کو چاٹے بیٹھے تھے۔ شعرائے فارسی کے تذکروں پر بھی گہری نظر تھی۔ ''خوش معرکہ زیبا'' مرتب کرنے کی وجہ سے شعرائے لکھنؤ سے گہری شناسائی تھی مگر کبھی کبھی اس طرح کے فون آتے تھے اور اس طرح کی گفتگو بھی ہوتی۔

''ارے ڈاکٹر صاحب! دوسرا مصرع کیا ہے، ''مے باقی و ماہتاب باقی''۔ ''مارا بتو صد حساب باقی''۔ ''اچھا اچھا۔ ہے کس کا؟'' ''نسبتی تھانیسری سے منسوب ہے''۔ ''اچھا تو کچھ اس کے حالات''...... ''آپ سارے تذکرے لیے بیٹھے ہیں۔ کسی میں دیکھ لیجیے۔''

پھر کسی دن فون آیا۔ یہ شعر کس کا ہے۔

شورے شُد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

WWW.KITAABGHAR.COM

آپ کے ممدوح محمد حسین آزاد نے سرمد کے کھاتے میں ڈالا ہے۔ ''غزالی مشہدی کا شعر ہے۔ میرے ممدوح نے شعر سرمد کے کھاتے میں نہیں ڈالا۔ یہ لکھا ہے کہ جب جلاد شمشیر بکف اس کے سامنے آیا تو اسے دیکھ کر کہا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا می شناسم اور یہ شعر پڑھ کر گردن جھکا دی۔''

ایک دن کہنے لگے: ''شعرائے لکھنو کے کلام میں فطرت کا حسن نہیں ہے۔'' میں نے جواباً کہا: ''ناسخ کی وہ غزل''۔

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

آپ کو یاد ہوگی۔ بولے ''اور آتش'' میں نے شعر پڑھا۔

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی
کیا کیا جلا ہے ساکھو پھولا جو ڈھاک بن میں

کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے ''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے کہا ''ڈھاک کے پتے تو تین ہی ہوتے ہیں لیکن پھول بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ ڈھاک پھولتا ہے تو بن میں روشنی سی ہو جاتی ہے۔ بہار آجاتی ہے۔ ساکھو، سال لکڑی مضبوط اور عمارتی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں لمبے تڑنگے آدمی کو دیکھ کر فقرہ کستے تھے۔ ''ساکھو کا لٹھا چلا جا رہا ہے''۔ یہاں جلنے کے لفظ کا استعمال استادانہ ہے'' خواجہ صاحب کہنے لگے، ''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اگر ایس ایم کالج کا طالب علم ہوتا تو آپ کا شاگرد ہوتا۔ جائے استاد خالیست۔'' میں نے کہا: ''یہ تبادلہ خیال اور معاصرانہ دید و دریافت ہے۔ استادی شاگردی نہیں۔'' لیکن یہ ایک طرفہ ٹریفک نہیں تھا۔ میں بھی گاہے گاہے ان کی معلومات سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری دور تک جاری رہا۔

میری کتاب ''دبستان نظامؒ'' شائع ہوئی تو ایک نسخہ انھیں بھیجا۔ انھوں نے دوسرے دن فون کیا: ''آپ سے یہ توقع نہیں تھی''۔ ''کیوں؟ خیر تو ہے''۔ ''پروف ریڈنگ میں ایسی کوتاہی۔ ابتدا میں جو منقبت ہے اس میں دو قبیح غلطیاں ہیں۔ مصرع یوں ہے۔ وز دوست زماں زماں پیامت۔ کتاب میں زمان کا لفظ تین دفعہ لکھا گیا ہے اور اس مصرعے میں اسے خُلق محمدی کے زندہ مفہوم میں زندہ کا لفظ زائد ہے۔'' میں نے کہا: ''دونوں غلطیاں نہایت قبیح ہیں۔ اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے اطلاع دے دی۔'' کہنے لگے: ''دراصل اب کوئی اچھا تصحیح کرنے والا نہیں رہا۔ پروف پڑھنے والے پروف سرسری طور پر دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''ہر شخص آپ کی نظر کہاں سے لائے۔ پوری کتاب پڑھ کر غلط نامہ مرتب کر دیجیے'' مگر انھوں نے یہ دردسر نہیں پالا۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ابھی کوئی دس پندرہ دن ہوئے میری بیوی نے بی اے کی درسی کتاب میں شامل مصحفی کی غزل کے ایک مصرعے کی تصحیح چاہی۔ غزل مجھے یاد تھا، "جب واقف راہ وروش ناز ہوئے تم۔" بدقسمتی سے جس مصرعے کی تصحیح مقصود تھی وہی یاد نہیں آیا۔ حافظے کا عجز۔ دیوان مصحفی تلاش کیا۔ نہیں ملا۔ کس سے پوچھوں۔ حسب معمول فون پر نمبر گھمایا، "چھیاسٹھ۔ دس۔ چھ سو اڑتالیس۔" معاً خیال آیا۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا تھا۔ فون رکھ دیا اور افسوس کرتا رہا کہ خواجہ صاحب کے بعد اتنے بڑے اور بھرے پُرے شہر میں کوئی ایک مصرع بتانے والا نہیں رہا۔

حضرت سلطان جی قدس سرہ العزیزؒ کے عُرس میں ہر سال میرا دلی جانا ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب کو اطلاع دیتا تو وہ کسی نہ کسی کتاب کی فرمائش کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے لیکچروں کی فرمائش کی۔ ایک دفعہ واقعات دار الحکومت دہلی کی تیسری جلد منگوائی۔ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں ان کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت کی فرمائش کی تھی مگر مکتبہ جامعہ کے مہتمم شاہد علی خان صاحب کی کوشش کے باوجود کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ بعد میں خواجہ صاحب نے کسی اور ذریعے سے یہ کتاب حاصل کر لی۔ ان کے پاس خودنوشتوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ایک بار انھوں نے بتایا تھا کہ اردو کی بیشتر خودنوشتیں ان کے پاس موجود ہیں۔ وہ خودنوشتیں انھیں خاص طور پر پسند تھیں۔ روسو کے اعترافات اور کیسانووا کی آپ بیتی۔ کیسانووا کی آپ بیتی مدتوں ان کی دفتری میز پر رکھی رہی۔ وہ اس کے بڑے مداح تھے۔ ایک آدھ مرتبہ اس کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی۔ روسو کے اعترافات کی پسندیدگی اتنی تھی کہ انھوں نے اردو میں اس کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ مکمل ہوا یا نہیں، اب کون بتائے۔ آصف سے انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا: "میں نے روسو کے اعترافات کا فارسی ترجمہ ایران سے منگوایا ہے اور کئی ابواب ترجمہ بھی کر چکا ہو۔" آصف نے جب "دنیازاد" کی اشاعت شروع کی تو ان سے ایک آدھ باب اشاعت کے لیے طلب کیا لیکن وہ ٹال گئے۔ غالباً پوری کتاب شائع کرنا چاہتے ہوں گے۔ ویسے "اعترافات" کا ایک ملخص ترجمہ جاسوسی ناولوں کے معروف مترجم منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے ۱۹۴۱ء میں لاہور "روسو کی سیاہ کاریاں" کے نام سے شائع کیا تھا۔

خواجہ صاحب کو کتابوں سے عشق تھا۔ ان کا گھر کیا تھا کتب خانہ تھا۔ مرتب کتب خانہ، اس کے لیے انھوں نے ایک آدھ آدمی بھی رکھ چھوڑا تھا۔ کتابوں کے علاوہ خطوط اور کاغذات کا بھی بڑا نادر ذخیرہ تھا۔ وہ جس نادر کتاب کو دیکھتے، کوشش کرتے کہ ان کے کتب خانے کی زینت بن جائے۔ میرے پاس انشا کا ایک بڑا اچھا قلمی نسخہ تھا۔ خواجہ صاحب کو خبر ہوئی تو بڑا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے وہ نسخہ انھیں دے دیا مگر پھر انھوں نے متعدد تقاضوں کے باوجود واپس نہیں کیا۔ کہتے کہ میرے پاس محفوظ ہے اور آپ نگہداشت کی زحمت سے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

بچے ہوئے ہیں۔ انھیں میری بعض دوسری قلمی کتابوں کی سن گن بھی تھی۔ یہ معلوم تھا کہ مفتی ولی اللہ کی تاریخ فرخ آباد کا نسخہ میرے پاس ہے مگر انھوں نے اس کا مطالبہ نہیں کیا کیوں کہ یہ نسخہ میرے لیے خاندانی یادگار کی حیثیت رکھتا تھا اور خاندانی یادگاروں کا احترام انھیں بھی تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے ''نظامی عبسری'' کی فرمائش کی۔ کہنے لگے: ''میں نے اب تک نہیں پڑھی۔'' میرے پاس دو نسخے تھے چنانچہ ایک میں نے انھیں یہ کہہ کر بھجوا دیا کہ اسے آپ ہی رکھیے۔ میرے پاس دوسرا نسخہ موجود ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ بعض پرانے رسائل کے کچھ شمارے بھی میں نے ان کی نذر کیے تھے۔ میرے پاس مختلف شہروں کی تصاویر کا ایک بڑا نادر ذخیرہ تھا۔ یہ ذخیرہ بھی میں نے انھیں دے دیا تھا کیوں کہ میرے لیے اس کا سنبھالنا مشکل تھا۔

خواجہ صاحب شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ابیات ان کے ذوق شعری اور شعری صلاحیت کا آئینہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ''ابیات'' کے بعد ان کی شاعری برائے بیت رہ گئی تھی۔ تحقیق کی لذت اور نثر کی رعنائی نے انھیں پوری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے نہ کسی شعری نشست میں شعر سناتے تھے۔ طویل تعلقات کے باوجود میں نے صرف ایک دفعہ انھیں شعر سناتے دیکھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے یہاں حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے ایک شاعر کے اعزاز میں کھانا ہوا۔ کھانے کے بعد محفل جمی اور شعرأ نے اپنا کلام سنایا۔ خواجہ صاحب کی باری آئی تو وہ انکار نہیں کر سکے۔ ایک غزل سنائی۔ لوگوں نے دوسری کی فرمائش کی مگر وہ سنی ان سنی کر گئے۔ اس محفل کے علاوہ میں نے انھیں کہیں اور شعر سناتے نہیں دیکھا۔ وہ شعر کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ شعر کے اچھے پارکھ تھے مگر شعر سنانے سے گریز کرتے تھے انھیں اشعار اور شعرأ کی تحقیق میں سرگرم رہتے تھے۔ کتابوں، رسائل، کاغذات اور خطوط کے علاوہ انھیں فوٹوگرافی سے بھی شغف تھا۔ ادیبوں، شاعروں، دوستوں اور بچوں کی تصویریں کھینچتے رہتے تھے۔ بعض اوقات وہ دوستوں کی کسی تقریب میں کھانے سے پہلے یا بعد حاضرین کی تصویریں کھینچتے تھے۔ پلاسٹک کے ایک بیگ میں کیمرا اور ساز و سامان ساتھ لے کر آتے تھے۔ اس حوالے سے ایک دفعہ ان پر ایسا برجستہ فقرا ہوا کہ وہ جواب نہ دے سکے، جھنجھلا گئے۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی آئے ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں مختار زمن مرحوم کے یہاں محفل سماع ہوئی۔ محفل سماع سے پہلے خواجہ صاحب نے کچھ تصویریں کھینچنے کے لیے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس پر نثار فاروقی نے برجستہ کہا: ''اچھا تو آج آپ اپنی کسوت بھی ساتھ لائے ہیں۔'' سب نے قہقہہ لگایا مگر خواجہ صاحب کھسیا گئے اور جواب نہ دے سکے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

خواجہ صاحب اہل علم کی تکریم کرتے تھے۔ طلبہ اور تحقیق و جستجو کا کام کرنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ لوگ خطوط کے ذریعے بھی ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اتوار کی صبح ان کے یہاں اذن عام ہوتا تھا۔ بہت لوگ جمع ہوتے تھے۔ یہ کراچی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا بڑا فورم تھا۔ ان کی وفات سے یہ فورم بھی ختم ہوگیا۔

ارباب مختلفہ ومتفرقہ ومتفاوتہ کی یلغار [illegible] اور جسمانی سے تنگ آ کر انھوں نے بذات خود فون سننے اور ملنے جلنے میں بہت کمی کر دی تھی۔ وقت بے وقت آنے والوں کے لیے دروازے پر ایک شعر آویزاں کر دیا تھا مگر آنے والے شیر ایسے شعروں کی کیا پروا کرتے ہیں۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ پیرو مرشد حضرت استاذی ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان صاحب قبلہ کے صاحبزادے سراج میاں بیان کرتے تھے کہ ایک صاحب ہفتے دس دن بعد کراچی سے رات کے دس بجے والی پسنجر سے حیدرآباد روانہ ہوتے۔ کوئی دو بجے ڈاکٹر صاحب قبلہ کے در دولت پر پہنچتے اور اس زور وشور سے آواز دیتے اور دروازہ کھٹکھٹاتے کہ محلے والے تو کیا قبر کے مردے بھی اٹھ بیٹھیں۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ باہر نکلتے تو بن بلائے مہمان کہتے: ”بھوکا آیا ہوں۔ میرے کھانے کا فوراً بندوبست کیجیے۔“ ڈاکٹر صاحب کے فرمانے سے پہلے ہی گھر والے اس بلائے بے درمان کے چرندم خرندم کا انتظام شروع کر دیتے تھے۔ وہ صاحب جب تک زندہ رہے اسی طرح کرم فرماتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ شگفتگی اور درویشانہ انکسار سے ان کی پذیرائی کرتے رہے جہاں تک ممکن ہوتا خواجہ صاحب بھی ناخواندہ مہمانوں کو گوارا کر لیتے تھے لیکن اکثر شکایت بھی کرتے تھے۔ گھبرانے میں بے آرامی اور خرابی صحت کو بھی دخل تھا۔

خواجہ صاحب محبت اور نفرت دونوں میں عمیق تھے۔ محبت کرنے والوں کے ناز اٹھاتے اور جہاں کہیں کوئی ان کے منہ آتا تو پھر ترکی بہ ترکی جواب بھی دیتے۔ ایک دفعہ کراچی کے ایک شاعر نے آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں انھیں 'ادب کا خواجہ سرا' کہا۔ انھوں نے اسے معاف نہیں کیا۔ اگر اس کا تذکرہ ہوتا تو ہمیشہ برہمی کا اظہار کرتے۔ ان کی یہ برہمی کبھی ختم نہیں ہوئی۔

اردو کے ایک استاد حسن اختر نے (میرا خیال ہے یہی نام تھا) خواجہ صاحب کے بارے میں کچھ سخت باتیں لکھ دیں۔ انھوں نے بڑا تند جوابی مضمون لکھا اور انھیں خاموش کر دیا۔ وہ دشمنوں کے دشمن اور دوستوں کے دوست تھے۔ دشمنوں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ان کے یہاں حصول علم وادب کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ ایک زمانے میں مطالعہ بیدلؔ کا شوق ہوا۔ ہفتے میں ایک بار ایک چھوٹی سی محفل منعقد ہوتی۔ پروفیسر لطیف اللہ میر محفل ہوتے۔ بیدلؔ کی کوئی غزل پڑھی جاتی اور اس پر گفتگو ہوتی۔ ایک آدھ دفعہ انھوں نے مجھے بھی اس محفل میں میر محفل بنانا چاہا مگر میں جا نہیں سکا۔ پھر یہ محفل ختم ہوگئی۔

خواجہ صاحب ہوش و گوش کے انسان تھے۔ نہایت باخبر۔ معمولی سے معمولی ادبی واقعے سے پوری طرح باخبر رہتے تھے اور دوستوں کو اس سے آگاہ کرتے تھے۔ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ بیرونی دنیا سے ان کے رابطے کے دو ذریعے تھے، فون اور ڈاک۔ ایک دن میرا فون خراب تھا۔ وہ بات کرنا چاہتے تھے مگر ممکن نہیں ہوا۔ دوسرے دن انھوں نے کہا: ''میں ڈاکیے کو پچاس روپے مہینہ دیتا ہوں تاکہ میری ڈاک میں گڑبڑ نہ ہو اور سو روپے ماہانہ فون کے لائن مین کی نذر کرتا ہوں۔ نہ میرا فون خراب ہوتا ہے نہ ڈاک میں گڑبڑ ہوتی ہے۔'' میں نے کہا: ''یہ تو صریحاً رشوت ہے۔'' بولے: ''آپ اسے رشوت کہہ لیں۔ میں اسے 'حق الخدمت' کہتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔ ''انھیں تنخواہ کس بات کی ملتی ہے؟'' مگر انھوں نے میری بات نہیں مانی۔ کہنے لگے: ''میں انھیں پیسے اپنی خوشی سے دیتا ہوں۔ ان کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔''

بعض باتیں خواجہ صاحب میں بڑی عجیب تھیں؛ مثلاً یہ کہ نیا سال شروع ہوا اور انھوں نے جوڑیا بازار کا رخ کیا۔ دو ڈھائی سو آستین والی بنیانیں خریدیں۔ گھر لے آئے۔ ہر دوسرے دن نئی بنیان پہنتے۔ پہنی ہوئی پھینک دیتے۔ دن بھر بنیان پاجامہ پہنے گھر میں کام کرتے رہتے۔ علامہ ابوالفضل کے بارے میں روایت ہے کہ موسم بدلتا تو وہ گزرے موسم کے سارے کپڑے بانٹ دیتا لیکن پاجامے جلوا دیتا۔ وہ تقسیم نہیں ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب بنیانیں کیوں پھینک دیتے تھے، ممکن ہے آئین ابوالفضل سے متاثر ہو گئے ہوں۔

خواجہ صاحب خوش پوش آدمی تھے۔ جامہ زیب تھے۔ سگریٹ باقاعدگی سے پیتے تھے اور ہمیشہ غیر ملکی قیمتی سگریٹ پیتے تھے۔ موٹر بھی تھی۔ بڑا اجلا خرچ تھا۔ بظاہر صحت بھی اچھی تھی مگر کچھ سال پہلے دل کی تکلیف ہوئی۔ ہسپتال میں داخل ہوئے۔ پھر بہن کے گھر آرام کرتے رہے۔ ٹھیک ہو جانے کے بعد آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ فون پر بات اور دعوتوں میں ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے انتقال سے دو تین دن پہلے میں نے فون کیا اور صحت دریافت کی تو کہنے لگے: ''ویسے تو اب ٹھیک ہوں مگر گردے تکلیف دے رہے ہیں۔'' میں نے کہا: ''گردوں وقاری آسانی سے حاصل نہیں ہوتی'' ہنسنے لگے۔ یہ میری اور ان کی آخری بات چیت تھی۔

اکیس فروری کی شام کو فاطمہ حسن نے فون کر کے کہا: ''سر! خواجہ صاحب کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ آغا خان کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ہیں۔'' میں نے کہا: ''اللہ خیر کرے۔ صبح مجھے خود آغا خان ہسپتال جانا ہے۔ انھیں بھی دیکھ آؤں گا۔'' اتنے میں آصف آ گئے۔ فاطمہ کی گفتگو ان سے ہوئی مگر آصف نے کچھ بتایا نہیں۔ بس خاموش ہو گئے، جیسے ایک دم سناٹے میں آ گئے ہوں۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے جنگ کے اختر سعیدی کا فون آیا کہ خواجہ صاحب گزر گئے۔ تاثرات ریکارڈ کروا دیجیے۔ اس وقت فاطمہ کے تذبذب اور

WWW.KitaboSunnat.com

آصف سناٹے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ فاطمہ نے جس وقت فون کیا تھا، اس وقت خواجہ صاحب وینٹی لیٹر پر تھے۔ رات کو وینٹی لیٹر ہٹا لیا گیا اور وہ رخصت ہو گئے۔ فاطمہ اور آصف نے میری علالت کی وجہ سے مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کیا۔ خواجہ صاحب کے جنازے کو دیکھ کر مجھے نجانے کیوں مصحفی کا شعر یاد آیا۔

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا لبِ قبر
دوش پر نعش مری گبرو مسلمان لے کر

بڑی بھیڑ تھی۔ سبھی وہاں موجود تھے۔ کراچی کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب و شاعر ہو جو وہاں نہ ہو۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد کراچی کے افواہ سازوں اور خبر تراشوں نے حسبِ معمول پھر ایک ہوائی چھوڑی، ''آخری دنوں میں خواجہ صاحب کے مالی حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے۔ ان کی بیگم نے ایک دن ایک غیر ملکی فلاحی ادارے کے سربراہ کو فون کیا اور کہا: "یہ تو آپ سے کچھ کہہ نہیں سکتے مگر اب گزر بہت مشکل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان صاحب کی کوشش سے خواجہ صاحب کے لیے معذور ادیبوں کے فنڈ سے دس ہزار روپے ماہانہ پنشن اور معالجاتی اخراجات منظور ہو گئے۔'' شہر خبرو صاحب نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا: ''دیکھیے یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں اور صاحب خدائی انصاف دیکھی کہ خواجہ صاحب کراچی کے ایک نامور مدیر کو طعنہ دیتے تھے کہ وہ ہٹے کٹے ہو کر معذور ادیبوں کے فنڈ سے پنشن حاصل کر رہے ہیں تو صاحب خود خواجہ صاحب بھی انھی کی صف میں شامل ہو گئے۔'' میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ وہ اس قسم کی انتہائی اہم خبریں نجانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں مجھے سنا چکے تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا: ''بھائی مرنے والوں کو تو بخش دیا کیجیے۔ آپ کی دست برد کے لیے زندہ افراد کیا کم ہیں۔ اگر وہ حیات ہوتے تو ایسی منھ توڑ تردید کرتے کہ سب کا مزاج درست ہو جاتا۔''

اتنا کچھ لکھنے کے بعد خیال آیا اور کیا لکھوں کہاں تک لکھوں۔ کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جن کا اس فسانے میں کوئی ذکر نہیں۔ کتنے مضمون اور کتنے افسوں تشنہ رہ گئے لیکن انگلیاں فگار نہیں ہوئیں۔ خوشبو ہوتی جا رہی ہیں۔ معاً طالب آملی کا شعر ذہن میں گونجا۔

زِ انگشتم نسیمِ غنچۂ فردوس می آید
نمی دانم سحر بندِ گریبانِ کہ وا کردم

نسیمِ غنچۂ فردوس نہ آئے تو اور کیا ہو...... گریبان کس کا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

مشفق خواجہ

دوست، رشتہ دار، عزیز، رفیق کار، ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں، ملتے جلتے ہیں مگر ہم بطورِ خاص نہ تو ان کی ذات و صفات پر توجہ دیتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں شعوری طور پر سوچتے ہیں۔ قرب گویا ایک پردہ سا حائل کر دیتا ہے یوں کہ نظر آتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے لیکن ان کے رخصت ہوتے، جیسے ہی قربت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اچانک ہی انھیں دیکھنے کا تناظر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

۲۲ فروری ۲۰۰۵ء کا اخبار سامنے کھلا تھا جسے میں گویا دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ چند سطروں کی مختصر خبر مشفق خواجہ کی موت کی اطلاع دے رہی تھی، میں جیسے بے حواس ہو گیا۔ سارا دن عجیب بے کلی میں گزارا۔ کالج میں دوستوں سے تذکرہ کرتا رہا، ان کی باتیں کر کے خود کو بہلاتا رہا، ان کے لطیفے سنا سنا کر گویا خود ہنسنے کے بہانے تلاش کرتا رہا۔ سوچا آمنہ بھابی سے فون پر تعزیت کروں مگر زبان تعزیتی الفاظ کی ادائیگی سے قاصر رہی، صبر کرو، اللہ کی مرضی، وقت آ گیا تھا، انسان موت کے سامنے بے بس ہے، عظیم نقصان مگر کتنے سنے الفاظ، کھوکھلے، بے معنی!

مشفق خواجہ...... زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

مشفق خواجہ کی شخصیت متنوع جہات کی حامل تھی۔ تحقیق و تنقید تو صرف شخصیت کا نسبتاً نمایاں پہلو تھا اور دنیا والوں نے انھیں اسی حوالے سے جانا اور مانا تھا۔ وہ محض خشک مقالات قلم بند کرنے والے محقق ہی نہ تھے، شاعر کا قلب حساس بھی رکھتے تھے۔ مجموعہ کلام "ابیات" کے نام سے چھپ چکا ہے مگر انھوں نے شاعری کو کبھی بھی ذریعۂ عزت نہ جانا۔

جب انھوں نے پہلے روز نامہ "جسارت" کراچی اور پھر ہفت روزہ "تکبیر" (کراچی) میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے ادبی شخصیات پر کالم نگاری کا آغاز کیا تو یہ اچنبھے کا تماشا ثابت ہوا کہ بطور طنز نگار ان کے جوہر کھلے۔ ایسے ایسے کاٹ دار فقرے، طرح دار جملے اور پہلو دار کنائے کہ خامہ کی مانند عالم انگشت بہ دنداں والا عالم ہو گیا۔ کالم جس پر لکھا اس کے علاوہ ہر شخص دوسرے کو کالم کے خاص خاص جملے سناتا۔ دراصل ادبی کوتاہیوں، جھوٹ، منافقت اور نالائقیوں کے خلاف یہ کالم ایک نوع کی صدائے احتجاج تھے۔ انھوں نے جب سچ بولنے کا بیڑا اٹھا لیا تو پھر ہر چہ بادا باد۔ قلم کی کشتی مخالفتوں کے ساگر میں ڈال دی، اس ضمن میں انھوں نے

دوستوں کی بھی پروانہ کی۔ کالم کی خاطر کئی ''عزیز'' دوست گنوا دیے مگر انھوں نے خسارے کا یہ سودا خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ تاہم یہ نہ سمجھیے کہ کالم صرف فقرے بازی تک محدود ہوتے تھے۔ ایسا 'انھیں' ان کی تحقیقی معلومات، ادبی شخصیات کے بارے میں ٹھوس اطلاعات اور حقائق فراہم کرتی تھیں۔ اسی طرح ان کی تنقیدی نگاہ کتاب اور صاحب کتاب کی پرکھ کے لیے میزان کا کام کرتی تھی، ایسی میزان جسے انھوں نے مضبوطی سے تھاما ہوتا۔ مظفر علی سید کے مرتبہ ان کے کالموں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں، ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ''سخن ہائے ناگفتنی'' اور ''سخن در سخن''۔

ان کالموں کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک کردار استاد لاغر مراد آبادی کے نام سے تخلیق کیا، ایسا کردار جو دراصل ان ہی کا ہمزاد تھا مگر انھوں نے نکتہ افروزی کے لیے اسے گویا زبان خلق کا نقارۂ خدا بنا دیا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

☆ ''آج کل کتاب لکھنا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کتاب کی جلد سازی ایک مشکل کام نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد سازی کے پیشے میں ناکام ہونے والے بھی کامیاب مصنف بن جاتے ہیں۔ مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ کتاب کا پڑھنا ہے، اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے ہم نے ایک عرصے سے مطالعۂ کتب کا شغل ترک کر رکھا ہے۔'' (سخن ہائے ناگفتنی)

☆ ''اردو کے عام اخبارات تو اپنے اداریوں اور ادارتی صفحات کی وجہ سے مزاحیہ اخبار سمجھے جاتے ہیں لیکن لندن کے روزنامہ ''جنگ'' کو اپنے ادبی صفحہ کی بنا پر ''اودھ پنچ'' کے مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے۔'' (لوح جہاں پہ حرف مکرر)

☆ ''جس طرح نمک کے بغیر کھانا بے مزہ ہوتا ہے اسی طرح اگر بھائی فاروقی کے کسی انٹرویو میں احمد فراز کا ذکر نہ ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ انٹرویو نہیں پڑھ رہے کشور ناہید کی کوئی نثری نظم پڑھ رہے ہیں۔'' (ایضاً)

☆ ''اپنے متعلق جون ایلیا نے کہا ہے کہ میں ایک ناکام نقاد ہوں۔ گزارش ہے کہ اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے، جہاں اہل نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرتے ہیں، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔'' (شاعری یا معجون شباب آور)

☆ ''بعض کتابیں اگر شائع نہ ہوں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں لیکن بعض ایسی

کتابیں بھی ہوتی ہیں جو شائع ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں۔'' (آپ بیتی یا آپ بیتی کی معذرت)

☆ ''یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اردو ادب کی عزت افزائی کا سبب غزل گو شعراء ہیں یا وہ مقالہ نگار جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کرتے ہیں۔ غزلوں کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں۔ یہ راز نہیں کھلتا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہاں جا رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے دیکھیے تو گمان گزرتا ہے جیسے غزلیں کہی جا رہی ہیں۔'' (بڑا شاعر چھوٹا آدمی)

☆ ''ایک زمانہ تھا کہ مشاعروں میں ایسے شعر پڑھے جاتے تھے جنھیں سن کر چھتیں اڑ جاتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ مشاعرہ سنتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بس زمین شق نہ ہو جائے۔'' (ادبی خانہ خرابیاں)

☆ ''...... اردو کا ہر پانچواں شاعر مزے دار شاعر ہے باقی چار شاعر اس لیے مزے دار نہیں بن سکے کہ وہ بڑے شاعر بن گئے۔ موجودہ دور میں بڑی شاعری تو کہیں نظر نہیں آتی مگر بڑے شاعروں کی بھر مار ہے۔ بڑی شاعری کس کام کی کہ کتابوں میں بند پڑی رہتی ہے لیکن بڑے شاعر کسی فعل میں بند نہیں ہیں۔ وہ مشاعروں کی واہ واہ سمیٹنے سے لے کر پرائڈ آف پرفارمنس حاصل کرنے کی دوڑ میں شریک ہونے تک ہر کام میں آگے آگے رہتے ہیں اور اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ شاعری گردِ راہ کی طرح پیچھے رہ جاتی ہے۔'' (...... عظمت اور شاعرانہ درویشی)

تحریر کی طرح ان کی گفتگو بھی مزے دار ہوتی تھی۔ مزے دار کیا بس یوں سمجھیے کہ فقروں کی پھول جھڑیوں سے آتش بازی کا سماں ہوتا۔

مطالعہ اور حافظہ دو اضافی صفات تھیں۔ خیر پڑھے لکھے تو اور بھی کئی ادیب مل جاتے ہیں مگر اچھی یادداشت کم کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ ایسے ایسے نادر حوالے، ادبی معلومات، شخصیات کے بارے میں قابل ذکر (اور نا قابل ذکر) کوائف۔ الغرض! ان سے گفتگو کسی لائبریری سے گفتگو کے مترادف تھی۔

خواجہ صاحب بہت اچھے فوٹو گرافر بھی تھے، یہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ ان کا کیمرا ہمیشہ ساتھ رہتا، جہاں کہیں کام کا ادیب ملا اس کی تصویریں بنا ڈالیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے سبھی قابل ذکر اہل قلم کی تصویریں انھوں نے اتاری ہوں گی۔ انھیں کلوز اپ بنانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ یہ لکھ رہا ہوں اور یاد آ رہا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر وحید قریشی بھی مشفق خواجہ کی مانند محقق ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست فقرے باز اور فوٹو گرافر بھی ہیں۔

WWW.KITAABISTAN.COM

میں نے کتابوں کے بڑے بڑے عشاق دیکھے ہیں بلکہ ایسے عاشق جو مستعار اور مسروقہ کتاب سے بھی پرہیز نہیں فرماتے مگر مشفق خواجہ اس ضمن میں استثنائی مثال تھے کہ کتاب خریدتے اور ضرورت مندوں کو مفت تقسیم کرتے۔ جس شخص نے ان کا کتب خانہ نہیں دیکھا وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ناظم آباد میں ان کا تین منزلہ مکان کتابوں سے گویا چھلک رہا ہو، کتابیں، مخطوطات، خطوط سب قرینے سے دھرے بلکہ کثیر التصانیف مصنفین کے نام لکھ کر ان کے لیے جداگانہ شیلف مخصوص کر رکھی تھیں۔ اپنے نام کی شیلف دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔

میں ٹرینڈ لائبریرین ہوں مگر میری ذرا سی آبجوہی کا کوئی اور چھور نہیں جبکہ ان کا محیط بے کراں محفوظ و پابند! جب تک مشفق خواجہ کے بہت قریب نہ ہو انھیں سمجھنا آسان نہیں؛ مثلاً طنزیہ کالموں کی بدولت ان کا امیج کچھ ایسا بن گیا تھا گویا وہ کوئی آدم خور قسم کے انسان ہوں۔ دراصل کالم نگاری تو ایک طرح سے دل پشوری کرنے کے مترادف تھی۔ چند فقرے لکھے اور ٹک دل شاد کیا۔ عام تاثر کے برعکس وہ بے حد محبت کرنے والے اور دوسروں کے دکھ درد میں شرکت کرنے والے اور اس سے بڑھ کر دوسرں کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے والے انسان تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ نہ صلے کا لالچ اور نہ شہرت کی تمنا۔ درویشی اور لاتعلقی کے دعوے تو سبھی کرتے ہیں مگر بہت کم ایسے اہل قلم ملیں گے جو اپنے عمل سے اپنے دعووں کی توثیق بھی کرسکتے ہوں مگر مشفق خواجہ نے بے داغ عمل سے صلہ، انعام اور شہرت کو مسترد کر دیا۔ بہت پہلے رائٹرز گلڈ کی جانب سے ان کی ایک کتاب کو انعام ملا تو انھوں نے یہ کہہ کر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ میں صلہ یا انعام کے لیے نہیں لکھتا۔ اس سلسلے میں، میں بھی ایک بات کا گواہ ہوں۔ جب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں، میں نے ایم فل کی کلاس کو پڑھانا شروع کی، نصاب ختم ہونے اور سالانہ امتحان کے بعد تھیسس لکھنے کا مرحلہ آیا تو میں نے انھیں خط لکھ کر بربنائے دوستی ان پر ایم فل کا تھیسس لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر انھوں نے مجھے سختی سے اس کام سے باز رہنے کو کہا، کہ بقول ان کے انھوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ ان پر تحقیقی مقالہ قلم بند کیا جائے۔ جامعات سے وابستہ اساتذہ اس بات کے شاہد ہیں کہ زندہ شخصیات پر ایم اے/ ایم فل کی ڈگری کے حصول کے لیے تحقیقی مقالات کے لیے جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آتا ہے تو ”زندہ“ شخصیات کیسے کیسے دباؤ اور سفارشوں سے خود پر مقالہ لکھوانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ہی طالب علم کو مقالہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں مشفق خواجہ صاحب کے انکار کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خالد احمد نے ماہنامہ ”بیاض“ میں ان کا

WWW.KITAABISTAN.COM

گوشہ شائع کرنے کی بات کی تو اسے بھی انھوں نے منع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کسی بچہ نادان کی مانند شہرت کے کھلونوں کے لیے ہر دم مچلتا نہ رہے لیکن اگر بلا کوشش خود بخود کچھ مل جائے تو انکار بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن مشفق خواجہ شہرت کے معاملے میں انکار کی منزل سر کر چکے تھے۔ اسی لیے عمر قلب مطمئن کے ساتھ بسر کی۔ اب یہ الگ بات کہ قلب مطمئن قلب مریض بھی بن سکتا ہے۔ کھیڈ مقدراں دی!

میری ان کی دوستی کالم، دیباچہ، تبصرہ اور فلیپ کی سطح سے بہت بلند تھی۔ میں ان کے اسلوب کا رسیا تھا اور اچھے فقرے سے حظ اٹھاتا تھا خواہ ہدف میں ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لیے ہمارے تعلقات کی اساس باہمی خلوص اور محبت پر استوار رہی۔ اس ضمن میں ان کا ''جھکاؤ'' اور میرا ''جھکاؤ'' رخنہ اندازی کا باعث نہ بن سکے۔

میں طبعاً مجمع پسند نہیں۔ بھیڑ میں میرے اعصاب کشیدہ ہو جاتے ہیں، دوستوں کا ریوڑ پالنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ گنتی کے چند احباب ہیں اور ان ہی کے ساتھ مل کر خوش ہوتا ہوں۔ کراچی میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور نسیم درانی کے ساتھ ہی زیادہ تر وقت کٹتا ہے۔

کراچی پہنچتے ہی میں انھیں فون کرتا۔

''فرمایئے''

یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔ وہ مجھے کہتے تم نے فلاں دن خالی رکھنا ہے، نہ کسی طرح کی تقریب اور نہ کسی کو وقت دینا۔ وہ گاڑی لے کر آ جاتے۔ ساتھ ان کے ہم زلف ذوالفقار مصطفیٰ۔ ہم سیدھے ساحل سمندر کا رخ کرتے۔ انھیں علم تھا کہ میں سمندر سے کیسے مسحور ہو جاتا ہوں اس لیے اور کہیں جانے کا پروگرام نہ بناتے۔ ہم تمام دن ساحل پر گزارتے۔ کھانا بھی وہیں کھاتے اور پھر رات گئے وہ مجھے گھر پہنچا دیتے۔ میں انھیں لاہور کے ''ٹوٹے'' سنا کر سال بھر کی ادبی ڈائری گوش گزار کرتا۔ وہ مجھے کراچی کے حالات سے باخبر کرتے۔ ہم دونوں ہی کو یہ ایک دن بہت عزیز رہا۔ میرے لیے یہ ایک دن کراچی کے قیام کا حاصل ہوتا، ایک برس میں نہ آ سکا تو انھوں نے خط لکھا کہ تم کراچی نہ آئے تو میرے لیے گویا دسمبر کا مہینہ ہی نہ آیا، دسمبر کا مہینہ اس لیے کہ میرا نیاز و نگار سیمینار کے سلسلہ میں دسمبر میں کراچی آنا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ گیا تو بہت خوش ہوئے اور کہا آپ بہت اچھے موقع پر آئے۔ آج شام کلفٹن میں میری بہن کے ہاں رات کا کھانا ہے اور کراچی کے متعدد اہل قلم آ رہے ہیں، اسی بہانے ان سب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

WWW.KITAABISTAN.COM

وہ شام کو مجھے لینے آئے تو کہنے لگے، ان دنوں کراچی کے حالات بہت خراب ہیں۔ رات کے بارہ ایک بجے کار ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں۔ آپ رات وہیں گزار لیں۔ میں نے سلیپنگ سوٹ اٹھایا اور ان کے ساتھ چل دیا۔

ساحلِ سمندر پر خوب صورت فلیٹ کراچی کے ادیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ محترمہ خدیجہ مستور صاحبہ سے طویل مدت کے بعد وہیں ملاقات ہوئی، قبلہ مشتاق احمد یوسفی، عالی جی اور متعدد دیگر حضرات۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی۔

سب چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے چاندنی میں نہائی سمندر کی لہریں دیکھ رہا تھا۔ یہ عجیب منظر تھا۔ ہم دونوں باہر آ گئے اور دیر تک یوں ہی گھومتے رہے اور پھر ساحل پر جا پہنچے۔ سمندر کی وہ لہریں جو بند کمرے کی کھڑکیوں سے مانند تصویر تھیں۔ اب ہم ان کے شور سے شرابور ہو رہے تھے۔ وقت جیسے تھم گیا اور لمحات منجمد ہو گئے۔ سمندر کے کنارے اس رات ہم کتنی دیر بیٹھے، کیا باتیں ہوئیں، کچھ یاد نہیں لیکن اس رات کا تاثر ہنوز اعصاب میں مدوجزر پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم جب کبھی بھی ملے ہم نے اس رات کو ضرور یاد کیا۔

میں یہ سمجھتا ہوں اور میں نے ان سے ایک مرتبہ اس کا اظہار بھی کیا کہ ان کے پاس جیسی شاندار لائبریری تھی، جتنی اچھی یادداشت تھی، جتنی تخلیقی صلاحیتیں تھیں اور جتنا زیادہ وقت تھا انھوں نے اس سے اتنا فائدہ نہ اٹھایا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے۔ ''کلیات یگانہ'' کی تدوین جیسے اور بھی متعدد کام کیے جا سکتے تھے۔

ان کا جواب یہ تھا کہ مجھے خود کام کرنے کے مقابلے میں اوروں سے کام لینے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ تب انھوں نے متعدد ایسے افراد کے نام گنوائے جو ان سے کتابیں اور کوائف حاصل کر کے ''محقق'' کہلوائے۔ کتنے ان کے فیض سے مقدمہ نگار بن گئے اور کتنے مقالہ نگار۔ ایسے حضرات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

ایک مرتبہ کراچی گیا تو انھوں نے لاہور کے ایک نوجوان سے ملوایا جو کئی ماہ سے ان کے ہاں مقیم تھا اور کتب خانہ اور دسترخوان دونوں سے کماحقہٗ انصاف فرما رہا تھا۔ خود میں نے ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے تھیسس لکھنے والے اپنے کئی طالب علموں کو ان کے پاس بھیجا اور سبھی شاد کام واپس آئے۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ ہر وہ شخص جو کتابوں کا رسیا ہے اور محبت سے لائبریری بناتا ہے اس کے لیے کسی کو کتاب دینا آسان نہیں ہوتا اس لیے کہ ہمارے علم نا آشنا معاشرے میں کتاب واپس نہ کرنا ایک طرح کی شیخی سمجھا جاتا ہے، اس حد تک کہ یاروں نے دوسروں کی کتابوں سے اپنی لائبریری تیار کر لی مگر خواجہ صاحب کا رویہ برعکس تھا۔ کتاب تو خیر یہ بھی نہ دیتے لیکن اس کی فوٹوسٹیٹ فوراً مہیا کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کھانے پینے اور پہننے کے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اخراجات کے مقابلے میں فوٹوسٹیٹ کے اخراجات کہیں زیادہ ہوں گے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ممالک کے سکالران کی لائبریری سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

مشفق خواجہ صحبت ناجنس سے الرجک تھے۔ اسی لیے ادیبوں اور ادیبوں کے اجتماعات، ادبی تقریبات، مشاعروں اور ضیافتوں سے خود کو محفوظ رکھا لیکن جنھیں وہ دوست سمجھتے تھے، جن سے پیار کرتے تھے یا جن کے علم، ذہانت یا شرافت کے قائل تھے ان کے لیے جی جان سے حاضر! وہ مجلسی انسان نہ تھے لیکن جس مجلس میں ہوتے وہاں صرف وہی بولتے کہ علم کی ہنڈیا میں طنز کا بگھار لگانے میں ماہر تھے مگر وہ طنز برائے طنز نگار نہ تھے جیسا کہ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں ان کے بارے میں یہ مصرع پڑھا تھا:

اسے عجب سے ذوق شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

دراصل ان کا طنز ادب سے ان کی کمٹمنٹ کا مظہر تھا۔ وہ ادب اور ادیب کو جس بلند منصب پر دیکھنے کے خواہش مند تھے جب وہ اسے اس سطح سے نیچے گرا دیکھتے تو رہا نہ جاتا۔ ادب ونقد، شعروشاعری اور علم ودانش کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص تصورات تھے۔ لفظ کے بارے میں کیا خوب صورت بات کی:

> ”لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انھیں عزت ملتی ہے اور ذلت بھی۔ کبھی یہ معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلند مدارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں......“ (تاریخ یا ٹلے نویسی)

لفظ تحریر کی اساس بنتا ہے اور تحریر کتاب کی۔ دیکھیے کتاب کے حوالہ سے کیا کہتے ہیں:

> ”کسے معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جن کتابوں کا شائع ہونا نہ ہونا برابر ہے ان کا تو چرچا ہوگا اور جو کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں، ان کے نام سے بھی کسی کو واقفیت نہ ہوگی۔ ایسی ایسی کتابوں کی رونمائیاں ہوتی ہیں جو اگر کسی مہذب معاشرے میں شائع ہوں تو ان کے مصنف منہ چھپاتے پھریں مگر اب زمانہ ہی ایسا ہے کہ منہ چھپانے والے سر اٹھا کر چلتے ہیں کہ انھوں نے کتابیں شائع کر کے اپنا وقت اور پیسہ ضائع کیا۔“ (غالب ناشناسی)

تو ایسا تھا ناوک فگن اور ایسے تھے اس کے اہداف:

اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت خواجہ ادیب نواز کے ساتھ

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مشفق خواجہ (مرحوم) کے ساتھ میری بہت قریبی دوستی تھی لیکن میں اس بات پر فخر کا اظہار کر سکتا ہوں کہ ان سے پہلی ملاقات میں جو تعلق پیدا ہوا، وہ ان کی زندگی کے آخری لمحے تک قائم رہا۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ان کی محبت صرف میرے لیے مخصوص ہے اور وہ پر خلوص اپنائیت کا اظہار صرف مجھ سے کر رہے ہیں۔ ان کی وفات (۲۱۔۲۲ فروری ۲۰۰۵ء) کے بعد جب ان کے خطوط متعدد دوستوں کے نام چھپے تو بے پایاں خوشی ہوئی کہ ان کا فیض محبت ہر دوست کو یکساں طور پر میسر تھا، اور وہ اپنے علم و ادب کے سرچشمے سے ہر شخص کو استفادہ کا موقع فراہم کرتے تھے۔ دوستوں کے ادبی اور علمی منصوبوں میں نہ صرف معاونت کرتے بلکہ اکثر اوقات موضوعات خود تجویز کرتے تو ان کے لیے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کی نقول بھی بھیجتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی رسالہ ’’تخلیقی ادب‘‘ کے لیے غلام عباس پر ایک مقالہ لکھنے کی مجھے دعوت دی تو ان کے ذاتی خطوط کی نقول اور ان کی کمیاب کتاب ’’جاڑے کی چاندنی‘‘ بھی ارسال کر دی۔ ’’جاڑے کی چاندنی‘‘ کا یہ نسخہ وہ تھا جو غلام عباس نے اپنے دستخطوں سے انھیں پیش کیا تھا۔

اب یاد آ رہا ہے کہ میری ان سے پہلی ملاقات ایم اے (اردو) کا نتیجہ نکلنے کے بعد کراچی میں ہوئی تھی کیوں کہ اس امتحان میں اول آنے والے طالب علم کو انجمن ترقی اردو پاکستان ’’بابائے اردو گولڈ میڈل‘‘ اور پانچ سو روپے نقد بطور انعام پیش کرتی تھی۔ میں یہ ’’ایوارڈ‘‘ لینے کے لیے کراچی گیا تو انجمن کے دفتر کی تیسری منزل پر برآمدے کے کونے میں ایک چھوٹے سے کمرے میں جس شخص سے ملاقات ہوئی، وہ مشفق خواجہ تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے اس پہلی ملاقات میں میرا نام لے کر مخاطب کیا اور ’’اوراق‘‘ میں چھپنے والے چند مضامین کا حوالہ دینے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کی خیریت دریافت کی اور اس کے ساتھ ہی ایم اے (اردو) کا پرائیویٹ طالب علم ہونے کے باوجود اول آنے اور ریکارڈ نمبر حاصل کرنے پر مجھے مبارکباد بھی دی (۱)۔ اس دوران چائے آ گئی اور وہ اپنا خود ساز سگریٹ پینے لگے تو ایک بزرگ جنھیں مشفق خواجہ نے ’’صوفی صاحب‘‘ کہہ کر مخاطب کیا تھا، اور چند لمحے قبل ان سے ایک چٹ لے کر زیریں منزل پر چلے گئے تھے، واپس آ گئے اور میز کی دائیں طرف سے کوئی چیز انھیں پکڑا دی۔ خواجہ صاحب نے اسی

بزرگ (۲) کو کہا کہ ساتھ کے کمرے سے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو ان کا سلام کہیں۔ چند منٹوں کے بعد جالبی صاحب تشریف لائے تو میں نے اٹھ کر انھیں سلام کیا۔ اس وقت ان کا دکنی ادب پر غیر معمولی کام ادبی دنیا میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ خواجہ صاحب نے جالبی صاحب سے میرا تعارف کرایا تو یہ بھی کہا کہ:

”انجمن کی طرف سے طلائی تمغا آپ انھیں عطا کریں۔“

یہ عطائیگی غیر رسمی انداز میں انجام کو پہنچی لیکن میری ادبی زندگی میں یہ دن یادگار بن گیا کیوں کہ مجھے ملک کے دو ممتاز ادیبوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا تھا اور اب طلائی تمغہ اضافی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو اس روز کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے۔ میں نے سرگودھا واپس پہنچ کر مشفق خواجہ صاحب کو شکریے کا اور ایک ”غریب شہر“ کی اس قدر پذیرائی کا خط لکھا تو جواب میں مجھے ان کا پہلا ”محبت نامہ“ موصول ہوا۔ پھر تعلقات میں آہستہ آہستہ اتنی وسعت پیدا ہو گئی کہ جب کبھی کراچی جاتا تو بہار کالونی میں اپنی ہمشیرہ زینت کے گھر پر سامان رکھنے کے بعد سب سے پہلے خواجہ صاحب کو ٹیلی فون کرتا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ایک شیریں مہذب آواز آتی ”فرمایئے!“ میں نام بتاتا تو کھل اٹھتے اور فوری ملاقات کا تقاضا کرتے...... اور پھر یہ ہمیشہ کا معمول بن گیا۔

اب میں مشفق خواجہ سے جس ملاقات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اس روز بھی کراچی پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے انھی کو فون کیا تھا۔ آواز سن کر انھوں نے پوچھا:

”لاہور سے بول رہے ہیں؟“

میں نے جواب دیا ”آپ کے شہر سے بول رہا ہوں اور یہاں محترم ذاکر علی خان کی کتاب میں برائے (۳) نام شرکت کے لیے آیا ہوں“ سن کر بولے ”انتظار حسین کی آمد کی اطلاع تو مظفر علی سید نے دی تھی، آپ کا نہیں بتایا۔“

دراصل میرا پروگرام اچانک بن گیا۔ نسیم درانی اور جمیل احمد خان کے دعوت نامے میں صبا اکرام (۴) کا اصرار بھی شامل ہو گیا تو کراچی کے دوستوں سے ملنے کے لیے میرا دل بھی کر آیا۔“

اپنے ہوٹل کا نام بتایا تو بولے ”اس وقت میرے پاس آپ کے ایک دوست (۵) بیٹھے ہیں، جن سے آپ کی ملاقات لاہور میں کبھی نہیں ہوئی۔ ابھی آ جائیں تو ان سے آپ کی ملاقات کراچی میں کرا دی جائے اور یہ منظر ہم بھی دیکھ لیں؟“

اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، موسلا دھار بارش کا امکان بھی تھا۔ پھر جو ''لاہوری'' صاحب، مشفق خواجہ کے پاس بیٹھے تھے، وہ مجھے لاہور میں برداشت نہیں کرتے تھے تو کراچی میں کیسے برداشت کرتے۔ ان کی موجودگی میں خواجہ صاحب سے بے تکلف گفتگو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے بارش کی آڑ لے کر کہا: ''کل صبح حاضر ہوں گا...... دراصل میں نے ذاکر علی خان کی کتاب پر مضمون بھی لکھنا ہے۔''

مشفق خواجہ بولے ''دوپہر کو آپ میرے مہمان ہوں گے، کھانا اکٹھے کھائیں گے۔''

مجھے معلوم تھا کہ خواجہ صاحب اپنے ہر دوست کی ضیافت ہوٹل پر کرتے تھے۔ میں نے گزارش کی ''دعوت شیراز ہو گی اور وہ بھی گھر پر'' خواجہ صاحب نے میری درخواست قبول کر لی۔

مشفق خواجہ مجھ سے عمر میں تو سات آٹھ برس چھوٹے تھے لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمت میں اتنا عرصہ گزار چکے تھے اور تحقیق ادب میں اتنا کام کر چکے تھے کہ میری عمر کے سب لوگ، جن کا مبلغ علم معمولی تھا، انھیں اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ ان کی عظمت یہ تھی کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں کا احترام دل و جان سے کرتے تھے (۶) ڈاکٹر سلیم اختر (۷) اور انور سدید سے یکساں سلوک کرتے تھے۔ طاہر تونسوی (۸) کو رحم کی نظر اور لاغر مراد آبادی (۹) کو قہر کی نظر سے دیکھتے تھے اور خوبی یہ کہ کسی کو ناراض نہ ہونے دیتے تھے۔ انھوں نے معروف شاعر انور شعور (۱۰) کی شاعری کی کتاب پر جو پیش لفظ لکھا تھا، اس پر انور شعور میرے سامنے اش اش کر اٹھا تھا۔ اس نے مشفق خواجہ کو احساس ممنونیت سے جھک کر ''آداب عرض'' کیا لیکن گھر جا کر جب پیش لفظ دوبارہ پڑھا تو ''دروغ برگردنِ راوی''...... انور شعور اپنے آنسو روک نہ سکا اور پھر اس پیش لفظ کو اپنی کتاب میں شامل کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ بہت عرصے کے بعد کسی رسالہ ''فنون'' میں چھپوا دیا۔ لیکن اس وقت تک انور شعور اسے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر چکے تھے۔

مشفق خواجہ محقق تھے، نقاد تھے، شاعر تھے لیکن جب انھوں نے پہلے روزنامہ ''جسارت'' اور پھر ہفت روزہ ''تکبیر'' میں کالم نگاری شروع کی تو صحافت کی اس پامال صنف میں اپنا انوکھا اور منفرد رنگ نکالا۔ انھوں نے مدح کا انداز یوں اختیار کیا کہ اکثر اوقات اس پر قدح غالب نظر آئی لیکن جب خواجہ صاحب ''ممدوح'' کے سامنے تصریح کرتے تو وہ ممنونِ احسان ہوئے بغیر نہ رہتا۔ خواجہ صاحب سمجھاتے ''اپنے دشمنوں کی بات کو ہمیشہ صحیح نہ سمجھا کرو، دشمنوں کا کام ہی لگائی بجھائی ہے۔'' چنانچہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ جس ادیب یا اس کی کتاب پر کالم لکھتے، وہ لوگوں کے سامنے تو ہنستا رہتا لیکن تنہائی میں کالم پڑھ کر رونے لگتا۔ ان کا قلمی نام ''خامہ بگوش'' تھا جس کے بارے میں ممتاز مزاح نگار محمد خالد اختر نے لکھا تھا کہ ''ان کے قلم کا ڈسا پانی نہیں مانگتا

www.KitaboSunnat.com

اور اس سلسلے میں وہ دوست دشمن کا امتیاز روا نہیں رکھتے"۔(۱۱) اور مظفر علی سید نے شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ "وہ دشمنوں کو غیر مستحق سمجھتے ہوئے، ساری نوازشیں دوستوں پر ڈھیر کر دیتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو نظیر صدیقی(۱۲) یا گوپی چند نارنگ(۱۳) سے پوچھ لیجیے اور اتنی دور نہ جا سکیں تو یہ نیاز مند(۱۴) (مظفر علی سید) بھی حاضر ہے۔" (مضائقہ نہ سمجھیں تو ان میں انور سدید کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے)(۱۵) دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ کچھ عرصے تک خواجہ صاحب اپنے کسی سابق ممدوح کو موضوع نہ بناتے تو وہ تقاضا کر کے کالم لکھواتا اور لوگوں کے سامنے ان کی تعریفیں کرتے کرتے نہ تھکتا لیکن جن اعلیٰ ظرف لوگوں کی برداشت جواب دے جاتی وہ خواجہ صاحب پر بے جا چڑھائی کر دیتے۔ اس کی ایک مثال معروف ادیب جناب مظہر امام ہیں جن کا ذکر انھوں نے اپنے اس خط میں کیا ہے جو انھوں نے وفات سے دس روز قبل ۱۰ فروری ۲۰۰۵ء کو مظہر امام صاحب کے نام لکھا۔ (اقتباس)

> "آپ کراچی آئے تو یہاں حالات خاصے مخدوش تھے۔ اکثر کرفیو رہتا تھا...... اس کے باوجود آپ غریب خانے پر تشریف لائے۔ ۱۹۸۵ء میں، میں دہلی گیا تو وہاں بھی آپ بڑی محبت سے ملے تھے، اس کے بعد آپ سے خط و کتابت کا سلسلہ رہا۔ میرے کالموں کی مداحی میں آپ کے کئی خط موصول ہوئے۔ آپ کی فرمائش پر میں نے آپ کے شخصی خاکوں کی کتاب پر جو کالم لکھا تھا، وہ آپ کو اتنا پسند آیا کہ آپ نے مدیر "کتاب نما"(۱۶) سے اصرار کر کے اسے "کتاب نما" میں چھپوایا(۱۷)۔ میری بدقسمتی کہ اس کے بعد جو کالم آپ کے بارے میں لکھا وہ آپ کو پسند نہ آیا(۱۸)۔ آپ مجھ سے اتنے ناراض ہوئے کہ ایک پورا مضمون میری مذمت میں لکھ ڈالا(۱۹) میں اس سے بھی خوش ہوا کہ آپ نے یہ مضمون لکھ کر اس تکلیف کے ازالے کی کوشش کی جو میرے کالم سے آپ کو پہنچی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میرے اس کالم سے اس حد تک چراغ پا ہو جائیں گے تو میں کبھی یہ کالم نہ لکھتا۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ آپ نے مضمون لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی لیکن میرے کالم کے کسی جملے کو غلط ثابت نہ کر سکے۔"

ڈاکٹر شمیم حنفی نے ان کی کتاب "خامہ بگوش کے قلم سے" کو ہمارے عہد کے ادب اور ادبی کلچر کے زوال کی دستاویز قرار دیا اور لکھا کہ "اس میں شامل تحریریں ہمیں اپنے ادبی معاشرے کے موسم، مزاج اور درجۂ

حرارت میں اتار چڑھاؤ کی خبر...... دیتی ہیں...... اور ان تحریروں سے کسی بھی پڑھنے والے کی شخصیت اگر اپنی انا کی قتیل اور اپنی صحبت میں بہت زیادہ خراب نہیں ہوئی تو وہ اپنے بارے میں بھی خامہ بگوش کے فقروں کی داد ضرور دے گا، چاہے وار کتنا ہی کاری کیوں نہ ہو۔ ان تحریروں کے مزاج میں برہمی سے زیادہ جلال کا، مزاح سے زیادہ سنجیدگی کا اور تضحیک سے زیادہ تربیت اور تنبیہ کا پہلو نمایاں ہے۔'' (۴۰)

محترم مظہر امام نے اپنے بارے میں ان کے کالم نوکِ خار کو محسوس کیا تو خواجہ صاحب نے ''عفو خواہی'' میں تاخیر نہ کی لیکن ادبی معاشرے کی ناہمواری کا ذکر بھی کر دیا اور مظہر امام صاحب کو لکھا:

> ''میرے کالم سے آپ کی دل آزاری ہوئی، اس کے لیے میں شرمندہ ہوں اور معذرت خواہ لیکن اس کا کیا کروں کہ مجھے کسی ادیب کی یہ ''ادا'' پسند نہیں آتی کہ ہر وقت دوسروں سے اپنی تعریف میں کچھ لکھوانے کے لیے کوشاں رہے۔ اس کام میں اور گداگری میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ادیب کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ لکھتا رہے اور اچھے برے کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دے۔ اپنے بارے میں مضمون اور کتابیں لکھوانے سے آج تک کوئی بڑا ادیب نہیں بن سکا اور نہ آئندہ بنے گا۔ لہٰذا وہ توانائی جو دوسروں سے تعریفی مضامین لکھوانے میں صرف ہوتی ہے، اسے اپنی تحریروں کو بہتر بنانے پر صرف کرنا چاہیے۔ آپ سے میرے مخلصانہ مراسم تھے، اس لیے میں نے کالم کے ذریعے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ میری غلطی تھی۔ کاش! میں نے یہ غلطی نہ کی ہوتی۔'' (۴۱)

اس اقتباس سے خواجہ صاحب کی کالم نگاری کا اصلاحی مقصد بالکل واضح ہو جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے عہد کے بیشتر ادبائے کرام اپنی ذات کے گنبد میں اسیر ہیں اور صرف صدائے تحسین کی بازگشت سننے کے متمنی ہیں۔ مشفق خواجہ کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی تعریف میں مضمون لکھواتے تھے نہ چھپواتے تھے۔ ان کی تحقیقی کتابیں ''تذکرہ خوش معرکۂ زیبا'' از: سعادت یار خان ناصر، ''اقبال از احمد دین''، ''جائزہ مخطوطاتِ اردو'' اور شاعری کی کتاب ''ابیات'' وغیرہ شائع ہوئیں تو بے شمار اہل قلم نے ان پر مضامین لکھے۔ خواجہ صاحب نے یہ سب مضامین منگوا لیے اور...... پڑھے بغیر ایک تھیلے میں بند کر کے کونے میں ڈال دیئے۔ کسی مضمون کو چھپنے کی اجازت نہ دی۔ میں ایک دفعہ ان کے گھر پر حاضر ہوا تو اس تھیلے کی زیارت کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا۔ معلوم ہوا کہ میرے چند مضامین بھی اس میں بند تھے، جن کی نقل میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے واپس مانگنے کی

WWW.KITABOSUNNAT.COM

جسارت کی تو خواجہ صاحب نے انکار کر دیا۔ ان کے مزاج کا یہ زاویہ مولانا صلاح الدین احمد کی طبع درویشانہ کے مماثل تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی تحسین آمیز مضمون چھپنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں بتائے بغیر ان کی شخصیت پر ''نقوش'' میں مضمون لکھا تو ناراض ہو گئے اور آئندہ اس قسم کے کام سے سختی سے منع کر دیا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے رسالہ ''اوراق'' میں مشفق خواجہ پر گوشہ شائع کیا تھا، اسے انھوں نے میری ''کارستانی'' قرار دیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادب کی تخلیق ان کے نزدیک پیغمبرانہ عمل تھا جو تحسین سے بے نیاز عمل تھا۔ شہرت سے ان کے استغنا کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں اپنی دلی عقیدت کے تحت مالک رام صاحب کی عیادت کے لیے دلی گئے تو بقول ڈاکٹر خلیق انجم ''کسی دوست کو یقین نہیں آیا کہ قطب کی لاٹھ اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے (۲۲)۔'' جب خواجہ صاحب واقعی دلی پہنچ گئے تو ان کی آمد پر دلی کی بیشتر ادبی تنظیموں نے استقبالیہ جلسوں کی تیاری شروع کر دی ......اردو اکادمی دلی کے زیر اہتمام سہ روزہ سیمینار منعقد ہو رہا تھا، سیمینار کے دعوت نامے کے مطابق ۲۷ نومبر کی ایک نشست کی صدارت خواجہ صاحب کو کرنا تھی، اس صدارت سے بچنے کے لیے خواجہ صاحب صبح کو گھر سے غائب ہو گئے اور شام کو واپس آئے (۲۳)۔

اردو دنیا کا یہ واقعہ بھی حیرت انگیز ہے کہ جب خواجہ صاحب نے دلی کے دوستوں کو اپنی محبت کے جذبات کے زبانی اظہار کا موقع نہ دیا تو انھوں نے تحریری اظہار کا راستہ نکال لیا اور ہندوستان میں قیام کے دوران ہی اور ان کی آگہی کے بغیر دو کتابیں شاہد علی خاں کے تعاون سے چھاپ دیں؛ ایک مشفق خواجہ کی اپنی تالیف ''غالب اور صغیر بلگرامی'' کا ہندوستانی ایڈیشن تھا اور دوسری خود خواجہ صاحب پر ان کے ہندوستانی دوستوں کے مقالات پر مشتمل تھی...... ''مشفق خواجہ...... ایک مطالعہ'' کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان اور پاکستان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے اور پہلی بار شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں مقالوں پر مشتمل کتاب پیش کر کے ایک ادیب کا استقبال کیا جا رہا ہے (۲۴)۔''

اس کتاب کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر خلیق انجم، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، شمیم حنفی، مالک رام، یوسف ناظم، شہباز حسین، رشید حسن خان اور ایم حبیب خان شامل ہیں اور کتاب کے آخر میں مشفق خواجہ کی نظم اور نثر کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ مقالہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے مشاہدات کا حاصل ہے اور قاری کے لیے نئی معلومات کا درجہ رکھتا ہے؛ مثلاً ڈاکٹر خلیق انجم بتاتے ہیں:

WWW.KITABOSUNNAT.COM

> ”مشفق خواجہ نے شاعری کے فن میں کسی کی شاگردی نہیں کی اور کسی کو بنظر اصلاح اپنا کلام نہیں دکھایا۔ مشاعرے میں کلام پڑھنا تو دور کی بات ہے، وہ کبھی مشاعرہ سننے بھی نہیں گئے۔ نجی صحبتوں میں بھی اپنا کلام نہیں سناتے (۲۵)۔“

اپنی تحقیق، شاعری اور کالم نگاری کے بارے میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر خلیق انجم کو بتایا (۲۶): ”میں تحقیق کے ذریعے بزرگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاعری کرتا ہوں تاکہ خود اپنی ذات کو سمجھ سکوں اور کالم لکھتا ہوں تاکہ اپنے عہد کے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کے بارے میں سچائیاں بیان کرسکوں۔“

مجتبیٰ حسین (۲۷) نے ان کی ایک ”عادت عامہ“ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ”سگریٹ نوشی کے معاملے میں وہ نہایت کفایت شعار واقع ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صبح میں ایک بار وہ اپنا سگریٹ جلاتے ہیں اور رات تک اسی سگریٹ سے بعد کے سگریٹ جلاتے چلے جاتے ہیں۔ سگریٹ نوشی کے اس انداز سے ماچس کی بچت بہت ہوتی ہے۔“

مشفق خواجہ کی بعض انوکھی عادات کا ذکر آیا ہے تو یہ بتانا بھی مناسب ہے کہ فوٹوگرافی کا شوق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر پر آئے ہوئے مہمان ادیبوں کے عکس اپنے کیمرے سے اتار لیتے اور البم میں محفوظ رکھتے تھے لیکن اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اردو کی کتابیں خرید کر پڑھتے اور رسائل کو سالانہ چندہ باقاعدگی سے بھیجتے تھے۔ کراچی میں ان کا کتب خانہ نجی اور قدیم تصنیفات اور مخطوطات کا شاید سب سے بڑا خزینہ ہے۔ دوستوں کی کتابوں کا پیش لفظ لکھنے میں فیاضی سے کام لیتے لیکن اپنی کتاب پر ”دیباچہ“ لکھنے کی زحمت کسی کو نہیں دیتے تھے۔ میری متعدد کتابوں پر انھوں نے اپنے کالم ”سخن در سخن“ میں ”سخن گسترانہ“ تبصرے لکھے لیکن جب میری گزارش پر ”غالب کے نئے خطوط“ کا سرورق نامہ رقم فرمایا تو اس کا انداز بالکل مختلف تھا اور تحسین اتنی جمالِ مبالغہ آمیز سے لبریز تھی کہ میں اس کا سامنا کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہا۔ میں یہاں اس کے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا:

> ”یہ کتاب (غالب کے نئے خطوط) جو اس وقت آپ کے سامنے ہے، ادبی طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ میں نے ”ادبی طنز و مزاح“ اس لیے کہا ہے کہ اس کتاب کا سارا مواد ادبی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ادبی ڈائری بھی کہا جاسکتا

WWW.KITAABISTAN.COM

> ہے جس میں شگفتہ اور باغ و بہار انداز میں ہم عصر ادب کے بعض پہلوؤں کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے اور اس طرح کہ ادب کی ہی نہیں، ادیبوں کی رفتار کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے...... انور سدید نے اظہار و مطالب کے لیے غالب کے خطوط کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ غالب کے انداز کو اختیار کرنے میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں "ماہرین غالبیات" ان خطوں کو اصلی سمجھ کر غالب پر مزید تحقیق کا آغاز نہ کر دیں۔" ...... مشفق خواجہ...... ۱۸ فروری ۱۹۸۲ء (۲۸)۔

خلیق ابراہیم خلیق کی خودنوشت سوانح عمری کے سرورق کی پشت پر ان کی یہ رائے توجہ کھینچتی اور کتاب پڑھنے پر مائل کرتی ہے:

> "آپ بیتی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نہیں لکھی جاتی کہ صرف اپنا ہی چہرہ نظر آئے۔ اپنے گرد و پیش پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جس معاشرے سے وہ وابستہ ہے، اسے نظر انداز کر کے وہ اپنے آپ سے بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ پوری شخصیت آئینے میں معاشرے کے چوکھٹے میں اجاگر ہوتی ہے۔ ایک اچھی آپ بیتی صرف ذات کی ترجمان نہیں ہوتی، اس معاشرے کی بھی عکاس ہوتی ہے جو فرد کی ذات کی تشکیل و تعمیر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے خلیق ابراہیم خلیق کی زیرِ نظر آپ بیتی ایک مثالی آپ بیتی ہے۔ یہ ایک فرد کی داستانِ حیات ہی نہیں، ایک پورے عہد کی معاشرتی، سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ بھی ہے (۲۹)۔"

مشفق خواجہ کے کردار کا ایک منفرد زاویہ، جو بہت سی نظروں سے اوجھل ہے، یہ ہے کہ وہ ضرورت مند ادیبوں کی مالی ضرورتوں کو اس طرح پورا کرتے رہتے تھے کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ انھوں نے جریدہ "تخلیقی ادب" جاری کیا تو ادیبوں کو مضامین نظم و نثر پر اعزازیہ پیش کرنے کی روایت بھی جاری کی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے مضمون پر انھوں نے چیک پر رقم درج نہیں کی تھی اور فرمایا تھا کہ "رقم خود لکھ لو"...... میں نے چیک واپس کرتے ہوئے گزارش کی کہ "تخلیقی ادب" کی اشاعت ادب کی خدمت ضرور ہے لیکن منافع بخش کاروبار نہیں اور مجھے اپنے مضمون کا اعزازیہ حاصل کرنے کی چنداں خواہش نہیں۔ خواجہ صاحب نے میرے جذبے کو سراہا اور اطلاع دی کہ اس چیک پر ایک ہزار روپے کا اندراج کر کے انھوں نے چیک حیدر آباد کے ایک ضرورت مند ادیب کو بھیج دیا ہے۔ بعد میں ان کا نام صیغۂ راز میں رکھنے کی شرط پر مجھے بتایا کہ یہ چیک ماہنامہ

”نئی قدریں“ کے مدیر اختر انصار اکبر آبادی کو بھیجا گیا تھا۔ سرگودھا کے ایک ادبی صحافی اور کالم نگار کی شادی کراچی میں ہوگئی اور وہ اس عروس البلاد میں منتقل ہو گئے تو خواجہ صاحب نے انھیں پاؤں پر کھڑا کرنے میں زبردست معاونت کی۔ کوئٹہ کے ایک ڈاکٹر نے اپنا سفرنامہ اور لندن سے ساقی فاروقی نے اپنا مجموعۂ کلام اپنے خرچ پر چھپوانے کے لیے انھیں بھیجا تو خواجہ صاحب نے یہ رقوم متذکرہ شخص کے حوالے کر کے انھیں اشاعت کتب کے میدان میں اتار دیا اور کامیابی کے عملی گر بھی سکھائے۔ افسوس کہ وہ مشفق خواجہ کے مزاج کو نہ سمجھ سکے اور خلوص کے معیار سے گر گئے۔ خواجہ صاحب نے انھیں تعلق سے عاق کر دیا۔ اس قسم کی ایک مثال محیط اسمٰعیل صاحب کی ہے۔ انھوں نے حال ہی میں اپنے ایک مضمون ”روٹھ کر آپ نے اچھا نہ کیا“ میں بڑی عالی ظرفی سے اعتراف کیا ہے کہ:

> ”شہر میں جہاں ”نقدی مشاعرہ“ ہوتا خواجہ صاحب ہمارا نام ٹیلی فون پر لکھوا دیتے۔ پھر ہمیں اطلاع دیتے کہ فلاں دن، فلاں وقت، فلاں صاحب سے ملیں اور مشاعرہ پڑھ کر لفافہ حاصل کر لیں ...... ہم تھے تو کم عمر اور غیر معروف شاعر لیکن خواجہ صاحب جہاں بھیجتے بڑا لفافہ ہاتھ میں آتا۔(۳۰)“

مشفق خواجہ سرچشمۂ جود و سخا تھے، ان کا عمل بے غرض تھا۔ وہ ادب کے ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں خوشی محسوس کرتے اور پھٹے ہوئے بادبانوں والی کشتیوں کو ساحل عافیت پر لے آتے۔ بعض منفعت پسند اور خودغرض لوگ ان سے بے جا توقعات باندھ لیتے یا اپنی ناروا اغراض کی تکمیل میں ان کی معاونت طلب کرتے تو خواجہ صاحب انکار کر دیتے لیکن اس انکار کی انھیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی اور متذکرہ قسم کے لوگوں کی ”دشمنی“ کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک شہرت پسند ادیب نے اپنا رسالہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا تو خواجہ صاحب کے وسیلے اور مشتاق احمد یوسفی صاحب کی معاونت سے کسی بنک سے چند لاکھ روپے حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے تو انھوں نے اپنے رسالے میں خواجہ صاحب کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا اور بے سروپا الزامات کا سلسلہ شروع کر دیا جو ان کی وفات کے بعد بھی جاری ہے۔ ایک جریدے نے غیر ادبی رویہ اختیار کیا اور صاحب حیثیت ادیبوں کو بلیک میل کرنے کے لیے ان کے خلاف لکھنا شروع کیا تو اس کی داد خواجہ صاحب سے چاہی۔ انھوں نے جواب دیا: ”کل کلاں آپ اپنے والد صاحب کے خلاف اسی طرح لکھنے لگیں تو کیا مجھ سے داد طلب کریں گے؟“ اس صاف بیانی پر وہ اپنے غلط رویے کی اصلاح کرنے کی بجائے خواجہ صاحب کے خلاف ہو گئے اور ہذیان نویسی کرنے لگے۔ خواجہ صاحب نے ان رسائل کو دیکھنا ہی

www.KitaboSunnat.com

ترک کر دیا اور دروغ نویسی کا اثر قبول ہی نہ کیا۔

۲۱-۲۰ فروری ۲۰۰۵ء کی شب کو یہ غنی مزاج اور استغنا پسند ادیب اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو پوری ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اب ان کی پہلی برسی آ گئی ہے تو سب لوگ انھیں یاد کر رہے ہیں کہ محفل ادب کی تابانی ان کے اٹھ جانے سے کم ہو گئی ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

حواشی

۱۔ اس وقت تک ایم اے اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا ریکارڈ خواجہ محمد زکریا نے قائم کیا تھا، جسے بعد میں وقار انبالوی کی دختر عاصمہ وقار نے توڑا۔ ان سے بھی زیادہ نمبر اگلے برسوں میں زاہد منیر عامر صاحب نے حاصل کیے اور اب شازیہ عنبرین نے ریکارڈ قائم کیا ہے...... میں خارجی (پرائیویٹ) طلبہ میں اول بدرجہ اول آیا اور سب سے زیادہ نمبر حاصل کر کے یونیورسٹی کے طلبہ پر بھی فوقیت حاصل کی۔

۲۔ صوفی عبدالرشید...... بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زمانے سے انجمن میں خدمات انجام دے رہے تھے، مشفق خواجہ کو ان پر بہت اعتماد تھا کہ یہ بابائے اردو کے دور کی نشانی تھے۔ صوفی صاحب انجمن کی کتابیں سائیکل پر رکھ کر شہر کراچی میں تاجرانِ کتب تک پہنچاتے تھے۔ انجمن کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس اہم کام کے لیے آٹو موبائل وین (Van) خریدی جا سکتی اور حکومت نے اسے یہ سہولت فراہم نہیں کی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ وہ اس قسم کی ''کیریر وین'' کے متعدد الزامات؛ مثلاً نجی استعمال، پٹرول فروشی اور لاگ بک میں غلط اندراجات سے محفوظ رہی۔

۳۔ محترم ذاکر علی خان کی کتاب کا نام بھی ''برائے نام'' تھا، حکیم محمد سعید اس تقریب کے صدر اور قومی اسمبلی کے سپیکر سومرو صاحب اس کے مہمانِ خصوصی تھے۔ جمیل الدین عالی صاحب کی تقریر سب سے زیادہ پسند کی گئی تھی۔

۴۔ نسیم درانی اردو کے جلیل القدر رسالہ ''سیپ'' کے مدیر اور جمیل احمد خان ان کے گہرے دوست تھے۔ وہ تقریر کے دھنی اور مجلسی تنقید کے بادشاہ تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ افسوس کہ انھوں نے کوئی کتاب اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ کراچی میں کوئی ادبی تقریب ان کی تہذیبی شخصیت کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

۵۔ ان صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ ادب کے اختلاف پر ذاتی دشمنی شروع کر دیتے اور سچی تنقید برداشت کرنے کی بجائے اپنے مخالف کے خلاف خود ساختہ غلط افواہوں کا بازار گرم کر دیتے۔ ادب کے اختلاف کا جواب غیر ادبی حربوں سے دیتے اور مخالف کو ''ادب بدر'' کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ طبقہ اب بھی معدوم نہیں ہوا۔

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا اردو کے مؤقر، ممتاز اور عہد ساز رسالہ ''اوراق'' کے مدیر اور ادبی دانشور، شاعر، انشائیہ نگار اور نقاد ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی افسانہ نگار، کالم نگار اور شاعر ہیں اور لاہور سے رسالہ ''فنون'' نکالتے ہیں، انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کا آخری جنرل سیکرٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی ایک غیر سنجیدہ تاریخ کے مؤلف اور معروف نقاد ہیں۔ ان کی شہرت کی ایک وجہ ان کی ''انشائیہ دشمنی'' بھی ہے۔ حال ہی میں ان کی آپ بیتی چھپی ہے۔ مشفق خواجہ زندہ ہوتے تو اس کتاب پر ویسا ہی کالم لکھتے جیسا انھوں نے کشور ناہید کی سوانح حیات ''بری عورت کی کتھا'' پر لکھا تھا اور اس کتاب کو مقبول بنا دیا تھا۔

۸۔ طاہر تونسوی محترم ڈاکٹر سلیم اختر کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں وزیر آغا کی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' سے بے دریغ استفادہ کیا اور ان پر ''سرقے'' کا الزام لگ گیا جسے صاف کرنے کی انھوں نے کوشش نہیں کی۔

۹۔ لاغر مراد آبادی کو مشفق خواجہ نے ''سخن در سخن'' میں ایک مزاحیہ کردار کے طور پر متعارف کرایا تھا۔ بعض لوگ اس کو کراچی کے ایک مشہور شاعر کی پیروڈی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ایک فرضی کردار ہے...... چچا چھکن، فوجی اور حاجی بغلول کی طرح۔

۱۰۔ انور شعور کراچی کے مشہور شاعر ہیں، ان دنوں روزنامہ ''جنگ'' میں ''قطعہ'' لکھتے ہیں۔

۱۱۔ بحوالہ ''سخن در سخن''۔ مرتبہ مظفر علی سید، ص ۱۰ (بازیافت، کراچی، اپریل ۲۰۰۴ء) محمد خالد اختر، اعلیٰ پائے کے مزاح نگار تھے۔ ان کی کتاب ''چاکی واڑہ میں وصال'' کی تحسین جناب فیض احمد فیض نے کی تھی۔

۱۲۔ نظیر صدیقی اردو کے معروف نقاد، شاعر اور خطوط نویس تھے۔ مشفق خواجہ نے ان پر سب سے زیادہ کالم لکھے ہیں اور انھیں ہدفِ مزاح بنایا ہے۔ ان کی آپ بیتی ''سو ہے یہ بھی زندگی'' شائع ہوئی تو

WWW.KITABOSUNNAT.COM

مشفق خواجہ (خامہ بگوش) نے لکھا: ''نظیر صدیقی نے اپنی زندگی کا بوجھ اپنے پڑھنے والوں کے سر پر ڈال کر آپ بیتی کے فن کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ کتاب لکھ کر نظیر صدیقی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ پڑھنے والوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے تو کیا ہوا۔ اردو کتابیں پڑھنے والے بے چاروں کی تو ساری زندگی ہی بوجھ ڈھوتے گزرتی ہے۔ (سخن در سخن، ص ۷۳)

نظیر صدیقی پر ہندوستان کی ایک یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا تو مشفق خواجہ (خامہ بگوش) نے اسے نظیر صدیقی کی مقبولیت کی ناقابل تردید دلیل قرار دیا لیکن ان کا اس پر یہ متزاد زیادہ ''لطیف'' ہے:

''ایک زمانہ تھا کہ غالب اور میر پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاتے تھے۔ اب یہ اعزاز نظیر صدیقی کو حاصل ہوا ہے۔ انھیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ پی ایچ ڈی کرنے والوں نے انھیں میر اور غالب کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ میر اور غالب کو بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ اب نظیر صدیقی کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔'' (سخن در سخن، ص ۷۳)

پی ایچ ڈی کے مقالات پر ان کا یہ تبصرہ بھی توجہ کھینچتا ہے:

''ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں بھی شخصیت سازی کو مناسب اہمیت دی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، نظیر صدیقی اور مظہر امام جیسے بڑے ادیبوں کی شخصیات اور ادبی خدمات پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور بزورِ تحقیق خدمات کا سراغ اس طرح لگایا گیا ہے جس طرح بزورِ تفتیش مالِ مسروقہ برآمد کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے درجنوں تحقیقی مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں جن کاموں پر سزا ہو سکتی ہے، انھی کاموں پر بعض پسماندہ ایشیائی ممالک میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی جاتی ہے۔'' (سخن در سخن، ص ۶۲)

۱۳۔ ہندوستان کے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے لیے، جنھیں بعض ہندوستانی ادبا مولانا الطاف حسین حالی کے بعد بھارت کا نظریہ ساز نقاد شمار کرتے ہیں، مشفق خواجہ کے دل میں بڑا نرم گوشہ تھا۔ ان کی رائے میں ''آج اردو دنیا میں نارنگ کا شمار ان معدودے چند ادیبوں میں ہوتا ہے جن کا ادبی ذوق مشرق و مغرب اور جدید و قدیم کی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتا ...... اور اب گزشتہ چند برسوں سے وہ ساختیات اور پس ساختیات کے حوالے سے اردو تنقید کو فکر و نظر کی جن نئی جہتوں سے آشنا کر رہے ہیں، اس نے انھیں ایک رجحان ساز نقاد کی حیثیت عطا کر دی ہے''

......لیکن جب ڈاکٹر شہریار اور ابوالکلام قاسمی کی کتاب ''پروفیسر گوپی چند نارنگ ...... شخصیت اور ادبی خدمات'' شائع ہوئی تو خامہ بگوش کا قلم ''نوازشِ دگر'' پر اتر آیا۔ ایک اقتباس یہ ہے:

''کتاب کی جو چیز سب سے پہلے متاثر کرتی ہے، وہ سرورق پر ڈاکٹر نارنگ کی تصویر ہے کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اردو کے کسی ادیب کے چہرے پر ایسی مردانہ وجاہت اور ایسا عالمانہ وقار بیک وقت شاید ہی نظر آئے۔ شاید یہ تصویر دہلی کے اسی مصور نے بنائی ہے، جس سے کسی نے پوچھا تھا: ''آپ جب کسی مرد کا پورٹریٹ بناتے ہیں تو اس میں بے مثال مردانہ وجاہت پائی جاتی ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟'' مصور نے جواب دیا تھا: ''میں مردوں کا پورٹریٹ شیونگ برش سے بناتا ہوں۔'' (''سخن در سخن''، ص ۶۲)

۱۴۔ مظفر علی سید اردو کے ممتاز نقاد تھے، خامہ بگوش کے کالموں کا انتخاب انھوں نے ہی کیا اور یہ ''سخن ہائے ناگفتنی''، ''سخن در سخن'' اور ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے عنوانات سے مشفق خواجہ کی زندگی میں شائع کیے۔ مظفر علی سید کے بارے میں ان کی رائے ان کے مزاج کے مطابق تھی اور وہ ان کی تنقید ہی نہیں دیباچہ نویسی کے مداح بھی تھے۔ انھوں نے اپنے کالموں میں مظفر علی سید کو محتاط انداز میں مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ ایک اقتباس یہ ہے:

''مظفر علی سید ذرا مختلف قسم کے نقاد ہیں۔ وہ تالیف قلوب کے لیے تنقید نہیں لکھتے بلکہ اس کے برعکس نتیجہ حاصل کرنے کے لیے سرگرم وادیٔ قرطاس و قلم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے خوش رہنے والوں کی تعداد دو سے زیادہ نہیں۔ ان دو میں سے ایک تو سید صاحب خود ہیں اور دوسرے ہم ...... ہماری خوشی کا سبب یہ ہے کہ سید صاحب نے ازراہ کرم ہمارے کالموں کا جو انتخاب (خامہ بگوش کے قلم سے) مرتب فرمایا ہے۔ اس پر کوئی دیباچہ نہیں لکھا۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ پہلی کتاب ہے جس کے شروع میں دیباچے کے نام پر تین حرف بھی نہیں ہیں۔ اگر سید صاحب، تین حرف لکھ یا بھیج دیتے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ اس لائق تو خیر ہم اب بھی نہیں ہیں لیکن اس کی وجوہ دوسری ہیں۔'' (حوالہ ایضاً ص ۱۵۰)

۱۵۔ ''سخن در سخن'' سے ایک اقتباس جو اس ناچیز انور سدید کے بارے میں ہے:

''خوشی کی بات ہے کہ محکمہ آبپاشی کا ایک گم نام کارکن آج محکمہ نمک پاشی میں ملک گیر شہرت رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ خوشی ہمیں اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے ڈاکٹر انور سدید کی بے پناہ

WWW.KITABOSUNNAT.COM

عقیدت ہے۔ یہ عقیدت ایسی ہی ہے جیسی انعام اللہخان یقین کو حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے تھی اور جس کا اظہار یقین نے اس شعر میں کیا ہے:

"سایہ بے شخص نہیں رہتا ہے، کہتا ہے یقیں آپ سے مجھ کو جدا حضرتِ مظہر نہ کرو"

(سخن در سخن، ص ۲۳۱، اکادمی بازیافت، کراچی ۲۰۰۴ء)

۱۶۔ "کتاب نما" کے مدیر شاہد علی خان ایک ادب پسند اور ادیب نواز شخصیت ہیں۔ دوستوں کے ارشادات کی تعمیل میں تامل نہیں کرتے۔ ادیبوں کی خوشنودی حاصل کرنا ان کا مطمح حیات محسوس ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ نے ان کے بارے میں "سخن در سخن" میں سخن گسترانہ لکھا ہے:

"مکتبہ جامعہ دہلی کے شاہد علی خان اردو کے بڑے ناشرین میں سے ہیں اور ہندوستان میں تو ان جیسا کوئی دوسرا نہیں جسے اردو کی بے شمار کتابیں شائع کرنے کا تجربہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اچھی کتاب وہ فوراً چھاپتے ہیں اور خراب کتاب فوراً سے پیشتر۔ اس کا ہمیں ذاتی تجربہ ہے کہ ہمارے کالموں کا انتخاب انھوں نے آناً فاناً چھاپا تھا، جیسے کتاب نہ ہو، آفت ناگہانی ہو۔" (سخن در سخن، ص ۶۱، ادبی لنکا کے باون گزے)۔

(۱۷) مظہر امام کے شخصی خاکوں کی کتاب کا نام "اکثر یاد آتے ہیں" ہے۔ مشفق خواجہ نے اس کتاب پر کالم "دشت ادب کی سیاحی یا سیاہی" لکھا تھا۔ (سخن در سخن، ص ۹۵)۔ اس کالم سے ایک اقتباس: "ان (مظہر امام) کی شاعری کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک رسالے میں یگانہ اور عزیز لکھنوی کی ہم طرح غزلیں چھپی تھیں۔ ان میں سے بہترین اشعار لے کر انھوں نے ایک غزل "بنائی" اور اپنے نام سے چھپوا دی۔" (حوالہ ایضاً، ص ۹۸)

(۱۸) مظہر امام کے نام مشاہیر کے خطوط پر مبنی اس کتاب کا عنوان "نصف ملاقات" ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر امام اعظم صاحب ہیں۔ اس کالم کا ایک اقتباس:

"کچھ دن پہلے انھیں (مظہر امام کو) ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا ہے جو ہندوستان کا ایک بڑا ادبی اعزاز ہے۔ ہم مظہر امام کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی محنت ضائع نہیں ہوئی۔ ورنہ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام حاصل کرنے کی تگ و دو میں خود ادیب ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ (ص ۱۰۰، سخن در سخن۔ کالم: حاشیہ نویسی یا حاشیہ برداری)۔

WWW.KITAABISTAN.COM

(۱۹) یہ مضمون مظہر امام صاحب کی کتاب ''تنقید نما'' میں مشفق خواجہ عرف ''خامہ بگوش'' کے عنوان سے شامل ہے۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد اس مضمون کو ان کے ایک مخالف محقق نے اختلاف رائے کا بدلہ لینے کے لیے متعدد رسائل میں چھپوایا اور اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنے کی کوشش کی۔ افسوس یہ ہے کہ مشفق خواجہ کے اس ''کرم فرما'' کو بھی زیادہ زندگی نصیب نہ ہوئی اور اگست ۲۰۰۵ء میں انتقال فرما گئے۔ (رہے نام اللہ کا)۔

(۲۰) ڈاکٹر شمیم حنفی کی یہ رائے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' مرتبہ مظفر علی سید کے سرورق پر شائع ہوئی ہے۔ شمیم حنفی اردو ادب کے نامور نقاد، تجزیہ نگار اور دانشور ہیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اردو زبان و ادب کی تدریس کی اعلیٰ خدمات انجام دیں اور رسالہ ''جامعہ'' کی ادارت کی۔

(۲۱) رسالہ ''روشنائی''، شمارہ ۲۳۔ ۲۴۔ صفحہ ۳۸۔ کراچی اکتوبر ۲۰۰۵ء، ''روشنائی'' کے مدیر احمد زین الدین ہیں۔ ان کے افسانوں کی کتاب ''دریچے میں بجی حیرانی'' اور تنقید کی کتاب ''رنگ آشنائی'' چھپ چکی ہے۔

(۲۲) ڈاکٹر خلیق انجم ''مشفق خواجہ ایک مطالعہ'' ص ۵۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' جامعہ نگر، دہلی ۲۵۔ دسمبر ۱۹۸۵ء۔

(۲۳) ڈاکٹر خلیق انجم، حوالہ ایضاً، ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے عظیم محقق، نقاد اور دانشور ہیں۔ ہندوستان میں اردو کو زندہ رکھنے میں ان کی مساعی بے مثل ہیں۔ وہ بے شمار کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ ان دنوں انجمن ترقی اردو ہند کے مدار المہام ہیں۔

(۲۴) حوالہ ایضاً۔

(۲۵) ڈاکٹر خلیق انجم ''ذکر خیر مشفق خواجہ کا'' حوالہ ایضاً ص ۱۵۔

(۲۶) حوالہ ایضاً۔ ص ۱۶

(۲۷) مجتبیٰ حسین، حوالہ ایضاً ص ۲۳۔ مجتبیٰ حسین اردو کے ممتاز مزاح نگار ہیں۔ کالم نگاری میں انھوں نے اپنے بھائی ابراہیم جلیس سے الگ انداز پیدا کیا۔ وہ ان دنوں حیدر آباد دکن میں قیام پذیر ہیں لیکن شگفتہ نگاری کی بہار قائم رکھی ہوئی ہے۔

(۲۸) مشفق خواجہ ''غالب کے نئے خطوط'' مکتبہ اردو زبان، سرگودھا ۱۹۸۲ء۔

(۲۹) مشفق خواجہ کی یہ رائے ''خلیق ابراہیم خلیق کی آپ بیتی ...... ''منزلیں گرد کی مانند'' ...... کے فلیپ

پر چھپی ہے۔ خلیق صاحب بنیادی طور پر ادب کے آدمی تھے لیکن ان کی زندگی غیر تجارتی دستاویزی فلمیں بنانے میں گزری۔ وہ نظریاتی طور پر مارکسی نظریات کے انسان تھے لیکن انھوں نے ادیبوں کی سیاست، گروہ بندی اور شہرت کے حصول میں کبھی دلچسپی نہ لی اور سینکڑوں انسانوں کے قلوب میں اپنے مخلصانہ عمل سے جگہ بنالی۔ مجھے ترقی پسند تحریک کی باقیات میں ان جیسا کوئی ادیب لاہور میں نظر نہیں آتا، جو موجود ہیں وہ مادی زندگی بسر کر رہے ہیں اور دولت و شہرت کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ناکامی اور ادبی موت کے صدمے بھی سہہ رہے ہیں۔

(۳۰) محیط اسمٰعیل، ماہنامہ اظہار، ستمبر اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۵۵، محیط اسمٰعیل لاہور کے ایک معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے نوکیلے خاکوں سے بھی نام پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ''کراچی میں ہمیں خواجہ صاحب نے ضائع نہیں ہونے دیا...... ''خواجہ صاحب نے ہماری شعری تربیت از سرِ نو مومن سے کی ...... شعر پر ان کی نظر گویا لیزر شعاعوں کا گزرنا ہوتا۔ پہلے جرح کرتے، پھر جراحی کرتے۔'' ڈاکٹر اسلم فرخی اور ڈاکٹر محمد رضا کاظمی کے مضامین کے بعد مشفق خواجہ پر محیط اسمٰعیل نے بہت اچھا تاثر نامہ لکھا ہے۔

(یہ مضمون مشفق خواجہ مرحوم کی پہلی برسی پر لکھا گیا)۔

☆ حافظ صفوان محمد چوہان

غروبِ آفتاب

سوموار ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء رات ساڑھے دس بجے اطلاع ملی کہ انکل مشفق خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرا ان سے تعلق میرے والد مرحوم پروفیسر عابد صدیق صاحب کی وجہ سے تھا۔ میرا ادب سے کوئی علاقہ نہیں لیکن دل میں انکل خواجہ صاحب سے متعلق محبت بھری یادوں کا ایک ہجوم ہے جسے میں نے ایک نشست میں کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ گزارش ہے کہ اس مضمون کو اسی تناظر میں پڑھا جائے۔ مشفق خواجہ صاحب ادبی نفسا نفسی کے اس دور میں سب اہل ادب کا مشترکہ سرمایہ تھے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ غم کا یہ بیان شگفتہ رہے اور سوگواروں کو مزید سوگوار نہ کرے۔ (مصنف)

انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی تدفین کے موقع پر اس کے مشیر خاص لاڈ ایشر کے منہ سے دو جملے نکلے تھے جو یادگار ہو گئے اور بعد ازاں The Passing of the Old Guard کے عنوان سے شائع ہوئے۔ وہ جملے یہ تھے:

> ***"There never was such a break-up. All the old buoys which have marked the channel of our lives seem to have been swept away."***

مشفق خواجہ صاحب کی وفات کی خبر سنتے ہی لارڈ ایشر کے یہ جملے مجھے یاد آ گئے۔ ایک ایسا ہی نقصان آج ہوا تھا۔

مشفق خواجہ صاحب چلے گئے۔ اگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ جانے والا آزمائش سے نکل گیا اور جو ابھی زندہ ہیں وہ مستقل آزمائش میں ہیں۔

ان کی وفات پر کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے، میں اس میں بے بس ہوں۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں، اسے اندر کی کوئی قوت لکھوا رہی ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کا ایک شعر ہے:

جذبے کی کوئی شکل بنانی ہی پڑے گی
سونے میں مجھے کھوٹ ملانی ہی پڑے گی

☆ ڈویژنل انجینئر/سینئر لیکچرار (کمپیوٹر اینڈ ڈیٹا سروسز)، مینجر ڈیٹا نیٹ ورک، ٹیلی کمیونیکیشن سٹاف کالج، ہری پور۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

شبیہ جذبات کو قلم کے کیمرے سے الفاظ کی تصویر میں کاغذ پر منتقل کرنے کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ قربان ہوتا ہے وہی اصل ہوتا ہے یعنی احساس کی حرارت......اور جو کچھ بچ رہتا ہے، وہ محض الفاظ ہوتے ہیں جو کاغذ پر منتقل ہو جاتے ہیں۔

میں مشفق خواجہ صاحب سے صرف تین بار ملا ہوں، دو بار کراچی میں ان کے گھر واقع ناظم آباد اور ایک بار اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے مہمان خانے میں۔ اس کے علاوہ تقریباً چار برس تک ہر ہفتے ایک یا دو بار ٹیلی فون پر گفتگو کی ہے۔ چند خطوط لکھے ہیں اور کچھ کتابیں اور متفرق چیزیں مختلف موقعوں پر ان کی خدمت میں ارسال کی ہیں اور بس۔ میرا یہ مضمون انہی ملاقاتوں اور ٹیلی فون پر کی گئی باتوں کی روداد ہے۔ میں نے واوین کے اندر ان کے صرف وہی جملے لکھے ہیں جن کے بارے میں مجھے غالب گمان ہے کہ یہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہیں۔ واوین کے علاوہ جو کچھ ان کے حوالے سے لکھا ہے وہ نفس مضمون کی حد تک تو ان کا ہے لیکن الفاظ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

* * *

میرے والد پروفیسر عابد صدیقی صاحب ۱۸ دسمبر ۲۰۰۰ء کو فوت ہوئے۔ ابو جان ایک حدیث پاک کے حوالے سے فرمایا کرتے تھے کہ والد کے بعد اس کے دوستوں اور تعلق والوں سے میل ملاقات رکھنا بہت ہی سعادت مندی ہے۔ میں نے ان کی وفات کے بعد اس بات کو الحمد للہ وصیت کے طور پر عمل میں لانے کی مقدور بھر، شعوری کوشش کی اور ابو جان کے کئی احباب سے فون اور خط کے ذریعے رابطہ رکھا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب سے رابطے کی تقریب بھی یہی ہوئی۔ ابو جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد مجھے ایک بیماری کی وجہ سے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ آغا خان ہسپتال کراچی جانا پڑا۔ کراچی میں ابو جان کے ان احباب سے ملا جن کا مجھے علم تھا۔ ابو سعادت جلیلی صاحب سے ملا۔ پروفیسر مولانا عبد الشہید نعمانی صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے والد محدث شہیر حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے میرے ابو جان کو علم حدیث میں کتاب الآثار لامام محمدؒ کی روایت کی اجازت عطا کی تھی۔ مشفق خواجہ صاحب سے پہلی بالمواجہ ملاقات بھی کراچی کے اسی سفر میں ہوئی اور پھر محبت اور نیاز مندی کا یہ پیہم سلسلہ ان کی وفات پر ختم ہوا۔

میں کراچی میں اپنے دو دوستوں سلمان سعد خان اور وسیم شاہد خواجہ کے ہمراہ انکل مشفق خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم لوگ ایک تنگ اور نیم تاریک زینے سے ہوتے ہوئے اوپر ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سلام و جواب کے بعد انھوں نے فرمایا کہ بیماری سے حال ہی میں صحت یاب

ہوئے ہیں اور اس لیے ہمیں لینے کے لیے نیچے نہیں آ سکتے ہیں۔ اس کمرے میں بمشکل صرف کھڑے ہونے کی جگہ تھی کیوں کہ ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں تو تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ پاؤں دھرنے کی کہیے۔ پھر ہمیں لے کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے جہاں ایک صوفہ سیٹ تھا اور ایک میز۔ میں نے اپنا اور اپنے دوستوں کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ "آپ کو دیکھتے ہیں مجھے عابد صدیق صاحب یاد آ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ عابد صاحب جوانی میں مل رہے ہیں۔" پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ "آپ سے مجھے عابد صدیق کی خوشبو آ رہی ہے۔ واہ وا۔ کیا کہنے! ڈاڑھی بھی بالکل ویسی ہی ہے لیکن سیاہ۔ آپ کے ابا کی ڈاڑھی تو بھورے رنگ کی تھی۔"

ہمیں بٹھا کر وہ چند منٹ کے لیے کمرے سے باہر نکلے۔ اس دوران ہم تینوں دوست کمرے میں موجود کتابوں کو دیکھتے رہے اور اس پگڈنڈی کو جس سے گزر کر ہم صوفوں تک پہنچائے گئے تھے۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کمر کمر تک کتابیں چنی ہوئی تھی۔ اور ان سے ٹکرائے بغیر گزرنا ایسے ہی تھا جیسا کہ دنیا میں اہل ایمان کا زندگی گزارنا۔

اس کمرے میں تین بڑی بڑی الماریاں تھیں جن میں بھی کتابیں ہی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان الماریوں کے باہر بھی ہر جگہ کتابیں ہی تھیں۔ بائیں طرف سامنے اردو لغت بورڈ کراچی کی "اردو لغت ..... تاریخی اصول پر" رکھی ہوئی تھی جس کی اس وقت تک اٹھارہ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ ساتھ کے خانوں میں اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کا سیٹ رکھا تھا۔ چونکہ یہ دونوں کتب میرے پاس ہری پور میں بھی موجود ہیں اس لیے ان سے متعلق باتیں شروع ہو گئیں۔ کہ یہ بہت عظیم کام ہیں جو اردو زبان میں ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں ان شاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں موجود کتابوں کا جائزہ لینے پر کھلا کہ ان میں زیادہ تر لغات ہیں۔ وہ لغات جن کے میں نے صرف نام سن رکھے تھے، آج پہلی بار آنکھوں کے سامنے تھے۔ Reader's Digest کی Reverse Dictionary (لغت معکوس) بھی میں نے صرف یہیں دیکھی۔ Platts کے لغت کا پہلا ایڈیشن، جامع اللغات، فرہنگ آنند راج، محاورات ہند، قاموس الالفاظ، احسان دانش کے لغات، وغیرہ وغیرہ۔

انکل کے کمرے میں واپس آنے پر میں نے عرض کیا کہ میں اب تک تو یہ سمجھتا تھا کہ کسی کی ذخیرۂ کتب میں سب سے زیادہ لغات میرے پاس ہیں کیوں کہ میرے پاس ستر سے زیادہ لغات موجود ہیں لیکن

آپ کے پاس تو مجھ سے بھی زیادہ لغات ہیں۔ انھوں نے میری طرف حیرانی سے دیکھا اور پھر کہا ”میرے پاس ساڑھے چار سو سے زیادہ لغات ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے پاس بھی لغات اتنی کثیر تعداد میں ہیں۔ لغات کے شوقین کے لیے انگریزی میں ایک اصطلاح ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟“ میرا نفی میں جواب سن کر انھوں نے فرمایا کہ ”لغات جمع کرنے کے شوقین کو انگریزی میں lexicomaniac[1] کہتے ہیں، اور اس شوق کو lexicomania[2] کہتے ہیں۔“ پھر دیر تک میرے اس شوق کی تحسین فرماتے رہے۔

لغات سے متعلق باتیں کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ وہ کتاب جو چھپتے ہی متروک ہو جاتی ہے، وہ لغت ہے۔ میرے بتانے پر کہ میرے پاس بھی اردو لغت بورڈ کراچی کے اردو لغت کا سیٹ موجود ہے، وہ اس لغت سے متعلق کی جانے والی کاوشوں کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بہت اچھی محنت ہے تاہم اس میں کئی کمیاں ہیں۔ پھر اس لغت اور اس کے اندراجات کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دو چیزوں کی کمی تو میرے علم میں بھی ہے۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے عرض کیا کہ اگر طباعت کی اغلاط سے صرف نظر کر لیا جائے تب بھی جو بات مجھے سب سے زیادہ حیران کن بلکہ تکلیف دہ لگی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسے الفاظ کا سرے سے اندراج ہی نہیں ہے جو فیروز اللغات وغیرہ جیسے اردو لغات تک میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جس جگہ پر سند کے لیے علامہ اقبال کا شعر ہونا چاہیے، وہاں اکثر کسی غیر معروف شاعر کا شعر درج کیا گیا ہے۔ انکل نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا کہ ”یہ بات صرف وہی کہہ سکتا ہے، جس نے اس لغت کا بہت زیادہ مطالعہ کیا ہو۔ ماشاءاللہ!“

وہ بڑے اشتیاق سے میرے پاس موجود لغات کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور میں بتاتا رہا۔ ان کے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا میرے پاس کوئی نایاب لغت بھی ہے، میں نے عرض کیا کہ میرے پاس ۱۸۱۱ء میں چھپا ہوا کیپٹن گروس (Captain Grose) کا ڈکشنری آف دی ولگر ٹنگ (Dictionary of the Vulgar Tongue) ہے۔ چونکہ اس سے پہلے کا کوئی لغت میرے پاس نہیں ہے لہٰذا شاید یہ نادر چیز ہو۔ انھوں نے نہایت تعجب سے پوچھا کہ آپ کے پاس یہ لغت کہاں سے آیا۔ عرض کیا کہ یہ لغت میں نے انٹرنیٹ سے بہت تلاش کر کے نکالا (download) ہے اور مہینوں محنت کر کے اس کی تشکیل اور نوک پلک سنواری ہے۔ ڈاکٹر مظہر محمود قریشی صاحب (سابق سیکرٹری جنرل پاکستان اکادمی آف سائنسز) نے اس کی

---

[1] بمعنی مجذوبِ فرہنگ۔

[2] بمعنی جنونِ فرہنگ

تصحیح کرائی ہے اور اب یہ مکمل اور درست حالت میں میرے پاس موجود ہے اور میرے علم میں اس کی دنیا میں صرف دو ہی کاپیاں ہیں جن میں سے ایک میرے پاس ہے اور دوسری ڈاکٹر قریشی صاحب کے فرزند دلبند حضرت مولانا محمد احسن سعید قریشی صاحب کے پاس۔ وہ ایک نادر چیز کی موجودگی کا علم ہونے پر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ لغت جب چھپا تھا اس وقت بھی نایاب تھا۔ پھر انھوں نے مجھ سے یہ لغت بھیجنے کا وعدہ لیا اور جب میں نے ہری پور واپس جا کر کمپیوٹر سے نیا پرنٹ لے کر اور نہایت اعلیٰ جلد کروا کے یہ لغت انھیں بھیجا تو بے حد شکریہ ادا کرتے رہے۔ گو اس لغت کا ذکر بعد کے دنوں میں کبھی نہیں ہوا۔ (یاد رہے کہ ڈاکٹر ایم ایم قریشی پاکستان کے دو ڈاکٹرز آف سائنس میں سے ایک ہیں؛ دوسرے آنجہانی ڈاکٹر عبدالسلام تھے۔ انھوں نے دنیائے اسلام میں قمری کیلنڈر کے نفاذ اور رویتِ ہلال کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔)

ہم لوگ انکل کے گھر مغرب کی نماز کے بعد گئے تھے۔ انھوں نے چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی۔ ان کے ٹیلی فون سیٹ پرانے اور خراب ہو چکے تھے اور محکمہ ٹیلی فون کی کارکردگی (اور ان کے الفاظ میں 'کارنا کردگی') سے بہت نالاں تھے۔ ہم ٹیلی فون کے افسران کے سامنے انھوں نے کلمۂ حق کہا۔ میں نے سلمان سعد صاحب سے ان کے سامنے ہی درخواست کی کہ انکل کے ٹیلی فون تبدیل اور درست ہونے چاہئیں۔ الحمد للہ چند یوم میں ان کی شکایات رفع ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد ان کے ی دیو کلفٹن والے گھر کا ٹیلی فون بھی تبدیل کرایا۔ اس ٹیلی فون والے کام پر وہ تا زندگی شکر گزار رہے اور میرے ان دونوں احباب کا ذکر خیر فرماتے رہے۔ چند دن بعد انھوں نے سی ایل آئی (CLI) کے اجراء کا کہا۔ یہ کام بھی ہو گیا تو ایک دو روز کے بعد مزاحاً فرمایا کہ سی ایل آئی (CLI) میں نمبر تو آ جاتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ نمبر کس کا ہے۔ میں کس کس کا نمبر یاد رکھوں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ نمبر کے ساتھ ٹیلی فون کرنے والے کی تصویر بھی آ جایا کرے؟؟" عرض کیا کہ شاعری کے طوامیر میں تو پردہ نشینوں کے صرف ناموں کا ذکر آتا ہے، تصویر کا ذکر تو تصویرِ بتاں کے حوالے سے برنگِ دیگر آیا ہے۔ اس بات پر وہ بہت خوش ہوتے رہے۔

میرے دوست وسیم خواجہ صاحب کے پردادا منشی عبدالرزاق مرحوم بھی شاعر تھے اور انھوں نے شیدا کا تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کا تعلق غیر منقسم ہندوستان کی ریاست ریوا سے تھا جو اس وقت سفید شیروں کے لیے مشہور تھی۔ ان کے غیر مطبوعہ دیوان وسیم صاحب کے پاس موجود ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے ان سے فرمایا کہ وہ اگر چاہیں تو یہ دیوان ان کو دکھا دیں تا کہ ان کی اشاعت کا بندوبست کیا جا سکے۔ افسوس کے سدا کے ست الوجود وسیم خواجہ اپنی کاہلی کی وجہ سے یہ دیوان ان تک نہ لے جا سکے اور یوں یہ کام نہ ہو سکا۔

واپسی کی اجازت لینے سے قبل میں نے آٹوگراف لینے کے لیے اپنا البم کھولا۔ انھوں نے نہایت محبت سے یہ جملے تحریر کر کے نیچے دستخط فرما دیے:

> ”حافظ صفوان صاحب سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ یہ میرے کرم فرما اور دوست جناب عابد صدیق کی یادگار ہیں۔ مرحوم کی نیکیاں حافظ صفوان صاحب کی وجہ سے مجسم صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ خدا انھیں صحت مند و توانا رکھے اور یہ تادیر سلامت رہیں۔“

پھر فرمایا ”میرے پاس آپ کے ابا کی تصویریں بھی ہیں جو میں نے خود بنائی ہیں۔ میرا ایک بار بہاولپور جانا ہوا تو ان کے ساتھ قلعہ دراوڑ دیکھنے کو گیا تھا۔ ہمارے ہمراہ مرحوم پروفیسر سید سعید صاحب بھی تھے۔“ اتنے میں ناصر صاحب تصویریں لے آئے جنھیں دکھاتے ہوئے انکل ابو جان کی کئی باتیں اور واقعات سناتے رہے جو اس سفر میں پیش آئے تھے فرمایا کہ وہ بہت محبت کرنے والے، کھل کر قہقہہ لگانے والے، محنت شاقہ کے عادی، انتہائی معصوم اور بناوٹ سے بالکل پاک آدمی تھے۔ پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے فرمایا ”بھئی مولانا! آپ کی تو آنکھیں بھی اپنے ابا سے ملتی ہیں۔ ان کی آنکھیں نیلی تھیں۔ کیا خوب صورت آنکھیں تھیں مرحوم عابد صدیق صاحب کی۔“ اس کے بعد قریب میں کھڑے ناصر صاحب سے اپنی کتاب ”خامہ بگوش کے قلم سے“ لانے کو کہا۔ وہ لے کر آئے تو اس کے پہلے صفحے پر ’حافظ صفوان صاحب کی نذر/ پہلی ملاقات کی یادگار/ مشفق خواجہ‘ لکھا۔ پھر فرماتے ہوئے کہ ارے! یہ تو خامہ بگوش کے کالم ہیں، مشفق خواجہ کاٹ کر خامہ بگوش لکھا، اور نیچے ۷/۶/۲۰۰۳ء کی تاریخ ڈال کر کتاب مجھے عنایت فرما دی۔

اس موقع پر میں نے بھی اپنی کتاب، مؤسسِ تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا انگریزی میں ترجمہ "Words & Reflections of Molana Ilyas" پیش کی اور عرض کیا کہ اس کا پہلا ڈرافٹ ابو جان نے انتہائی عرق ریزی سے درست کیا تھا۔ افسوس کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ وہ اس کتاب کے حوالے سے اور میرے ذوق کی رعایت سے، کبھی کبھی تبلیغی جماعت کے بارے میں بھی باتیں کیا کرتے تھے۔ شاید کسی وقت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۶۵ء) کی ایک تقریر کے سننے کا ذکر بھی کیا تھا۔

☆

ٹیلی فون پر مشفق خواجہ صاحب سے گفتگو میں، میں نے بہت سے لوگوں کا ذکر سنا۔ وہ نہایت محبت سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا ذکر کرتے تھے اور انجمن کے انگریزی۔ اردو لغت کے بارے میں

WWW.KITABOSUNNAT.COM

انھوں نے کئی بار بڑی معلومات افزا باتیں بتائیں۔ ایک بار بتایا کہ night-blindness (شب کوری) کے لیے رتوندا [رات + اندھا] کا لفظ لغت میں موجود تھا، جب کہ colour-blindness کے لیے لغت میں کوئی لفظ نہ تھا۔ بابائے اردو نے اسی ترتیب پر اس کے لیے ایک نیا لفظ رنگوندا [رنگ + اندھا] بنایا اور اسے اپنے لغت میں درج کیا۔ اس لفظ کا ذکر تو بابائے اردو نے انجمن کے مذکورۂ بالا لغت کی اشاعت اول (۱۹۳۷ء) کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ وہ بابائے اردو کے مقدمات میں لکھی ہوئی باتوں کا بہت حوالہ دیا کرتے تھے۔ ان کے پاس بابائے اردو کے استعمال کی کچھ چیزیں بھی رکھی ہیں: ڈائریاں، خطوط، ہینڈ بیگ وغیرہ۔

شان الحق حقی صاحب کا ذکر وہ بڑی محبت سے کرتے تھے۔ لغت اور الفاظ کے حوالے سے ان کے کارنامے اور تفردات و اجتہادات سنایا کرتے تھے۔ کئی بار فرمایا کہ حقی صاحب بڑی سہولت اور روانی سے اردو کے نئے الفاظ بنا لیتے ہیں۔ انکل اس طرح کے کئی الفاظ کے بارے میں بتاتے تھے جو انھوں نے وضع کیے تھے: مثلاً disturbance in microwave link کے لیے قومی نشریاتی رابطے میں خلل۔ حقی صاحب کا Oxford English-Urdu لغت چھپا تو مجھے حکم دیا کہ فوراً خریدوں۔ میں اسلام آباد سے لے کر آیا تو متواتر کئی دن تک اسی میں کھویا رہا۔ اپنے ابو جان کے مضامین کا دیباچہ لکھتے وقت مجھے کئی الفاظ کا اردو مترادف ڈھونڈنے میں مشکل پیش آتی تھی، اس لغت نے یہ ضرورت پوری کر دی اور اگر اب بھی کسی لفظ یا ترکیب کا اردو مترادف معلوم کرنا ہو، شان الحق حقی صاحب[1] مجھے برقیاتی ڈاک (email) سے بتا دیتے ہیں۔ حقی صاحب کے اس لغت سے مجھے Wordprocessor کا اردو مترادف لفظ نگار ملا۔ میں نے انکل کو بتایا۔ یوں خوش ہوئے جیسے حقیقت میں انھیں کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ کئی بار اس لفظ کا ذکر کیا کرتے تھے، کہ کیا روانی اور بے ساختگی ہے اس لفظ میں۔ حقی صاحب سے اپنی ملاقاتوں کی باتیں بتاتے رہتے تھے اور ان میں دہلی اور کرخنداری زبان کا ذکر کرتے تھے...... اور یہ صرف اس لیے کہ مجھے حقی صاحب سے نہ صرف برقیاتی ڈاک کے ذریعے نیاز مندی حاصل ہے بلکہ اس لیے بھی کہ میں نے ایک عرصہ پہلے اُن سے آٹوگراف کے طور پر ایک خط کے ذریعے اُن کی ایک غزل حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے جب حقی صاحب کا آپریشن ہوا تو انکل نے مجھے بطورِ خاص دعا کرنے کا کہا اور یہ فرمایا کہ میں آپ کو ان کے آپریشن کا صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ ان سے رابطہ میں رہتے ہیں۔ اس بات کو عام نہ کریں۔ بہرحال اب چونکہ حقی صاحب الحمدللہ رو بصحت ہیں

---

[1] شان الحق حق صاحب کا انتقال ۱۱۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ٹورنٹو کینیڈا میں ہوا (مدیر)۔

اور انھوں نے بذاتِ خود اپنے چند نیاز مندوں کو، بشمول راقم الحروف اپنی صحت کے بارے میں اطلاع دی ہے، اس لیے اب اس بات کے ذکر میں کوئی قباحت نہیں رہی۔ میں نے ان سے انکل مشفق خواجہ صاحب کا قطعۂ تاریخ کہنے کی استدعا بھی کی ہے۔ اللہ کرے کہ وہ یہ کام سہولت سے کر سکیں۔

جناب رشید حسن خاں صاحب کا ذکر بھی کئی بار ہوا۔ انکل ان کے تبحرِ علمی کے بے اندازہ قائل تھے اور ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ مجھے ان کا پتا لکھوایا اور فرمایا کہ انھیں اپنے مرحوم والد صاحب کے کام کے بارے میں بتاؤں۔ تعمیلِ ارشاد میں، میں نے ابو جان کا دیوان ان کو ہندوستان بھیجا۔ انھوں نے اپنے جوابی خط میں مجھے درستِ املا کی کئی باریکیاں سمجھائیں۔ انکل نے ایک بار مجھے خاں صاحب کی مرتب کردہ ''مصطلحاتِ ٹھگی'' کے بارے میں اور اس حوالے سے اس پیشے کے بارے میں کئی باتیں بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ خاں صاحب اردو کے کلاسیکی ادب کو درست املا کے ساتھ مرتب کر کے شائع کروا رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔

میں نے اپنے ابو جان کا زیرِ ترتیب دیوان اور جمع شدہ تحریریں جناب عبدالعزیز خالد کو بھی دکھائیں۔ ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ابو جان نے ایک مضمون پڑھا تھا؛ یہ تقریب انھیں اب تک یاد ہے۔ انھوں نے ابو جان کے دیوان اور مضامین کے اردو لفظ نگار میں ٹائپ شدہ مسودے میں موجود چند الفاظ کی نشان دہی فرمائی۔ انکل نے مجھ سے یہ تصحیح شدہ نسخہ کراچی منگوایا اور فرمایا کہ عبدالعزیز خالدؔ صاحب نے جیسا بتایا ہے وہی درست ہے۔

میں جن کتابوں کو بار بار پڑھتا ہوں اور ان سے کبھی سیر نہیں ہوتا، ان میں جناب مختار مسعود کی تینوں کتابیں آوازِ دوست، سفر نصیب اور لوحِ ایام بھی شامل ہیں۔ ہر ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ان کی کوئی کتاب اٹھاتا ہوں اور پھر سے مکمل پڑھ لیتا ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی برکت سے میں نے اپنے وطن کی محبت والا سبق سیکھا تھا۔ جب آج کا شائع شدہ ایسا ادبی اور صحافتی مواد سامنے آتا ہے جس میں برعظیم کی تقسیم کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی ہوتی ہے تو میں ان کی کسی کتاب کو پڑھ کر ایمان وطن تازہ کر لیتا ہوں۔ خوف کی حالت میں آدمی اسی چیز کی طرف بھاگتا، پناہ پکڑتا ہے جس سے حفاظت کی امید ہوتی ہے؛ جیسے ایک خوف زدہ بچہ اپنی ماں کی طرف دوڑ کر اور اس کی گود میں امن محسوس کرتا ہے۔ میں ویسے ہی مختار مسعود صاحب کی کتابوں میں پاکستان کی محبت اور ان کی صحبت میں امن محسوس کرتا ہوں۔ دین و وطن کی بے لوث محبت کے ذیل میں ان کی کتابیں میرا سرمایۂ ایمان بن گئی ہیں۔ مجھے کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک بار میں اپنے دوست جناب ظہیر احمد کے ہمراہ ان کے ہاں گیا تو اردو املا کی معیار بندی

(standardization) کے موضوع پر بھی ان سے باتیں ہوئیں۔ رشید حسن خاں صاحب کی اس سلسلے کی محنت کے ذکر بھی انھوں نے ان کے مرتب کردہ کلیات جعفر زٹلی کے بارے میں بتایا کہ انھیں بہت افسوس ہے کہ خاں صاحب نے ایسی چیز کو مرتب کیا جس میں سوقیانہ پن اور برہنگی ہے اور اس سب کچھ کو انھوں نے حذف کرنے کی بجائے بہ تمام وکمال شائع کر دیا ہے۔ انھیں اس کتاب سے بے حد انقباض تھا اور اپنے گھر میں اس کا نسخہ موجود ہونے پر شرمندگی بھی۔ مشفق خواجہ صاحب جناب مختار مسعود کے بہت مداح تھے اور ٹیلی فون پر اپنی گفتگو میں ان کا ذکر بھی کرتے تھے اور ان کے والد شیخ عطاء اللہ صاحب اور اپنے والد خواجہ عبدالوحید صاحب کے تعلق کا بھی بتاتے تھے۔ ایک بار میں نے اپنی اس ملاقات کی روداد سنائی تو انھوں نے مختار مسعود صاحب کی بات سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ انھوں نے خود بھی یگانہ کا کلیات مرتب کرتے ہوئے ان کے ناشائستگی اور برہنگی کی حدود میں جا پڑنے والے کلام کو اسی وجہ سے نظری کر دیا ہے۔

ٹیلی فون پر مشفق خواجہ صاحب نے مشتاق احمد یوسفی صاحب کا ذکر بھی کئی بار کیا۔ میں یوسفی صاحب کی چاروں کتابوں آب گم، زرگزشت، چراغ تلے اور خاکم بدہن کے بہت سے جملوں کا 'حافظ' ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے آغا خان یونیورسٹی ہسپتال کراچی میں ایک تقریب میں ان کا لیکچر ہوا تھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے اس تقریب کا تذکرہ کئی بار کیا۔ میرے آغا خان ہسپتال میں علاج کے لیے جانے کی وجہ سے گفتگو میں اس ہسپتال کا ذکر ہو ہی جاتا تھا اور اس ذکر کے ساتھ ہی یوسفی صاحب اور ان کے اس لیکچر اور تقریب کی باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔

مقتدرہ قومی زبان، پاکستان کے صدر نشین پروفیسر فتح محمد ملک صاحب سے میں نے انکل مشفق خواجہ صاحب کے حکم پر پہلی بار رابطہ کیا۔ یہ بات ذہن سے اتر رہی ہے کہ اس وقت کون سی کتاب کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔ میرا کام تو انھوں نے پہلی بار بات کرتے ہی کروا دیا تھا لیکن جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ایسا شفیق اور محبت بھرے لہجے میں بات کرنے والا افسر نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اب تک کوئی اور دیکھا ہے۔ میں ہمیشہ احسان مند رہوں گا مشفق خواجہ صاحب کا، کہ ان کی برکت سے ایسے خلیق بزرگ سے میرا رابطہ ہوا۔

مشفق خواجہ صاحب کی خواہش تھی کہ میں اپنے ابو جان کی ہندی شاعری کو دیوناگری رسم الخط میں لکھواؤں تاکہ اسے ہندوستان سے شائع کرایا جائے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ابو جان کے دوست ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب کی عنایت سے میں نے کلام کا یہ حصہ دیوناگری رسم الخط میں ٹائپ کرا لیا تھا۔ اکادمی ادبیات

WWW.KITAABISTAN.COM

پاکستان اسلام آباد میں انکل سے ملاقات کے وقت میں اسے ساتھ لے گیا تھا تاکہ اسے ان کے حوالے کر دوں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ اسے انجمن ترقی اردو ہند یا ہندوستان میں کہیں سے شائع کرا دیں۔ ابو جان کی کتاب ''مغرب میں آزاد نظم اور اس کے مباحث'' شائع ہوئی تو انھوں نے مجھے ہندوستان کی کئی لائبریریوں اور اہل علم کے پتے لکھوائے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے توسط سے میں ان تک یہ کتاب بھجواؤں۔ اس ملاقات کے کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم صاحب پاکستان تشریف لائے۔ ہندوستان واپسی سے بالکل پہلے وہ اسلام آباد میں تھے کہ انکل نے مجھے فون کیا کہ میں فوراً ان سے ملوں۔ افسوس کہ اچانک آن پڑنے والی ایک دفتری ضرورت کی وجہ سے اس روز اسلام آباد نہ جا سکا اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے نہ مل سکا...... اور یوں یہ دونوں کام ابھی تک نامکمل پڑے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی صاحب کا تذکرہ بھی کئی بار ہوا۔ انکل نے مجھے بتایا کہ فاروقی صاحب نے ''لغات روزمرہ'' کے نام سے ایک لغت مرتب کیا ہے۔ یہ آپ کے کام کی چیز ہے۔ آپ اسے حاصل کیجیے۔ مجھے اچانک یہ لغت ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ہاں نظر آیا جو میں نے ان سے لے کر فوٹو کاپی کرا لیا۔ میری سعادت ہے کہ یہ وہ نسخہ ہے جس کو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے از اول تا آخر پڑھ کر اس میں کئی جگہ پر اپنے ریمارکس لکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا ذکر بھی انکل نے کئی بار کیا۔ میرے ابو جان نے ۱۹۸۴ء میں ریڈیو پاکستان بہاول پور سے ایک مذاکرے 'اردو شاعری میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم' میں شرکت کی۔ اس کے لیے ان کے لکھے ہوئے نوٹس کو میں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی اجازت سے ان کی کتاب 'اردو کی نعتیہ شاعری' کی مدد سے مکمل مضمون کی شکل دے دی۔ مشفق خواجہ صاحب کے حکم پر میں نے اس مضمون کو ابو جان کے نوٹس سے فائدہ اٹھانے کے حوالے کے ہمراہ اپنے نام سے ''الزبیر'' میں شائع کرا دیا ہے۔

پروفیسر اورنگ زیب عالم گیر صاحب جو کسی زمانے میں بہاول پور آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر تھے اور آج کل پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پروفیسر ہیں، کے بارے میں انکل بے حد محبت سے بات کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ وہ بہت عالم آدمی ہیں۔ ان کے انکل سے تعلق کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر صاحب ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی گئے تھے۔ یکم مئی ۲۰۰۴ء کو تبلیغی جماعت کے ساتھ میری تشکیل پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں ہوئی۔ خصوصی گشت کرتے ہوئے میں پروفیسر اورنگ زیب عالم گیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ابو جان کے بارے میں بڑی مزے دار

باتیں بتاتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مشفق خواجہ صاحب نے ان سے یہ فرمایا ہے کہ عابد صدیق صاحب کے انتقال کے بعد ان کے کاموں کو آپ ہی لوگ جمع کریں گے۔ میں نے ان کو اس وقت تک کیے گئے کام اور ابوجان کی جمع شدہ تحریروں کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے کئی مشورے بھی دیے۔ انکل نے مجھ سے اس ملاقات کی روداد سنی تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تبلیغی کام کی کارگزاری بھی ساتھ سنا دی۔ انکل بہت خوش ہوتے رہے۔

ٹیلی فون پر جن لوگوں کے بارے میں اکثر بات ہوتی تھی ان میں ایک خاص حوالہ سیدی و مرشدی پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری کا بھی ہے۔ میرے یہ شیخ آج کل عربوں کو زبانِ فرنگ کی تعلیم دینے پر عندالحکومت السعودیہ ملازم ہیں اور تبوک شہر کے ایک ضلع اُملج میں قیام رکھتے ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات کا ذکر انکل نے کئی بار کیا۔ فرماتے تھے ان کی تحریر سے تو سید ذوالکفل ایک عمر رسیدہ بزرگ لگتے تھے لیکن جب میں نے پہلی بار ان کو دیکھا تو سر پر ٹوپی، بڑی سی عینک اور کاندھے پر رومال۔ ایسے لگا جیسے مدرسے کے آدمی ہیں ......''

جب بھی بھائی سید ذوالکفل کا ذکر ہوا، وہ بڑے اصرار سے انھیں سلام بھجواتے تھے اور ان کا حال پوچھتے تھے۔ ملتان سے ان کے رسالے ''نقیب ختم نبوت'' کے معیار کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ مجھے انکل کی وفات کا سندیسہ (SMS) سب سے پہلے بھائی سید ذوالکفل ہی سے ملا۔ انھوں نے تبوک سے یہ سندیسہ میرے موبائل ٹیلی فون پر ارسال کیا تھا۔ (یاد رہے کہ 'سندیسہ' کی یہ اصطلاح ابھی چند روز قبل کینیڈا سے جناب شان الحق حقی صاحب نے میرے استفسار پر عطا کی ہے۔)

☆

میرے ابوجان نے ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب اور ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب تو ان کے ہم جماعت تھے جب کہ ہاسٹل کے دوستوں میں فارسی کے ڈاکٹر آفتاب اصغر صاحب اور انور مسعود صاحب کے علاوہ عربی کے ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب بھی تھے۔ مشفق خواجہ صاحب نے کئی بار فرمایا تھا کہ میں ابوجان کے ان احباب سے مضامین لکھواؤں۔

میرے بہت ہی محترم انکل ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب نے ابوجان کی زندگی ہی میں ان کے دیوان کا دیباچہ لکھا۔ ابوجان کی وفات کے بعد میں نے دیوان کو کلیات کی شکل دی اور ابوجان کے نظری کلام کو بھی شاملِ دیوان کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے اس کی تصویب فرمائی اور اس کے لیے تعارفی کلمات تحریر فرما دیے۔ ابوجان کی کتاب ''مغرب میں آزاد نظم اور اس کے مباحث'' کا تعارف و تبصرہ بھی انھوں نے لکھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے ٹیلی فون پر ان تحریروں کا ذکر کئی بار کیا۔

ٹیلی فون پر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کا ذکر بھی کئی بار ہوا۔ ان کی ایک زیرِ ترتیب کتاب مرزا غالب کے بارے میں تھی جس کا مجھے علم تھا۔ کسی وقت میں نے مشفق خواجہ صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر میرے علم میں مرزا غالب پر کیا ہوا کوئی غیر مطبوعہ کام آئے تو انھیں مطلع کروں کیوں کہ وہ غالب لائبریری (ناظم آباد، کراچی) سے ایسے کام کو شائع کرا سکتے ہیں۔ میں نے اسلم انصاری صاحب کی کتاب کا ذکر کیا۔ پھر میرے یہ دونوں بزرگ اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں فون پر اور شاید خطوط کے ذریعے بھی رابطے میں رہے۔

ڈاکٹر آفتاب اصغر صاحب گزشتہ صدی کے بالکل آخری سالوں میں تبریز (ایران) میں ہونے والی نظامی گنجوی کانفرنس سے واپس ہوئے تو کراچی میں مرحوم شیخ نوازش علی اور ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے ساتھ ان کو بھی مشفق خواجہ صاحب نے عشائیے پر مدعو کیا۔ انھوں نے کئی گھنٹے خود کار چلاتے ہوئے ان سب لوگوں کو کراچی شہر کی سیر کرائی۔ خالق دینا ہال لے کر گئے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مولانا ابوالکلام آزاد کا مقدمہ سنا گیا تھا اور جس کی روداد ان کی کتاب ”قولِ فیصل“ میں ملتی ہے۔ انھوں نے ساحلِ سمندر پر واقع ایک ہوٹل میں عشائیہ دیا اور ان سب لوگوں کی تصویریں اتاریں۔ ان سے اس واقعہ کا ذکر بھی دو تین بار ہوا۔

مجھے اسلام آباد میں کئی بار انور مسعود صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ۱۰ مارچ ۲۰۰۴ء کو میں اپنے دوستوں چوہدری شبیر احمد صاحب اور سلمان سعد صاحب کے ساتھ ان کے ہاں حاضر ہوا تو انھوں نے میرے آٹوگراف البم میں اپنی وہ نظم لکھ کر دی جس کا پہلا شعر ہے:

میرے پانی میں ملا اور ذرا کم پانی
میری عادت ہے کہ پیتا ہوں بہت پتلا پانی

مشفق خواجہ صاحب سے ایک بار آٹوگراف اور اس نظم کا ذکر ہوا تو انھوں نے فوراً انور مسعود صاحب کا وہ قطعہ کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ سنایا جس کا آخری مصرع ہے: ع اک لونگ گواچا ہے تو کیا شور مچا ہے۔ پھر انور مسعود صاحب کی کتاب ”فارسی ادب کے چند گوشے“ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ سبک ہندی کی اصطلاح میں نے انھیں سے سنی۔ بعد میں ایک بار انور مسعود صاحب کے ہاں جانا ہوا تو انھوں نے اپنی یہ کتاب عطا فرمائی، اور کچھ اور کتب بھی۔

ٹیلی فون پر مشفق خواجہ صاحب سے گفتگو میں ابو جان کے پنجاب یونیورسٹی کے زمانے کے احباب کا ذکر، ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان کا ذکر آنے پر وہ ان کے مختلف علوم و فنون کے وسیع مطالعے، علم و فضل اور ان کی عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی پر مہارت کا بتایا کرتے تھے۔ مجھے فرمایا تھا کہ میں

WWW.KITAABISTAN.COM

انھیں اپنی کتاب "Words & Reflections of "Maulana Ilyas پیش کروں۔ خورشید رضوی صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام "امکان" کا انتساب میرے ابوجان کے نام کیا ہے۔ اللہ کا کرنا، جس شام اس مجموعے کی تقریب رونمائی تھی اس روز میں کسی سرکاری کام سے لاہور میں تھا۔ میں نے اپنے بہت عزیز دوست جناب عمران مجید صاحب کے ہمراہ اس تقریب میں شرکت کی۔ بہت سے لوگوں کے علاوہ خواجہ محمد زکریا صاحب، شہزاد صاحب اور امجد اسلام امجد صاحب نے بھی تقریریں کیں اور مقالے پڑھے۔ خورشید رضوی صاحب نے اپنی تقریر میں میرا ذکر بھی کیا اور ابوجان کے تذکرے سے مجھے رلا دیا۔ مشفق خواجہ صاحب نے اگلی رات کو فون پر مجھ سے اس تقریب کی رپورٹ لی تھی۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، اپنی سمجھ کے مطابق بتلا دیا۔

جناب عمران مجید صاحب بعد میں بہت عرصہ تک اس تقریب کا ذکر کرتے رہے۔ انھیں خورشید رضوی صاحب کی اس موقع پر پڑھی ہوئی ایک غزل بہت ہی پسند آئی تھی۔

☆

ٹیلی فون پر انکل سے گفتگو میں وحید الرحمٰن خان صاحب کا ذکر بھی آیا۔ یہ ہمارے معروف قلم کار اور "سجدہ ہر ہر گام کیا" جیسے حج بیت اللہ کے بے بدل سفرنامے کے مصنف جناب پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان صاحب (ملتان) کے فرزندِ ارجمند ہیں اور آج کل اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ اقبالیات میں ریسرچ سکالر ہیں۔ انھوں نے اپنا ایم فل اردو کا مقالہ مشفق خواجہ صاحب پر "خامہ بگوش...... ایک مطالعہ" کے عنوان سے لکھا تھا۔ ان کے بارے میں انکل فرماتے تھے کہ یہ ایک سنجیدہ آدمی ہیں۔

ٹیلی فون پر گفتگو میں زیرِ تذکرہ آنے والی بہاول پور کی ادبی شخصیات میں ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی صاحب کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ ان کے والد مرحوم سید شہاب دہلوی صاحب کا ذکر بھی کئی بار ہوا۔ انکل نے شاہد صاحب سے کچھ رسالے میرے توسط سے منگوائے۔ اردو اکادمی بہاول پور سے شائع کردہ ابوجان کی کتاب "مغرب میں آزاد نظم اور اس کے مباحث" بھی شاہد صاحب نے انھیں ارسال کی۔ میں فرانس سے "الزبیر" کے لیے عالمی معیاری جریدہ نمبر (ISSN) لیا تو انکل نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ آپ بہاول پور سے اتنی دور بیٹھ کر بھی بہاول پور والوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ شاہد صاحب کے بارے میں انکل فرماتے تھے کہ محنتی اور بہت سعادت مند آدمی ہیں۔

☆

ٹیلی فون پر جن لوگوں کے بارے میں اکثر بات ہوتی تھی ان میں سے ایک صاحب کا ذکر واجب

WWW.KITABOSUNNAT.COM

بھی ہے اور فرض بھی۔ میں جب پہلی بار انکل مشفق خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو بیس بائیس سال عمر کے ایک صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ یہ ناصر جاوید صاحب تھے۔ انھوں نے ہی ابو جان کی تصاویر اور پھر انکل کی کتاب ''خامہ بگوش کے قلم سے'' لا کر دی تھی۔ اسی موقع پر کسی خاص لغت میں سے کوئی لفظ دیکھنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ کتابوں کے اس بے کراں سمندر سے گوہر مقصود کو حاصل کرنے میں کم از کم آدھ پون گھنٹہ تو ضرور ہی لگے گا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ محترم بھائی ناصر صاحب ایک منٹ کے اندر اندر مطلوبہ لغت سمیت آ موجود ہوئے۔

یہ ان کا پہلا تعارف تھا جو انکل کی موجودگی میں ہوا۔ اس کے بعد تو ان سے رابطے کی ایسی عادت ہوئی کہ سب حجاباتِ من و تو اٹھ گئے۔ انکل سے ٹیلی فون پر میری بات زیادہ تر بھائی ناصر صاحب کے توسط سے ہوتی تھی کیوں کہ ٹیلی فون عموماً وہی سنتے تھے۔ دربان کے قدم لینا تو ویسے بھی ایک روایت ہے، گو شاعری کی لپیٹ میں آ کر اس روایت سے اخلاص یوں نکل گیا جیسے تھنوں سے دودھ نکلتا ہے۔ ان کے بارے میں مرحوم انکل اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''بھئی حافظ صاحب! یہ ناصر تو آپ کا مرید ہو گیا ہے۔'' میں یہ جملہ کبھی نہ بھولوں گا۔ انکل کی صحت کا حال اور ادبی موسم کا حال یعنی ان سے ملنے کے لیے آنے والوں کا حال، ناصر صاحب کی زبانی معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ناصر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ایک بار انکل نے ان سے دریافت کیا تھا کہ حافظ صاحب اور آپ ٹیلی فون پر اتنی لمبی لمبی کیا باتیں کرتے ہیں، تو انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ ''ادبی گفتگو ہوتی ہے۔'' انکل بہت ہی محظوظ ہوئے۔

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے مہمان خانے میں، میں مشفق خواجہ صاحب کی خدمت میں اپنے بہت ہی باذوق اور دین دار دوست جناب ضیاء الرحمٰن صاحب کے ساتھ حاضر ہوا۔ یہ اگست ۲۰۰۴ء کی بات ہے۔ یہ ملاقات بڑی یادگار تھی، اس لحاظ سے بھی کہ یہ میری ان سے آخری روبرو ملاقات تھی۔ اس موقع کی کچھ باتیں مجھے یاد ہیں۔ کمرے میں کچھ اہل قلم موجود تھے جن سے انھوں نے میرا تعارف کرایا کہ یہ مرحوم عابد صدیق کے بیٹے ہیں۔ اس کے بعد وہ ابو جان کے بارے میں گویا ہوئے ''عابد صدیق صاحب کی شخصیت میں، میں نے عجیب بات دیکھی۔ ان کی وفات کے بعد جس نے بھی ان کا تذکرہ کیا، انتہائی محبت کے ساتھ کیا اور بہت ہی محبت کے ساتھ ان کو یاد کیا۔ اکثر اہل قلم تو کسی کا ذکر زندگی میں بھی اچھے الفاظ میں نہیں کرتے۔ میں نے یہ محبت صرف عابد صاحب کے لیے دیکھی کہ ہر شخص ان سے محبت کرتا ہے، جو دھڑے بندیوں کے اس دور میں بڑی ہی عجیب بات ہے۔''

کمرے میں موجود اہل علم میں سے کسی نے میری ادبی مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے معذرت خواہانہ انداز میں عرض کیا کہ میں ہری پور جیسی بالکل دور افتادہ سی جگہ پر رہتا ہوں اس لیے مجھے کسی مجلس یا تقریب کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں علم نہیں ہوتا اور میں اس لیے کوئی علمی و ادبی کام نہیں کر پاتا کہ میں کسی بڑے شہر میں نہیں رہتا۔ میری بات سن کر انکل نے فرمایا ”بڑے کام کرنے کے لیے الگ تھلگ رہنا ضروری ہے۔ میں خود کسی ادبی مجلس میں نہیں جاتا۔ بہت کم گھر سے نکلنا ہوتا ہے۔ صرف اتوار کو لوگوں سے ملتا ہوں۔ اس کے علاوہ آپ یوں سمجھیے کہ میں گھر میں معتکف ہوتا ہوں۔ بھئی حافظ صاحب! دور دراز اور الگ تھلگ جگہ پر رہنے کو غنیمت جانیے۔“ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے بارے میں بتاتے رہے کہ ان کے عزیزوں میں کیسے مختلف النوع مشاغل والے لوگ ہیں۔

اس ملاقات کے دوران میں نے ان سے ان کے تازہ شائع ہونے والے کالموں کے دونوں مجموعوں ”سخن در سخن“ اور ”سخن ہائے ناگفتنی“ پر آٹو گراف لیے۔ انھوں نے دونوں مجموعوں پر لکھا ”یہ تو مظفر علی سید مرحوم کی کتاب ہے“ اور پھر خامہ بگوش لکھ کر ۴/۸/۲۰۰۰ء تاریخ ڈال دی۔ کلیات یگانہ پر بھی آٹو گراف لیا۔ پھر انھوں نے کمرے میں موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے کہا ”دیکھیے بھئی! حافظ صاحب کیسے عجیب آدمی ہیں، میری کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں اور مجھی سے ان پر آٹو گراف بھی لیتے ہیں، جیسے میں نے یہ کتابیں ان کو خود سے دی ہوں۔“ میں نے یہ کتابیں ان کے اسلام آباد آنے سے قبل بطور خاص منگوائی تھیں۔ ان کے کہنے پر میں نے کراچی میں جناب معین مرزا صاحب سے ان کتابوں کی خریداری کے لیے رابطہ کیا تھا اور جناب وسیم خواجہ یہ کتابیں ان سے لے کر آئے تھے۔

بھائی ذوالکفل بخاری ان دنوں چھٹیوں پر چند یوم کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ان سے طے ہوا تھا کہ خواجہ صاحب سے موبائل فون پر ان کی بات کراؤں گا۔ سو انھوں نے میرے موبائل پر یہاں ان سے بات کی۔ انکل بے حد خوش ہوئے۔ سید ذوالکفل نے ان کی صحت کا پوچھا تو فرمایا کہ ”پاکستان کی ادبی صورت حال سے اچھی ہے۔“ اس کے بعد کمرے میں موجود لوگوں سے ان کے ادبی ذوق، علم کی وسعت و گہرائی، تحریری پختگی اور ان کے خاندان کی عظمت و شرف کا ذکر فرماتے رہے۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب بھی اکادمی ادبیات پاکستان کے مہمان خانے میں مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات کے اس موقع پر موجود تھے۔ ان کی انکل جان سے ملاقات اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں انکل جان کے ساتھ منائی گئی ایک شام (اواخر نومبر ۲۰۰۰ء) میں ہوئی

تھی۔ یہ آخری فنکشن تھا جس میں ابوجان نے شرکت کی کیوں کہ اس سے اگلے ہفتے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب نے بہت محبت سے ابوجان کا ذکر کیا اور ان سے اپنے پرانے تعلق اور اس تعلق کی باتیں بتاتے رہے۔

واپسی پر جناب ضیاء الرحمن ان باتوں کا تذکرہ کرتے رہے جو یہاں ہم نے سنی تھیں۔

☆

میرے ابوجان مرحوم پروفیسر عابد صدیق شاعری اور تنقید کے میدان میں ایک خاص مقام کے حامل تھے۔ گو مشہور نہ ہو سکے کیوں کہ بہاول پور جیسے دور دراز مقام پر رہنے کے علاوہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ معاشی تنگی میں گزارا اور شہرت سے ان کی طبیعت نفور تھی۔ مشفق خواجہ صاحب کے ایما پر میں نے ابوجان کی وفات کے بعد ان کے کلام اور ادبی مضامین کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور الحمدللہ اب یہ کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ ابوجان کی کتاب "مغرب میں آزاد نظم اور اس کے مباحث" نومبر ۲۰۰۴ء میں اردو اکادمی بہاول پور سے چھپی ہے۔ شعری مجموعہ "پانی میں ماہتاب" کا دوسرا ایڈیشن جس میں وفات تک کا کلام شامل ہے لاہور سے شائع ہونے کو ہے۔ محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب اسے شائع کرا رہے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ مضامین کا ایک مجموعہ "تنقیدات" کے نام سے ہے، جسے لاہور سے محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب شائع کریں گے۔ ان سب مسودوں کی ترتیب و تدوین اور چھان پھٹک خواجہ محمد زکریا صاحب نے کی ہے۔ معاصر تنقید پر ابوجان کی ایک کتاب "مغربی تنقید کا مطالعہ۔ افلاطون سے ایلیٹ تک" پہلی بار ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اب تک دو بارہ چھپ چکی ہے۔ مضامین کا ایک اور مجموعہ اور دیگر چیزیں ابھی زیر ترتیب ہیں۔

"دریائے سندھ ۔۔ ایک تاریخی اور جغرافیائی مطالعہ" کے عنوان سے ابوجان نے ایک تحقیقی مضمون فروری ۱۹۸۲ء میں جناب کریم بخش خالد سیکرٹری اطلاعات حکومت سندھ کی درخواست پر سکھر بیراج کے جشن سیمیں کے موقع پر لکھا اور یہ سب سے پہلے ماہنامہ "اظہار" کراچی کے شمارہ مارچ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ کریم بخش خالد صاحب کو یہ مضمون لکھوانے کے لیے ابوجان کا نام مشفق خواجہ صاحب نے تجویز کیا تھا۔

محب ہند پریس دہلی سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہونے والی منشی چرنجی لال دہلوی کی مرتب کردہ "ہندوستانی مخزن المحاورات" کا ایک نسخہ ہمارے گھر میں موجود ہے۔ اس کے ابتدائی تین چار صفحات ضائع ہو گئے تھے۔ انکل نے یہ صفحات فوٹو کاپی کروا کر مجھے ارسال کیے تھے۔

ابو جان کا دیوان ''پانی میں ماہتاب'' ان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ عرصہ ہوا ''مغربی تنقید کا مطالعہ۔۔۔ افلاطون سے ایلیٹ تک'' انھوں نے مجھ سے منگوائی۔ اس کے بعد اب تک دریافت ہونے والے سارے مضامین اور شاعری بھی طلب فرمائی۔ ابو جان پر کچھ لکھنے کا پروگرام تھا یا کسی حوالے کے لیے یہ چیزیں منگوائی تھیں، واللہ اعلم۔

☆

مشفق خواجہ صاحب کی وفات کی خبر میرے لیے نہایت ہی غیر متوقع تھی۔ میں نے ۱۹/فروری ۲۰۰۵ء کو ان سے صبح ۱۱ بجے کے قریب فون پر بات کی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ تقریباً بیس منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے حسب معمول کئی نصیحتیں فرمائیں۔ بہاول پور میں ۸۔۹ فروری ۲۰۰۵ء کو ایک عالمی اردو کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا۔ ہری پور میں سید زاہد کاظمی صاحب نے ایک لائبریری بنانے کا ڈول ڈالا ہے۔ اس سے متعلق بات فرماتے رہے۔ محترمہ فاطمہ ثریا بجیا صاحبہ کو غالب لائبریری کی ذمہ داری تفویض کیے جانے کے بارے میں بتایا اور بھی کچھ باتیں کیں۔ میں نے کسی سلسلے میں ایک صاحب کا پتا دریافت کیا تو مجھے فرمایا کہ ''بھئی حافظ صاحب! جو بھی کام کریں، اس میں پہلے یہ دیکھ لیا کریں کہ اس کام کے کرنے میں آخرت کا کیا فائدہ ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا کریں کہ اس کام کے کرنے سے دنیا میں کیا فائدہ ہوگا۔'' مجھے فوراً یاد آیا کہ بالکل اسی سے ملتا جلتا جملہ ملا واحدی مرحوم نے جناب مختار مسعود صاحب کو آٹوگراف میں لکھ کر دیا تھا۔ اس موقع پر ان کی بشاشت اور تفصیلی گفتگو کے بعد میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فون پر یہ میری ان سے آخری ملاقات ہو رہی ہے اور آج ہی رات وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہوں گے۔ بقول یگانہ

اٹھنے ہی کو ہے بیچ سے پردہ مجاز کا
قصہ بس اب تمام ہے عمر دراز کا

سوچتا ہوں کہ پدرانہ شفقت اور محبت کے ساتھ ایسی باتیں کرنے والا اب اور کون ہوگا جس کی نصیحتوں کی بنیاد نرے خلوص پر ہوتی تھی اور مرحوم پروفیسر عابد صدیق کا بیٹا ہونے کی وجہ سے میری تربیت اور بس۔

میں ان سے فون پر وقت بے وقت رابطے میں رہتا تھا لیکن میرے فون کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی! میں ادیب ہوں نہ شاعر بلکہ قلم کے استعمال ہی سے بالکل تہی ہوں۔ میں تو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا آدمی ہوں۔ میں اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ کس طرح پہناؤں۔ میں ان کو صرف اس لیے فون کرتا تھا کہ انھیں میرے

مرحوم ابو جان سے بہت ہی زیادہ محبت تھی اور انکی آواز سن کر میں اپنے ابو جان کی یاد کو تازہ کیا کرتا تھا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے جب میرے ابو یاد آتے تھے، میں انھیں یا ابو جان کے چند احباب میں سے کسی کو فون کر لیتا تھا۔ میں جب بھی فون کرتا، وہ میری آواز سنتے ہی بہت خوشی کے ساتھ فرماتے تھے: ''کیا کہنے، کیا کہنے۔'' اور اس کے بعد سلام کا جواب دیتے۔ محبت اور عنایت کی شیرینی میں ڈوبی یہ آواز جو مجھے میرے مرحوم ابو جان کی یاد دلایا کرتی تھی، اب میں یہ آواز کبھی نہ سن پاؤں گا۔ سوچتا ہوں کہ میں اپنا یہ دکھ، بلکہ دکھ در دکھ، بانٹنے کس کے پاس جاؤں۔ میرا تو یادوں، عنایتوں، شفقتوں اور تربیت کا ایک درخشاں باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ واحسرتا! ایک ایسا آدمی جس سے کبھی کسی کو ضرر نہ ہوا تھا اور جس سے زبان وادب کے علم کی ہر شاخ کے پھول کا عطر مل جایا کرتا تھا، خود خوشبو بن کر راہی ملک بقا ہوگیا۔

۲۲ فروری ۲۰۰۵ء کی شام کو مرحوم مشفق خواجہ صاحب کو سیکڑوں سوگواروں نے سپرد خاک کیا اور یوں زمین کی امانت زمین کو پہنچ گئی۔ میں رات کو سونے کے لیے لیٹا اور دائیں طرف کروٹ لی تو ایک دم خیال آیا کہ آج ان کی قبر میں پہلی رات ہے اور وہ بھی اسی طرح دائیں کروٹ پر قبلہ رو لیٹے ہوئے ہوں گے۔ یہ خیال دل و دماغ میں کچھ ایسے پیوست ہوا کہ میں تقریباً ساری رات ہی جاگتا رہا۔ قبر کی زندگی اور منازل آخرت سے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث یاد آتی رہیں۔ کیسے اللہ کے تعلق والے آدمی تھے وہ کہ ان کی وجہ سے یاد قبر نصیب ہوئی۔ اللہ پاک ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور اس میں جنت کی کھڑکیاں کھول دے اور جنت کی ہوائیں ان کو پہنچائے، آخرت کی سب گھاٹیوں کو سرعت کے ساتھ عبور کرنا ان کے لیے آسان کر دے اور روز محشر میں اپنے سامنے اس حال میں کھڑا فرمائے کہ وہ ان سے راضی ہو۔ آمین۔ میں ان کے انتقال کے وقت اسلام آباد میں تھا۔ نماز جنازہ میں شرکت کے لیے جانے کا سوچتا رہا۔ جہاز میں نشست بھی محفوظ کرالی لیکن مجھے حوصلہ نہیں پڑا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن میں انکل کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

انکل کے ایصال ثواب کے لیے میں نے الحمد للہ ہری پور میں اپنی مقامی مسجد میں قرآن خوانی کرائی۔ دعا کے وقت اللہ نے یہ بات دل میں ڈالی کہ اب وہ دنیا سے انتقال فرما گئے ہیں۔ دنیا کی ضرورتیں اور ہوتی ہیں اور آخرت کی اور۔ اب ان کے متعلقین یعنی ہم لوگوں کو ان کی آخرت کی ضرورتوں کے پورا کرنے کی فکر کرنی چاہیے جہاں وہ اب ہمیشہ رہیں گے: ایسے اعمال کرنے چاہئیں جو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنیں کیوں کہ ان کی آئندہ زندگی کی ضرورتیں صرف یہی ہیں۔ ان کا اصل نام عبدالحی تھا یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والے کا بندہ۔ سوچتا ہوں کہ کیسا برمحل نام ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

عجب نیاز ہے اس کے لیے مرے دل میں
اگرچہ اس کو بظاہر میں پوجتا بھی نہیں

انکل خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد میں یہ سوچتا رہا کہ تعزیت کس سے کروں کہ تعزیت کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مستقل سنت ہے۔ اللہ پاک نے یہی بات دل میں ڈالی کہ ان لوگوں سے تعزیت کی جائے جن کا ذکر ان سے ٹیلی فون پر گفتگو میں آیا کرتا تھا۔ سو میں نے بہت سے لوگوں کو ٹیلی فون کر کے تعزیت کی اور خط بھی لکھے کہ تعزیت کا خط لکھنا بھی سنت رسولؐ ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ آمنہ مشفق صاحبہ کو فون اس لیے نہ کیا کہ محتاط علما کا مذہب یہ ہے کہ عدت کے دوران میں فون پر بھی بات نہ کی جائے۔ البتہ انھیں خط ضرور لکھا۔ ان کے بھائی خواجہ طارق صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ وہ بہت رقت کے ساتھ بتاتے رہے کہ مشفق خواجہ صاحب ان سے عمر میں گو صرف تین سال بڑے تھے لیکن ان کا تعلق ایسا تھا جیسا ایک شفیق باپ کا ہوتا ہے۔

تعزیت کا ٹیلی فون میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ لاہور میں سب لوگ تعزیت کے لیے میرے ہی پاس آ رہے ہیں اور اس وقت بھی پانچ چھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر انھوں نے بتایا کہ خواجہ صاحب کی فون پر آخری بات انھی سے ہوئی ہے اور ان کے ہی اصرار پر وہ رات ہسپتال گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بتاتے رہے کہ ان کا خواجہ صاحب سے ۵۲ سالہ تعلق تھا جس میں کبھی دراڑ نہیں آئی۔ ان کے دل پر بہت زیادہ بوجھ تھا اور آواز گلوگیر۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلیم کردہ تعزیت کے آداب یاد آ گئے۔ میں نے بات مختصر کرتے ہوئے جلدی ٹیلی فون بند کر دیا۔

☆

میرے بچپن کی بات ہے کہ ہمارے ابو جان پڑھتے لکھتے وقت اپنا قلم کان پر لگا لیتے تھے۔ اس پر ہم حیران بھی ہوتے تھے اور موقع ملنے پر اس کی نقل بھی اتارا کرتے تھے۔ بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ کان پر قلم رکھنا قلم کا ادب ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ عرضی نویس قلم کو کان پر اس لیے بھی لگا لیتے تھے تا کہ خالی ہاتھ سے کوئی اور کام کیا جا سکے۔ اور پھر ابھی چند روز پہلے خورشید رضوی صاحب نے غالب کا ایک شعر بھی سنایا ہے:

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس شعر میں 'مگر' کا لفظ، 'شاید' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مشفق خواجہ صاحب کالم ’’خامہ بگوش کے قلم سے‘‘ کے عنوان سے ’’تکبیر‘‘ کے ذریعے ایک مدت تک ہمارے گھر میں آتا رہا ہے۔ ہم گھر والوں میں سے اکثر لوگ یہ رسالہ اسی کالم ہی سے شروع کرتے تھے۔ ان کے بہت سے جملے یاد ہو گئے۔ مثلاً ہمارے دور کے ایک عزیز جو اس وقت تک شاید پچاس سے بھی زیادہ دواوین کے بوجھ سے اردو شاعری کو زیر بار کر چکے ہیں، کی شاعری پر کالم لکھتے ہوئے انھوں نے تبصرہ کیا کہ ’’کیا زمانہ آ گیا ہے۔ جس شاعری کا وزن پانچ سو گرام بھی نہیں ہوتا، وہ نوے گرام کاغذ پر چھپتی ہے۔‘‘ ایک شاعر کے بارے میں لکھا کہ ’’وہ بہت اچھے انسان تھے۔ لیکن آخر انسان تھے۔‘‘ ان کے یہ سارے کالم میرے پاس موجود ہیں اور انھیں اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ کلیات یگانہ کا دیباچہ بھی میں نے کئی بار پڑھا ہے۔ میرے نزدیک یہ دیباچہ خلاق ذہن رکھنے والے ایک بوڑھے آدمی کی داستان ہمت ہے، جس نے اپنے طبع زاد علمی کام کی کارگزاری سنائی ہے۔ یہ دیباچہ مجھے جیمز مرے (James Murrey) کی Oxford English Dictionary کے لیے کی گئی محنت کی یاد دلاتا ہے جو عمر کے سترویں عشرے میں ہفتے میں ۹۰ گھنٹے کام کرتا تھا اور اس نے ایک ایسا کام کیا تھا جو پہلے کیے گئے کسی کام کی توسیع نہ تھا بلکہ اپنی نوعیت کا اولین کام تھا۔ انکل کی تحریریں پڑھنے سے پرانی نہیں ہوتیں بالکل ویسے ہی جیسے پطرس بخاری کے مضامین کہ جب بھی کچھ عرصے کے بعد پڑھیں تو بالکل نئے نئے سے لگتے ہیں۔

انھوں نے ایک بار بتایا کہ کلیات، معلومات، وجوہات وغیرہ الفاظ مذکر ہیں، اگرچہ مؤنث بھی درست ہے۔ میں دونوں طرح استعمال کرتا ہوں۔ ہمزۂ اضافت کے بارے میں بتایا کہ اصل میں مندرجۂ بالا، مذکورۂ بالا، مندرجۂ ذیل وغیرہ درست ہیں۔ اچھے بھلے لوگ ان تراکیب کو ہمزۂ اضافت کے بغیر استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار ’تحریر‘ کی جمع پوچھی تو فرمایا کہ ’تحریرات‘ بھی درست ہے۔ مگر ’تحاریر‘ اور بھی اچھا ہے۔ ’مصداق‘ کی جمع دریافت کی تو ’مصادق‘ بتائی۔ سو میں نے انھیں ابو جان کی کتاب کے دیباچے میں استعمال کیا۔

’’الزبیر‘‘ کے شمارہ ۴، ۲۰۰۴ء میں محترم انیس شاہ جیلانی صاحب نے اپنے خط میں لکھا کہ ’’یگانہ کو مرتب کرنے کا ایک کام مشفق خواجہ نے کر تو دیا لیکن دیانت داری سے کترانا ان کو بھی آتا ہے۔ اقبال سے متعلق یگانہ کے اشعار گول کر گئے، یہ گویا اقبال دوستی میں کیا جاتا ہے۔ پنجابیوں کی اقبال دشمنی کی یہ روش خوب ہے۔‘‘ میں نے انکل سے اس کا ذکر کیا۔ فرمایا ’’معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کلیات کا دیباچہ نہیں پڑھا۔ میں

WWW.KITABOSUNNAT.COM

نے حذف کیے جانے والے کلام کے بارے میں صاف لکھا ہے۔ یگانہ تو آخر آخر میں بزرگ صحابہؓ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے تھے، جس کی پاداش میں لوگوں نے ان کا منھ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر شہر کا چکر لگوایا تھا اور ان کے گھر کا سامان تک لوٹ لیا تھا۔ کیا میں ایسے متعفن اشعار درج کر دیتا؟ بھئی حافظ صاحب! میں صرف وہ کام کرتا ہوں جس سے مجھے آخرت میں فائدہ ملنے کی امید ہوتی ہے۔" یہ بات انھوں نے وفات سے کوئی ایک ہفتہ قبل کہی تھی۔

مشفق خواجہ صاحب کی وفات سے ادب کو کیا نقصان ہوا، یہ تو علم و ادب سے متعلق لوگ ہی بتائیں گے کیوں کہ میں ادب کا آدمی نہیں ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ علم و ادب میں بلا امتیاز و لحاظ دیانت داری، سوز دل کے ساتھ تنبیہ اور بے لوث رہنمائی، متانت و وقار کے ساتھ بے کینہ شگفتہ کلامی، تحریر میں دین و وطن اور مشرقیت کی محبت کے توام ہونے اور رسوخ فی العلم کی ایک نادر بلکہ منحصر بہ فرد روایت اب ختم ہوگئی ہے۔ وہ ادبی نفسانفسی کے اس دور میں سب اہل ادب کا مشترکہ سرمایہ تھے۔

☆

انکل مشفق خواجہ صاحب کی باتیں اور یادیں ایسی نہیں کہ ایک نشست میں بیان کی جاسکیں۔ دل میں غم ہے اور ماحول ان کے بغیر سوگوار اور تنہا۔ محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کے مرتب کردہ اور عطا کردہ کلیات مجید امجد سے ایک شعر پیش کر کے بات ختم کرتا ہوں:

یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
اک موڑ اور مڑ کے دیکھا بے زمانہ تھا

☆☆☆

پہلی اشاعت: "الزبیر" بہاول پور، بابت شمارہ ۱، ۲۰۰۵ء

ڈاکٹر خلیق انجم

ذکرِ خیر مشفق خواجہ کا

یہ مضمون نومبر ۱۹۸۵ء میں اس وقت لکھا گیا تھا جب مشفق خواجہ صاحب اپنی بیگم کے ساتھ دہلی آئے تھے اور مرحوم نے میرے ساتھ قیام کیا تھا۔ (خلیق انجم)

مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات کا مجھے کبھی موقع نہیں ملا تھا لیکن میں انھیں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے ماہنامے 'قومی زبان'، سہ ماہی 'اردو' اور 'قاموس الکتب' کے مدیر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ خواجہ صاحب نے سعادت خاں ناصر کا مؤلفہ تذکرہ 'خوش معرکۂ زیبا' مرتب کیا تھا جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کر کے یہ تذکرہ پاکستان سے منگوایا تھا۔ خواجہ صاحب کے کچھ تحقیقی مضامین بھی پڑھے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو ایک دو خطوط بھی لکھے تھے۔ خواجہ صاحب کے ان ادبی کارناموں کی وجہ سے میرے ذہن میں ان کا تصور ایک ایسے محقق کا تھا جس سے قدیم شاعروں اور ادیبوں کی تاریخ ولادت، تاریخِ وفات، جائے ولادت اور جائے وفات کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو ممکن نہیں اور جس کی زیادہ دیر کی صحبت نارمل انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ میں خود کار بارِ تحقیق کرتا ہوں لیکن محققوں کی صحبت سے بہت خائف رہتا ہوں کیوں کہ اگر آپ گفتگو میں ذرا بے احتیاطی سے کام لیں یا انھیں تھوڑی سی ڈھیل دے دیں تو فوراً بزرگ شاعروں اور ادیبوں کی دروغ گوئی کے قصے بیان کرنے لگتے ہیں۔ ان کے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیتے ہیں اور ان بزرگوں کی زندگی کے کچھ ایسے واقعات بیان کرنے لگتے ہیں کہ اگر ان کی بیویوں کو یہ واقعات معلوم ہو جاتے تو قیامت برپا ہو جاتی اور اگر ان کی زندگی میں واقعات الم نشرح ہو جاتے تو بہت سے بچوں کا شجرۂ نسب بدل جاتا۔ ان بزرگوں کے بعض کارناموں سے حکومت واقف ہو جاتی تو ان عظیم شاعروں اور ادیبوں کی باقی زندگی قید و بند میں گزرتی۔ معاف کیجیے یہ جملۂ معترضہ تھا اور بحرِ طویل میں پڑ گیا تھا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مئی ۱۹۷۹ء میں جب میں کراچی گیا تو ملاقات کے لیے جن بزرگوں کی فہرست بنا کر گیا تھا ان میں مشفق خواجہ صاحب کا نام بھی شامل تھا۔

کراچی پہنچے ہوئے دوسرا ہی دن ہوا تھا کہ صبح ہی صبح ایک ٹیلی فون آیا معلوم ہوا کہ مشفق خواجہ بول رہے ہیں۔ رسمی دعا سلام اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے اطلاع دی کہ وہ تھوڑی دیر میں تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کا نام بزرگوں کی اس فہرست میں لکھا تھا جن سے ملاقات کے لیے مجھے خود جانا تھا۔ کچھ دیر تک تکلف ہوتا رہا۔ خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ وہ تشریف لا رہے ہیں اور میری درخواست تھی کہ آپ میرے بزرگ ہیں اس لیے میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا لیکن ان کے بہت اصرار پر میں خاموش ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ ایک گھنٹے میں تشریف لائیں گے اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور میں ان کے استقبال کے لیے باہر آیا۔ ایک خوب صورت، تندرست، ذہانت سے چمکتی ہوئی آنکھوں والا انتہائی سلیقے کے کپڑے پہنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ میں سمجھا کہ ماموں جان (جن کے ہاں میرا قیام تھا) سے ملنے کوئی صاحب تشریف لائے ہیں، نوجوان نے بہت شائستہ اور دھیمی آواز میں بتایا کہ وہ مشفق خواجہ ہیں۔ حیرت سے میری چیخ نکل گئی۔ مشفق خواجہ! ہم دونوں بہت گرم جوشی سے گلے لگے۔ خواجہ صاحب کے ادبی کارناموں نے میرے ذہن میں ان کی جو تصویر بنائی تھی وہ تو ساٹھ ستر سالہ بزرگ کی تھی اس لیے میں نے ٹیلی فون پر انتہائی ادب اور احترام سے بات کی تھی، یہاں معاملہ برعکس نکلا۔ خواجہ صاحب عمر میں مجھ سے چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ بعد میں گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ واقعی میرے بزرگ ہیں اور انھوں نے جہانِ رنگ و بو میں مجھ سے تین دن قبل آنکھیں کھولی تھیں۔ میں ہندوستان کے جن محققین سے واقف تھا انھیں دیکھ کر میں نے ہمیشہ یہ دعا مانگی تھی کہ اے خدائے بزرگ و برتر اور اے ہماری قسمتوں کے بنانے والے اگر تو نے میری قسمت میں محقق ہونا ہی لکھ دیا ہے تو شوق سے مجھے محقق بنا لیکن محقق صورت نہ بنائیو۔ میری یہ دعا تو قبول ہو گئی لیکن کہیں کچھ گڑبڑ ہونے کی وجہ سے یہ دعا مشفق خواجہ صاحب کے حساب میں پڑ گئی۔ مجھے آج تک پہلی ملاقات کے وقت خواجہ صاحب کا حلیہ یاد ہے۔ میری توقع کے خلاف کیسا شگفتہ چہرہ تھا۔ چہرے پر دور دور تک تحقیق کی مردنی کا نشان نہیں بلکہ جدید ترین تخلیقی ادب کے فنکار کی شگفتگی اور تازگی تھی۔

مشفق خواجہ صاحب سے مختلف اوقات میں گفتگو کے دوران کی ذاتی زندگی کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اور کچھ اِدھر اُدھر سے فراہم ہوئیں ان کی بنیاد پر خواجہ صاحب کا ایک مختصر سا سوانحی خاکہ لکھ رہا ہوں تا کہ محققین کے کام آ سکے اور وہ خواجہ صاحب کی دروغ گوئیوں کی نشان دہی کر سکیں۔

خواجہ صاحب بہت ہی فرمانبردار اور تابع فرمان قسم کے شوہر ہیں۔ ان کی بیوی لکھنؤ کی ہیں اور خواجہ صاحب ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے لیکن طور طریق، رہن سہن اور خاص طور سے گفتگو کا انداز اور الفاظ کا تلفظ بالکل لکھنؤ والوں کا ہے یعنی 'اقبال کو واقعی اقبال' کہتے ہیں۔

خواجہ صاحب کشمیری النسل ہیں۔ چھ سات نسلوں پہلے ان کے آبا و اجداد کشمیر سے لاہور آئے تھے اور یہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ صاحب کا گھرانا علمی ہے۔ ان کے خاندان نے بہت سے ادیب اور عالم پیدا کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کے دادا خواجہ کریم بخش سرکاری ملازم تھے لیکن اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب کا انھوں نے بہت اچھا مطالعہ کیا تھا۔ صاحب ذوق انسان تھے۔ جن حضرات کے دم سے لاہور کی ادبی محفلوں کی رونق قائم تھی، ان میں خواجہ کریم بخش، ان کے دو سگے بھائی خواجہ رحیم بخش، خواجہ امیر بخش اور رشتے کے ایک بھائی مولوی احمد دین کے نام شامل تھے۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی آپ بیتی 'خون بہا' میں لکھا ہے:

> ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے مکان کی بیٹھک میں برسوں تک ہر شام وہ لوگ جمع ہو جاتے تھے، جن میں سے ایک ایک آسمانِ ادب کا درخشاں ستارہ تھا۔ حکیم شہباز دین ایک بہت ہی لاغر اور نحیف انسان تھے، مگر ان کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی...... ان اربابِ علم و ادب کی دید کے شائق دور دور سے ہمارے ہی مکان پر آتے اور ان کی صحبت سے اکتسابِ شرف کرتے۔ سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن، مفتی عبداللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے جو قریب قریب ہر روز شام کو اس بیٹھک میں جمع ہو جاتے...... خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، سید محمد شاہ وکیل اور خلیفہ نظام الدین اگرچہ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظرِ عام پر نہ آئے مگر وہ اس مجلس کی روحِ رواں تھے۔ ان کی جرأت اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں وہ حصہ لیا جو ان کے اپنے جوہرِ کمال کے تقاضات ارتقا سے کسی طرح کم نہیں۔ اس زمانے میں سر محمد اقبال جب تک اپنا کلام پہلے ان بزرگوں کو سنا نہ لیتے تھے، اسے کسی مجلس عام میں نہ پڑھتے تھے۔''

WWW.KITABOSUNNAT.COM

(خوں بہا، حکیم احمد شجاع طبع دوم، لاہور ۱۹۵۱، ص ۸۳۔ ۱۹۸۲ء بحوالہ نقوش، اقبال نمبر ۲، ص ۳۸۰)

یہ محفلیں پہلے حکیم شہباز دین، پھر حکیم امین الدین سرکاری وکیل اور آخر میں 'للّی لاج' میں منعقد ہونے لگی تھیں۔ 'للّی لاج' ہمارے مشفق خواجہ صاحب کے دادا مرحوم خواجہ کریم بخش اور ان کے دو بھائیوں خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش کی مشترکہ ملکیت تھا۔ مشفق صاحب کے والد خواجہ عبدالوحید صاحب نے 'اقبال کے حضور' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو نقوش (اقبال نمبر ۲، شمارہ ۱۲۳، دسمبر ۱۹۷۷ء) کے چالیس صفحات پر شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں انھوں نے ان ادبی صحبتوں کی تفصیل بیان کی ہے جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۸ء تک 'للّی لاج' میں منعقد ہوئی تھیں اور جن میں علامہ اقبال اور اس عہد کی بیشتر ادبی شخصیتیں شرکت کرتی تھیں۔

خواجہ امیر بخش کا ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جب خواجہ کریم بخش سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر ریاست دھار میں چلے گئے اور خواجہ رحیم بخش کو ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پنجاب جانا پڑا تو یہ محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔ مشفق صاحب کے والد خواجہ عبدالوحید کی ولادت ۳ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوئی، ان محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے وحید صاحب لکھتے ہیں:

> ”بچپن کی بہت سی باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ 'للّی لاج' میں میرے بزرگوں اور ان کے دوستوں کی محفلیں آدھی رات تک گرم رہتی تھیں اور ان محفلوں میں علامہ اقبال، سر عبدالقادر اور سر شہاب الدین وغیرہ آیا کرتے تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو اس علمی و ادبی ماحول میں دیکھا۔ ہمارے بزرگوں نے بچوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ جب تک چاہیں ان محفلوں میں موجود رہیں۔ ہم بچے اکثر دیر دیر تک ان محفلوں میں بیٹھے رہتے تھے۔ اگرچہ اپنے بزرگوں کی بہت کم باتیں سمجھ میں آتی تھیں، پھر بھی یہ باتیں سننے سے مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ یہ اس کا نتیجہ تھا کہ مجھے کم عمری میں لکھنے پڑھنے کا شوق ہو گیا اور اہل علم حضرات کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا سلیقہ آ گیا۔ بچپن سے لے کر اٹھارہ برس کی عمر تک ان محفلوں کا عینی شاہد رہا ہوں۔ ابتدا میں محض تماشائی تھا، لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی اور شعور پختہ ہوتا گیا، میں شرکائے محفل کی گفتگو سے مستفید ہونے لگا۔“

(نقوش، اقبال نمبر ۲، شمارہ ۱۲۳، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۸۱)

WWW.KITABOSUNNAT.COM

خواجہ عبدالوحید کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر بہت قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ان زبانوں کے قدیم اور جدید ادب کے علاوہ مختلف علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔

انھیں اسلامیات سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اسلامیات کے مختلف موضوعات پر انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ انگریزی میں ان کی ایک کتاب "Islamic Background of Modern Sciences" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ عبدالوحید صاحب نے قرآن، حدیث اور دیگر اسلامی علوم کے علاوہ جدید سائنسی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کتاب کو مسلم دنیا میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب کی انگریزی میں ایک اور کتاب "Place of Women in National Life" ہے۔ اس کتاب میں قوم کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں عورت کے رول اور اس کے مرتبے پر سماجیات کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور اسلام میں عورت کے حقوق اور اس کے فرائض پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب نے اردو اور انگریزی میں متعدد مقالے لکھے ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالقوی لقمانی اور بعض دوستوں کے ساتھ مل کر 'اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس انسٹی ٹیوٹ کا مقصد تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں اسلامی تمدن اور تاریخ سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ علامہ اقبال بھی اس انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں خواجہ عبدالوحید نے چند دوستوں کی مدد سے یوم اقبال منانے کا فیصلہ کیا تاکہ "ایک طرف تو علامہ اقبال کی ادبی و قومی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور دوسری طرف علامہ کے پیغامات کو عام کیا جا سکے۔" یہ تقریب ۶ ستمبر کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام لاہور میں منعقد ہوئی۔ جلسے کی دو نشستیں ہوئیں جن میں علامہ کے فکر و فن پر مقالے پڑھے گئے۔

ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی میں ان کے فلسفے اور ان کے فن کو سمجھنے کی پہلی کامیاب کوشش مشفق خواجہ صاحب کے بزرگوں نے کی۔ مشفق صاحب کے والد نے علامہ اقبال پر جو پہلا سیمینار منعقد کیا تھا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے رشتے کے ایک چچا مولوی محمد دین نے علامہ اقبال پر ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۹۲۳ء میں لاہور میں چھپی لیکن بعض وجوہ سے شائع نہ ہو سکی۔ اس کے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیے گئے۔ کسی طرح دو نسخے بچ گئے تھے۔ محمد دین صاحب نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا تھا۔

مشفق خواجہ صاحب نے ان دونوں ایڈیشنوں کو بنیاد بنا کر تیسرا ایڈیشن تیار کیا اور ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اسے شائع کیا۔ اس کتاب سے پہلے علامہ پر اردو میں کچھ مضامین اور انگریزی میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی لیکن اردو میں پہلی کتاب مولوی محمد دین کی 'اقبال' ہی تھی۔ علامہ اقبال کی کتابوں کے پہلے ایڈیشن مشفق خواجہ صاحب کے نانا میر امیر بخش صاحب نے اپنے پریس میں چھاپے تھے۔ اس پریس کا نام کریمی پریس تھا۔ ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال کی رہنمائی میں انڈین اورینٹل کانفرنس کے انداز پر پروفیسر محمد اقبال اور ان کے کچھ ساتھیوں نے 'ادارۂ معارف اسلامیہ' قائم کیا۔ اس ادارے کی مجلس عاملہ کے صدر سر شیخ عبدالقادر اور پروفیسر محمد اقبال سیکرٹری اور خازن منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، پروفیسر محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، ملک عبدالقیوم اور خواجہ عبدالوحید کو اس ادارے کا جوائنٹ سیکرٹری بنا دیا گیا۔

مولانا احمد علی لاہوری نے لاہور میں 'انجمن خدام الدین' قائم کی تھی۔ مولانا احمد علی نے اس ادارے کے زیر اہتمام انگریزی میں پندرہ روزہ 'اسلام' جاری کیا جس کا پہلا شمارہ ۷ جون ۱۹۳۵ء کو اور آخری شمارہ مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس پندرہ روزہ اخبار کی ادارت کے لیے مولانا احمد علی کی نگاہ انتخاب خواجہ عبدالوحید پر پڑی۔ اس سلسلے میں خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں:

> "انجمن کے بانی حضرت مولانا احمد علی کے ارشاد پر اس کی ادارتی ذمہ داریاں میں نے سنبھالیں۔ اس اخبار سے حضرت علامہ بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اسے باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور اپنے مشوروں سے نوازتے تھے۔ میں جو اداریے اور شذرات لکھتا تھا، اکثر چھپنے سے پہلے حضرت علامہ کو سنا دیتا تھا۔ وہ جو ترمیم و اصلاح تجویز فرماتے، میں اس کے مطابق اپنی تحریروں میں تبدیلی کر دیتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے اداریے کے موضوع کا تعین فرمایا اور میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔"
>
> (نقوش، اقبال نمبر ۲، شمارہ ۱۲۳، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۹۲)

۱۹۷۹ء میں خواجہ عبدالوحید کا انتقال ہو گیا۔ لاہور میں ایک بہت بڑا اور بہت مشہور پریس تھا 'کریمی پریس'، یہی وہ پریس ہے جس نے علامہ اقبال کی کتابوں کے پہلے ایڈیشن شائع کیے تھے۔ متعدد رسالے مثلاً شباب اردو، نیرنگ خیال، عالمگیر وغیرہ اسی پریس میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے مالک تھے میر امیر بخش صاحب، ان ہی کی صاحبزادی سے خواجہ عبدالوحید کی شادی ہوئی تھی یعنی یہ خاتون مشفق خواجہ صاحب کی والدہ تھیں۔ میر بخش صاحب کا گھرانہ بھی علمی تھا۔ محمد الدین فوق نے 'تاریخ اقوام کشمیر' میں اس خاندان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مشفق خواجہ صاحب کے خاندان میں یوں تو اور بہت ایسے افراد ہیں جن کی علمی اور ادبی خدمات کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن اب میں اس خاندان کے صرف دو اور بزرگوں کے بارے میں چند باتیں عرض کروں گا۔ وہ بزرگ ہیں خواجہ عبدالمجید۔ یہ مشفق صاحب کے سگے تایا تھے۔ چار جلدوں میں مشہور لغت 'جامع اللغات' کے مؤلف یہی بزرگ ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کے ایک اور تایا زاد بھائی ہیں کرنل خواجہ عبدالرشید۔ رشید صاحب نے انگریزی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مکتبہ 'برہان' دہلی سے ان کی ایک کتاب 'معارف الآثار' شائع ہو چکی ہے۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں مشفق خواجہ نے آنکھ کھولی۔ علم و ادب کی روایت خواجہ صاحب کو ورثے میں ملی ہے۔ ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ گھر میں علمی ماحول ہے۔ مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں ہیں۔ اس عہد کے بیشتر ادبی رسالے گھر میں آتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس ماحول کے سانچے میں ڈھل گئے۔ کم عمری ہی سے مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا۔ مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ لاہور میں ایک اسکول تھا سناتن دھرم ہائی اسکول، اس میں مشفق خواجہ صاحب کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ تقسیم ہند کے وقت مشفق صاحب چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے۔ اس وقت مشفق صاحب کے والد محکمۂ اطلاعات میں ملازم تھے۔ ان کا لاہور سے کراچی تبادلہ ہو گیا اور وہ بیوی بچوں کو لے کر کراچی آ گئے اس لیے مشفق صاحب کی باقی تعلیم کراچی ہی میں ہوئی۔

مشفق خواجہ صاحب کی شادی ۱۹۶۴ء میں آمنہ صدیقی صاحبہ سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ان کا نام آمنہ مشفق ہو گیا۔ آمنہ صاحبہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔ اب بھی ان کے خاندان کے بعض افراد لکھنؤ میں موجود ہیں۔ وہ کراچی کے سرسید گرلز کالج میں اردو کی لیکچرار ہیں اور خود بھی ادیب ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'افکارِ عبدالحق' شادی سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی تھی کہ ہندوستان میں اس کے جعلی ایڈیشن شائع ہوئے۔

خواجہ عبدالوحید کے قریبی دوستوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم وغیرہ جیسے حضرات تھے۔ یہ لوگ اکثر خواجہ صاحب کے گھر آتے تھے۔ ان کی صحبتوں نے مشفق صاحب کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ مشفق صاحب نے ۱۹۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے اسلامیہ کالج، کراچی میں داخلہ لیا۔ اس سال انھوں نے کالج میگزین میں ایک مضمون لکھا جو اردو زبان کے بارے میں تھا۔ یہ ان کا پہلا ادبی مضمون تھا لیکن اس سے پہلے مشفق صاحب بچوں کے لیے بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء

WWW.KITAABISTAN.COM

تک بچوں کے لیے ان کی دس بارہ کتابیں چھپ چکی تھیں۔ 'امروز' کراچی میں بچوں کے لیے مشفق صاحب کی بہت سی تحریریں شائع ہوئیں۔ خواجہ صاحب آنرز کر رہے تھے اور مطالعے کے لیے اکثر انجمن ترقی اردو پاکستان کی لائبریری میں جاتے تھے، وہاں مولوی عبدالحق سے ملاقات ہوئی اور پھر اکثر خواجہ صاحب مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ مولوی صاحب نوجوان طالب علم کی ذہانت اور علمیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ مولوی صاحب نے مشفق صاحب کو انجمن کے ماہانہ جریدے 'قومی زبان' کا اعزازی مدیر مقرر کر دیا۔ خواجہ صاحب نے مولوی صاحب کو اپنے کام سے اتنا متاثر کیا کہ کچھ ہی عرصے بعد سہ ماہی 'اردو' کی ادارت بھی ان ہی کو سونپ دی گئی۔

جب ۱۹۵۸ء میں خواجہ صاحب نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کر لیا تو مولوی صاحب نے انھیں 'قاموس الکتب' کا مدیر بھی مقرر کر دیا اور اس طرح انھیں باقاعدہ انجمن کے عملے میں شامل کر لیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انجمن میں بہت کم لوگ ملازم تھے اور علمی شعبے میں تو مولوی صاحب کے علاوہ شاید اور کوئی نہیں تھا اس لیے انجمن کے شعبۂ تحقیق اور مطبوعات کی نگرانی بھی خواجہ صاحب کے ذمے کر دی گئی۔

انجمن ترقی اردو پاکستان میں خواجہ صاحب کو ایک ایسا کام کرنے کا موقع ملا جس سے انھیں زبان پر قدرت حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ وہ کام یہ تھا کہ مولوی عبدالحق مرحوم 'لغتِ کبیر' مرتب کر رہے تھے۔ بنیادی مسودہ تیار ہو چکا تھا۔ الفاظ کے جو کارڈ بنائے گئے تھے وہ خواجہ صاحب پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب مسودے میں ان کا اندراج کرتے جاتے۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک خواجہ صاحب نے انجمن میں کام کیا اور پھر ملازمت سے مستعفی ہو کر خود کو علمی اور ادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ اس دوران پانچ سال تک خواجہ صاحب کو مولوی صاحب سے قریب رہنے کا موقع ملا۔ خواجہ صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ ادبی زندگی کے آغاز میں انھیں مولوی عبدالحق کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں مولوی صاحب کی تربیت کو بہت دخل ہے۔ خواجہ صاحب یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان کی ذہنی تربیت میں بالواسطہ طور پر جن بزرگ ادیبوں نے حصہ لیا ان میں شوکت سبزواری، شاہد احمد دہلوی، سید ہاشمی فریدآبادی، جوش ملیح آبادی اور شان الحق حقی صاحب وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شوکت سبزواری مرحوم اردو بورڈ کی لغت کے ایڈیٹر مقرر ہو کر کراچی آئے تھے۔ چونکہ یہ لغت انجمن ترقی اردو پاکستان کی نگرانی میں مرتب ہو رہی تھی اس لیے شوکت صاحب انجمن کے دفتر ہی میں کام کرتے جہاں خواجہ صاحب کو شوکت صاحب سے قربت کا موقع ملا۔

زبان کے معاملے میں شان الحق حقی صاحب سے بھی خواجہ صاحب استفادہ کرتے رہے۔ یہ ان [illegible] ہے کہ اس حقیقت کا بار بار اعتراف کرتے ہیں۔

۱۔ خواجہ صاحب کی پہلی کتاب 'خوش معرکۂ زیبا' ہے۔ یہ سعادت خاں ناصر کا تذکرہ ہے جو ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا تھا خواجہ صاحب نے اس تذکرے کا سائنٹفک انداز میں تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے۔ تذکرے پر مفصل مقدمہ لکھا ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے اس تذکرے کی پہلی جلد ۱۹۷۰ء میں اور دوسری ۱۹۷۱ء میں شائع کی تھی۔

۲۔ خواجہ صاحب نے 'پرانے شاعر، نیا کلام' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو سہ ماہی 'غالب' کراچی میں بالاقساط شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں اردو کے ان کلاسیکی شاعروں پر مضامین لکھے ہیں جن پر اردو میں ابھی تک کسی نے نہیں لکھا اور کسی نے لکھا بھی تو بہت سرسری سا۔ ان شاعروں میں خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ، جسونت سنگھ پروانہؔ، فضل علی ممتازؔ اور ولی اللہ محبؔ وغیرہ شامل ہیں۔ خواجہ صاحب نے ان قدیم شاعروں کے مفصل سوانح لکھے ہیں اور ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔

۳۔ مولوی احمد دین نے علامہ اقبال کی زندگی میں ان پر 'اقبال' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جسے مشفق خواجہ صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس کی تفصیل اس مقالے کے شروع میں بیان کر دی گئی ہے۔

۴۔ 'جائزہ مخطوطات اردو' اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا اور اعلیٰ ترین تحقیقی کام ہے۔ خواجہ صاحب نے ۱۹۷۴ء میں پاکستان کے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی کتب خانوں میں محفوظ قلمی نسخوں کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ یہ کام دس جلدوں میں شائع ہوگا۔ ۱۲۴۸ صفحات پر مشتمل پہلی جلد ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہو چکی ہے، باقی نو جلدیں مقتدرہ قومی زبان شائع کر رہا ہے۔ ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل دوسری جلد طباعت کی منزلوں سے گزر رہی ہے اور بہت جلد شائع ہونے والی ہے۔

'جائزہ مخطوطات اردو' میں شامل تمام مخطوطات کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس فہرست میں شامل ہر مخطوطے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اہم ہے یا غیر اہم اور اس سلسلے میں دلائل پیش کیے ہیں۔ مخطوطے کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کے اور نسخے دنیا کی کس کس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان نسخوں کے بارے میں ممکن معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اگر وہ مخطوطہ شائع ہو چکا ہے تو مطبوعہ

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ایڈیشنوں کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ خواجہ صاحب نے مخطوطات کے مصنفوں کے سوانح لکھے ہیں اور ان پر جو کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں، ان کی فہرست بھی شامل کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان محققین کے لیے بڑی نعمت بن گئی ہے جو قدیم شاعروں اور ادیبوں پر کام کرتے ہیں۔

۵۔ 'غالب اور صفیر بلگرامی' کراچی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مشفق صاحب نے بہت تحقیق اور دیدہ ریزی سے صفیر بلگرامی کے سوانح مرتب کیے ہیں۔ غالب کے نام صفیر بلگرامی صاحب، عالم مارہروی، شاہ عالم مارہروی اور صفیر بلگرامی کے نام غالب کے خطوط مرتب کر کے شامل کیے ہیں۔ غالب و صفیر کی ملاقات، دیباچہ رشحاتِ صفیر اور قطعۂ غالب انشائے سبدِ گل، جلوۂ خضر، مرقعِ فیض اور تنبیہ صفیر بلگرامی، محشرستان وغیرہ کے عنوان سے مختلف ابواب میں صفیر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۶۔ مشفق صاحب نے ۱۹۸۰ء میں 'تخلیقی ادب' کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب تک اس کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ 'تخلیقی ادب' میں ہم عصر ادب کے جائزے اور اس کا انتخاب شامل ہے۔ یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کے بعد کے دوسرے ایڈیشن شائع کرنے پڑے۔ تحقیق ادب کے جائزوں اور ادبی منتخبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کی نظر صرف قدیم ادب ہی پر نہیں ہے بلکہ جدید ادب کا بھی انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔

۷۔ تحقیق نامہ۔ پاکستان اور ہندوستان کے ادبی رسالوں میں مشفق صاحب کے تیس چالیس مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ مضامین کتابی صورت میں 'تحقیق نامہ' کے نام سے شائع کیے جا رہے ہیں۔

۸۔ ابیات۔ یہ مشفق صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۸ء تک کی شاعری کا انتخاب شامل ہے۔ مشفق صاحب اور شاعری کا معاملہ بہت دلچسپ ہے، انھوں نے اس فن میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی اور کسی کو بنظر اصلاح اپنا کلام نہیں دکھایا۔ مشاعرے میں کلام پڑھنا تو دور کی بات ہے وہ کبھی مشاعرہ سننے بھی نہیں گئے۔ نجی صحبتوں میں بھی کبھی اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ تحقیق نے ان کی شاعری کو دبا دیا ہے۔ اگر محقق نہ ہوتے تو اردو کے اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا۔

گزشتہ کچھ برسوں میں پاکستان میں کالم نگاری کے فن نے بہت ترقی کی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ جو تحقیق کا انتہائی خشک کام کرتے ہیں، کالم بھی لکھتے ہیں۔ پاکستان کے دو تین بہترین کالم

نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں وہ محققوں میں تو محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ورنہ عام لوگ انھیں صرف کالم نگار ہی سمجھتے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد کالم نگار ہیں جن کے کالم ہندوستان کے رسالوں اور اخباروں میں نقل ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے اردو والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھیں ان کے جملے کے جملے یاد ہیں۔ ادبی محفلوں میں اکثر ان کے فقرے دہرائے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا کالم نگار بننا محض اتفاق ہے۔ وہ کتابوں پر جو تبصرے کرتے تھے، ان میں طنز و مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہوتی تھی۔ 'اردو ڈائجسٹ' کے ایڈیٹر اور مشہور ادیب الطاف حسن قریشی نے ان تبصروں سے اندازہ لگایا کہ مشفق صاحب میں اعلیٰ درجے کا کالم نگار چھپا ہوا ہے۔ قریشی صاحب نے کراچی سے جب روزنامہ 'جسارت' شائع کرنا شروع کیا تو مشفق صاحب سے کالم لکھنے کی فرمائش کی۔ مشفق صاحب پہلے تو راضی نہیں ہوئے لیکن قریشی صاحب کے اصرار نے انھیں مجبور کر دیا اور وہ کالم لکھنے لگے۔ توقع کے خلاف یہ کالم بہت مقبول ہوئے۔ ڈیڑھ دو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بڑھتی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے خواجہ صاحب نے کالم نگاری ترک کر دی۔ جب صلاح الدین صاحب روزنامہ 'جسارت' کے ایڈیٹر ہوئے تو انھوں نے اصرار کر کے 'جسارت' کے لیے کالم لکھوائے۔ اس دفعہ روزانہ کی بجائے ہفتے میں تین دن، پھر دو دن اور بالآخر ہفتے میں ایک بار لکھنے لگے۔ صلاح الدین صاحب نے جب ہفت روزہ 'تکبیر' جاری کیا تو مشفق صاحب 'تکبیر' کے لیے کالم لکھنے لگے۔

ایک دفعہ میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا تھا کہ تحقیق، شاعری اور کالم نگاری یہ تینوں کام ایک دوسرے سے مختلف بلکہ کچھ حد تک متضاد ہیں، آپ ایک ساتھ یہ تینوں کام کیسے کر لیتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اس سوال کا بہت دلچسپ جواب دیا تھا، آپ بھی سن لیجیے۔ انھوں نے کہا کہ میں تحقیق کے ذریعے بزرگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، شاعری کرتا ہوں تاکہ اپنی ذات کو سمجھ سکوں اور کالم لکھتا ہوں تاکہ اپنے عہد کے ادیبوں اور ان کی تحقیقات کے بارے میں سچائیاں بیان کر سکوں۔

خواجہ صاحب کی ذاتی لائبریری میں سترہ ہزار سے زائد کتابیں ہیں ان میں سے کچھ کتابیں تو انھیں اپنے دادا اور والد مرحوم سے ورثے میں ملی تھیں اور باقی کتابیں ان کی خود فراہم کی ہوئی ہیں۔ ادبی رسالوں کے بے شمار فائل ہیں۔ خواجہ صاحب کے پاس ایسی کتابوں کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے، جن پر مصنفین کے دستخط ہیں اور جو خود مصنفین نے انھیں پیش کی ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کی لائبریری اردو کی واحد لائبریری ہے جس میں اتنی بڑی تعداد میں اردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں پچھلے پچیس سال کے اخباروں کے تراشے محفوظ ہیں۔ ان تراشوں کا اس طرح انڈکس بنایا گیا ہے کہ ایک منٹ میں مطلوبہ تراشہ مل جاتا ہے۔

مشفق صاحب کے گھر میں گیارہ کمرے ہیں۔ دس کمروں میں کتابیں رہتی ہیں اور ایک کمرے میں خواجہ صاحب اور ان کی بیوی۔ اس لائبریری میں کتابیں سلیقے سے رکھنے کے لیے انھوں نے چار پانچ آدمیوں کو رکھا ہوا ہے۔

پاکستان کے جن محققین کو ہندوستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے اور جن کے کام کی قدر کی جاتی ہے ان میں مشفق خواجہ صاحب کا نام سر فہرست ہے۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب بھی ہندوستان کے کسی ادیب کو پاکستان کی کوئی کتاب یا رسالہ درکار ہوتا ہے وہ مشفق صاحب ہی سے رجوع کرتا ہے اور مشفق صاحب بخوشی یہ خدمت بجالاتے ہیں۔ اگرچہ ان فرمائشوں کا بوجھ ان کی جیب پر بہت زیادہ پڑ جاتا ہے۔

ہندوستان میں خواجہ صاحب کے قاری اور مداح کئی طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو خواجہ صاحب کو محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں، تحقیقی موضوعات پر ان کی کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کی خداداد تحقیقی صلاحیتوں کی داد دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خواجہ صاحب کو صف اول کا کالم نگار سمجھتے ہیں اور ان کے جملے کے جملے یاد کیے ہوئے ہیں اور تیسرے وہ جو 'تحقیقی ادب' کے حوالے سے ادبی صحافت میں ان کی مہارت، سلیقے اور حسن انتخاب کے قائل اور مداح ہیں۔

خواجہ صاحب کی ولادت لاہور میں ہوئی۔ بچپن میں کراچی آ گئے اور یہیں ساری زندگی گزری۔ تقریباً چالیس سال سے کراچی میں ہیں۔ اس دوران صرف دو یا تین دفعہ اپنے وطن یعنی لاہور گئے ہیں۔ خواجہ صاحب کا پاکستان کے جغرافیے کا علم اٹلسی ہے۔ اگر اٹلس نہ ہوتا تو انھیں ہرگز یہ علم نہ ہوتا کہ کراچی سے باہر بھی دنیا بستی ہے۔ غرض یہ ہے کہ خواجہ صاحب سفر سے بہت ڈرتے ہیں۔

گزشتہ پانچ چھ سال سے خواجہ صاحب کے بہت سے دوست اور مختلف ادبی تنظیمیں انھیں ہندوستان آنے کی دعوت دے رہی تھیں لیکن 'گل محمد' اپنی جگہ سے نہیں ہلتے تھے۔ خواجہ صاحب نے معذرت کے جتنے خطوط لکھے ہیں اردو میں شاید ہی کسی اور ادیب نے لکھے ہوں۔ اس دفعہ نہ جانے خدا نے ان کے دل میں کیا ڈالی کہ وہ سچ مچ دلی آ گئے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر کئی اداروں نے ان کے اعزاز میں جلسوں کا انتظام کر لیا تھا، صرف تاریخ طے کرنی تھی۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء کی صبح ڈھائی بجے خواجہ صاحب اور بیگم آمنہ مشفق دلی تشریف لائے۔ اسی دن شام کو خواجہ صاحب کو علامہ انور صابری مرحوم کی یاد میں ہونے والے ایک بہت بڑے پبلک جلسے کی صدارت کرنی تھی۔ اس جلسے کے بڑے بڑے اشتہار شہر میں لگائے گئے تھے۔ دلی اردو اکادمی

کے زیرِ اہتمام سہ روزہ سیمینار منعقد ہو رہا تھا جس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں سے تقریباً تیس اسکالر آئے ہوئے تھے۔ ۲۷ اکتوبر کو ایک نشست کی صدارت خواجہ صاحب کو کرنی تھی۔ سیمینار کے جو دعوت نامے شائع ہوئے تھے، ان میں خواجہ صاحب کی صدارت کا اعلان کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب کے شیدائی دونوں جلسوں میں پہنچے بلکہ جوق در جوق پہنچے لیکن خواجہ صاحب دونوں میں سے کسی جلسے میں نہیں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب ادبی جلسوں میں شرکت کے قائل نہیں ہیں۔ بہت اصرار کیا گیا لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان والے خواجہ صاحب سے اپنی محبت کا اظہار کس طرح کریں۔ بہت غور و خوض کے بعد دوست اس نتیجے پر پہنچے کہ تقریری اعزاز تو خواجہ صاحب کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں لیکن تحریری اعزاز میں ان کی پسند، مرضی اور نامرضی سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خدا بھلا کرے مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے جنرل مینجر شاہد علی خاں صاحب کا کہ برے وقت میں اکثر ہمارے کام آتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ بھی انھوں نے دستِ تعاون بڑھایا اور ایک نہیں دو کتابیں چھاپنے پر راضی ہو گئے۔ یہ دو کتابیں ہیں ایک تو خواجہ صاحب کی 'غالب اور صفیر بلگرامی' کا ہندوستانی ایڈیشن اور دوسری خواجہ صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ 'مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ' یہ فیصلہ ہوا ۵ نومبر کو اور ۲۳ نومبر ۱۹۸۵ء کو یہ دونوں کتابیں چھپ کر تیار ہو گئیں سترہ دن میں اس طرح کی دو کتابیں چھاپ دینا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ شاہد علی خاں صاحب اکثر اس طرح کے معجزے دکھا کر ہمارے دلوں پر اپنی عظمت اور کارگزاری کے سکے پہ سکے بٹھاتے ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے اور اس طرح کے معجزے دکھاتے رہنے کی توفیق دے۔

ڈاکٹر مظفر علی سید

مشفق خواجہ اور عصری ادب

کہتے ہیں کہ زندگی میں ایک جیسی خوشی خال خال ہی دوبارہ نصیب ہوتی ہے جب کہ ملتے جلتے مصائب بار بار پیش آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ خامہ بگوش کے کالم منتخب کرنے کا مزید ایک موقع، مرتب کے لیے، اس شیرینی دیگر کی طرح پرکشش ہے جو شکر کے حریص (یا مریض) کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔

چونکہ پہلا تجربہ زیادہ تر خوش گوار ثابت ہوا تھا اس لیے ''یہی اور'' (more of the same) کی صدا لگانا پڑی، انجام جو بھی ہو۔ البتہ مصنفِ محترم کا پہلی جلد کے دیباچے میں یہ لکھنا کہ انتخاب کی ذمہ داری اس نیاز مند نے ''قبول کر لی تھی'' محض ان کی منکسر المزاجی کا آئینہ دار تھا۔ اصل میں ان سے پوچھا تھا کہ آج کل جب کہ ہر الٹا سیدھا کالم نگار اپنے کالموں کے تابڑ توڑ مجموعے چھاپتا چلا جاتا ہے، آپ کو کیا موانع درپیش ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ کالموں کی تعداد پچھلے دس گیارہ برسوں میں بہت زیادہ ہو چکی ہے اور اب یا تو کوئی ثروت مند مربی ہاتھ لگے یا پھر سرکاری خزانے سے اپنا حصہ وصول ہو، تب کہیں جا کر کام بنے۔ پوچھا کہ انتخاب کے بارے میں کیا خیال ہے جب کہ جامعہ ملیہ دہلی والے اس کے خواہش مند بھی ہیں۔ کہا کہ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا کالم رکھوں، کون سا چھوڑ دوں؟ اس موقعے پر یہ جاں نثار آڑے آنے کو تیار ہوا، بشرطیکہ دیباچہ بھی وہی لکھے کہ آخر انتخاب کی محنت کا کچھ عوضانہ بھی تو ہو۔ اب یوں تو مجلہ ''تخلیقی ادب'' کی ادارت اور مکتبۂ اسلوب کے پرچم تلے علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے دور میں، ہم محنت کشوں کا حق الخدمت ادا کرنے کے سلسلے میں، انھیں کبھی نادہندہ نہیں پایا تھا لیکن شاید یہ معاوضہ انھیں استحقاق سے زیادہ محسوس ہوا۔ یہ گمان بھی گزرا کہ آج کل تنقید میں ردِ تشکیل کا بہت تذکرہ ہوتا ہے، کہیں یہ بے مروت آدمی اس ساری عمارت کو جو سالہا سال میں تعمیر ہوئی ہے، اپنے دیباچے سے مسمار کر کے نہ رکھ دے۔

ظاہر ہے کہ یہ بات مزاحاً کہی گئی تھی کہ ان دنوں سنجیدہ ترین باتیں مزاح ہی مزاح میں کہی جا سکتی ہیں۔ تاہم اس گمان یا خوش گمانی نے راقم کو دیر تک گومگو میں ڈالے رکھا۔ انتخاب ہو چکا بلکہ اس کی کمپوزنگ بھی مکمل ہو گئی لیکن دیباچے کے لیے جامعہ ملیہ کی ڈیڈ لائن ایک مرتبہ ملتوی ہونے کے بعد بھی گزرنے لگی تو بالآخر یہ طے ہوا کہ ہفتے بھر میں دیباچہ نہ ملا تو کتاب اس کے بغیر ہی شائع کر دی جائے گی۔ اگرچہ آخری مہلت کے آٹھ مہینے بعد اب یہ دھمکی اتنی سخت ثابت ہوئی کہ اس ناتواں کو بیماری نے دبوچ لیا اور انتخاب خامہ بگوش کے

اپنے ''غلط نامے'' کے ساتھ چھپ کر بھی آ گیا۔ یقیناً اس دوران میں، جل تو جلال تو کا ورد خضوع و خشوع کے ساتھ جاری رہا ہوگا۔

بعد میں البتہ انتظار حسین نے اس کوتاہی کو فہمیدہ ریاض کے ''فضیحتے'' کے ساتھ پرو دیا (جو ''زندہ بہار'' کا دیباچہ شائع ہونے پر اچھالا گیا تھا)۔ اپنے کالم ''عطرِ فتنہ'' (عطر کم، فتنہ زیادہ) میں انھوں نے خامہ بگوش کی دانش مندی کو سراہا جس کی وجہ سے ''سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔'' یہ الگ بات کہ انتظار حسین دیو مالا کے جنگل میں تو سانپ دیوتا کو سب سے اونچے سنگھاسن پر بٹھاتے ہیں لیکن ادب کی دنیا میں اس کی ذرا سی مداخلت بھی گوارا نہیں کرتے۔

خامہ بگوش کے بارے میں محمد خالد اختر نے بہت پہلے کہہ رکھا ہے کہ ان کے قلم کا ڈسا پانی نہیں مانگتا اور یہ بھی کہ اس سلسلے میں وہ دوست دشمن کا امتیاز روا نہیں رکھتے۔ حالانکہ شواہد کی روشنی میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ دشمنوں کو غیر مستحق سمجھتے ہوئے، ساری نوازشیں دوستوں پر ڈھیر کر دیتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو نظیر صدیقی یا گوپی چند نارنگ سے پوچھ لیجیے اور اتنی دور نہ جا سکیں تو یہ نیاز مند بھی حاضر ہے:

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

پہلی جلد کے انتخاب کی ضخامت ناشر کے نزدیک کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ راقم کے مرتبہ کالموں میں مصنف کو دخل دینے کا موقع مل گیا۔ نتیجہ یہ کہ بقول شمیم حنفی ''چند ایک یاد رہنے والے کالم'' تخفیف کی نذر ہو گئے جن میں ''شہاب نامے'' پر سہ قسطی کالم (جسے خامہ بگوش کا شاہکار کہنا چاہیے) اور ''ساداتِ امروہہ'' والی بے نظیر تحریر بھی شامل تھی۔ یقیناً ان نشان زد نوشتوں کی جگہ بعض دوسرے کالم قلم زد کیے جاتے تو مناسب ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایسا کیوں ہوا؟ اس کے سوا کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کہیں سے ''جذباتی دباؤ'' کا زور آن پڑا ہو۔ یہ دباؤ انھوں نے لکھتے ہوئے اور رسالے میں چھاپتے ہوئے تو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا تھا لیکن لگتا ہے کہ انتخاب کی سُن گُن ملتے ہی اس میں خاصا اضافہ ہو گیا اور خامہ بگوش بھی جنھیں مظہر امام نے خطرناک اور بعض دوسرے ستم رسیدوں نے خوف ناک تک قرار دے رکھا ہے۔ لحاظ ملاحظے پر مجبور ہو گئے۔

اس سے پہلے انھوں نے چند ایک شدید قسم کی ''سخن گسترانہ'' تحریروں کو خارج کرنے کا یہ فارمولا دریافت کیا تھا کہ انتخاب کی پہلی جلد ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ۸۳ء سے ۹۰ء تک کے مطبوعہ کالموں کا انتخاب ہو (چنانچہ صدیق سالک مرحوم کی کتاب ''تادمِ تحریر'' پر ایک یادگار ''مزاحمتی تبصرہ'' پر فیض اور ندیم پر لکھے ہوئے کالم اور ان کے علاوہ بھی کچھ اہم تحریریں جو ۸۳ء سے پہلے روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں شائع ہوئی تھیں،

معرضِ اخفا میں چلی گئیں) لیکن اس سے نقصان کس کا ہوا؟ یقیناً خامہ بگوش سے زیادہ ہمارا اور ادب کا، جس میں وہ شخصیات بھی شامل ہیں جو ان تحریروں کا موضوع بنی تھیں۔ تاہم تلافی کی خاطر جب راقم نے تجویز کیا کہ دوسری جلد میں ان "متروکات" کو بھی واگزار کرلیا جائے تو فرمایا کہ نہیں، اس میں تو صرف ۹۴ء سے ۹۶ء تک کے کالموں کا انتخاب ہوگا۔ مجبوراً ان ہی "شرائطِ حوالہ" کے دائرے میں رہتے ہوئے موجودہ انتخاب مرتب کیا گیا ہے اور جو کچھ پہلی جلد میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا اسے کسی مناسب تر موقع پر چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں۔ اب کے البتہ خامہ بگوش سے گزارش کی گئی ہے کہ کسی دوسرے کی مرتبہ کتاب خصوصاً جب کہ اس کی مجموعی ضخامت بھی زیادہ نہ ہو، میں ردوبدل سے پرہیز مستحسن ہے۔ چاہے وہ آپ ہی کی تخلیقات پر مشتمل ہو۔

روزنامہ "نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن کے مہتمم جناب عطاء الحق قاسمی نے پہلی جلد پر تبصرے کے دوران، یہ سمجھتے ہوئے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو انتخاب مرتب کرنے کے بعد یہ گنہگار اپنے انتخاب کے ساتھ (بڑے) قاسمی صاحب کو بھی مسترد کر چکا تھا (خدا جانے کب اور کہاں؟)، یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ دیکھیں اب خامہ بگوش کو کب مسترد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اب ندیم صاحب نے خامہ بگوش کے نام خط میں جو ان کی اجازت سے شائع بھی ہو چکا ہے، اپنے استرداد یا راقم کے انحراف کی خبر سے لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے، عزیزم عطاء الحق کو اپنے خدشے کی تصدیق کے لیے سطورِ بالا میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ آخر آدمی کو اتنا ناقابلِ اعتبار بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہ کی جا سکے۔

یوں مجموعی طور پر جن مبصرین نے پہلی جلد کے مندرجات کی تعریف و توصیف میں لیت ولعل سے کام نہیں لیا تو مرتب نے مصنف کے ساتھ خود کو بھی اس میں شریک سمجھا۔ خصوصاً اسلوب احمد انصاری ("نقد و نظر"، علی گڑھ)، شمیم حنفی ("کتاب نما" دہلی) اور فضیل جعفری نے ("بلٹز"، بمبئی) میں جو مفصل تبصرے شائع کیے، انھیں خود ان کے لیے بھی لائقِ تحسین کہنا چاہیے۔ پاکستانی ایڈیشن پر ڈاکٹر اسلم فرخی اور تقی حسین خسرو کے تبصرے بھی بالترتیب استادانہ اور عالمانہ تھے (جب کہ انتظار حسین کو محترمہ فہیدہ ریاض نے اتنی مہلت نہ دی کہ کتاب کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی گنجائش نکال سکتے)۔ البتہ ہمارے ادبی ماحول کی ایک خوش گوار خبر یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر انور سدید ہماری آپ کی زندگی میں پہلی بار کسی معاملے میں متفق نظر آئے (خدا کرے یہ آخری بار نہ ہو) یعنی خامہ بگوش کی مدلل مداحی اور مرتب کی معکوس مداحی دونوں لحاظ سے۔ یہ اتفاق مبارک ہے مومنوں کے لیے بلکہ دونوں کے یہاں خامہ بگوش کے لیے پورے چھ لفظوں کا ایک جملہ...... "وہ تو ہیں ہی سراپا انتخاب" توارد کے طور پر وارد ہوا۔ یوں ان سے برسوں پہلے میر

حسن، دیوانِ درد کے بارے میں، کہہ چکے تھے کہ دیوانِ حافظ کی طرح ”سراپا انتخاب“ ہے مگر یہاں مفہوم مختلف تھا۔ مطلب یہ تھا کہ انتخاب کی ضرورت ہی کیا تھی۔ گویا مرتب کا نام نہ آتا تو بہتر تھا چاہے کالموں کی کلیات کتنی ہی ضخیم کیوں نہ ہو جاتی۔

ایک کے نزدیک مرتب کو انتخاب کرتے ہوئے کوئی دقت پیش نہ آئی ہوگی (گویا سارا کلام معیاری ہو تو انتخاب آسان ہو جاتا ہے)۔ دوسرے محترم کو یوں لگا جیسے یہ کام قرعہ اندازی کے ذریعے انجام دیا گیا ہو (لیکن قسمت آزمائی کے اس طریق کار میں، کوئی زیادہ معیاری چیز رہ تو نہیں گئی، اس کے جواب میں نشان دہی کی بجائے یہی کافی سمجھا گیا کہ باقی تمام کالم، جن کی مجموعی تعداد تین ساڑھے تین سو تک پہنچتی ہے اور جن کے لیے مزید پندرہ سولہ سو صفحے درکار ہوتے۔ گویا اشہارات کو چھوڑ کر ”اوراق“ کے تین خاص نمبر اور ”معاصر“ کے سات آٹھ نمبر اس کے لیے وقف کرنے پڑتے۔ حیرت ہے کہ خامہ بگوش کی کلیات چھاپنے کی اتنی آسان تجویز کیوں صورت پذیر نہ ہو سکی)۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مرتب کے بارے میں انہی میں سے ایک صاحب کو کہیں سے یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ وہ تو ”اپنی حالیہ زندگی بسترِ علالت پر صرف کر چکے ہیں، پھر یہ کیسے ہوا کہ سیکڑوں کالم پڑھ کر انتخاب کی زحمت اٹھاتے؟“ غالباً ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ علالت کا حادثہ تو انتخاب کے بعد پیش آیا تھا۔

ان دونوں کے عین درمیان میں ایک اور تبصرہ نگار تھے جنھوں نے ایک قلمی نام سے انیس ناگی صاحب کے ”دانشور“ میں یہ تحریر فرمایا کہ مرتب کا نام ”سجاوٹ“ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ البتہ چند سطروں کے بعد یہ سجاوٹ، محض ”مروت“ میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ پھر بھی یہ شکایت کہ مرتب نے بطور دیباچے کچھ نہ لکھا، خود جناب مصنف نے اور ان کی پیروی میں بہت سے کرم فرماؤں نے داخلِ دفتر کی۔ اوپر اس کی وجہ لکھی جا چکی ہے۔ البتہ ایک مزید سبب یہ ہوا کہ مصنف کے بارے میں ایک تفصیلی مقالہ لکھنے کا ارادہ ہو گیا (جواب بھی قائم ہے) اور ظاہر ہے کہ کتاب میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ اس وقت بلکہ اب بھی یہ کتاب میں شامل ہوتا تو کم از کم چار پانچ کالموں کی قربانی دینا پڑتی جو اس نیاز مند کی نظر میں مناسب نہیں کہی جا سکتی۔

موجودہ کتاب جو مارچ ۱۹۹۴ء سے لے کر اواخر ۱۹۹۶ء تک کے کالموں سے منتخب کی گئی ہے، تناسب کے لحاظ سے اصل سے تقریباً نصف ضخامت پر مشتمل ہے جب کہ پہلی جلد اصل کا چھٹا ساتواں حصہ تھی۔ چنانچہ یہاں خامہ بگوش کی خوبیاں (بلکہ خرابیاں بھی) زیادہ تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہیں جن میں سے چند ایک خصوصیات پڑھنے والوں کو توجہ دلانے کے لیے مختصراً بیان ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ

WWW.KITABOSUNNAT.COM

خامہ بگوش کے کالم عین مین تنقیدی کالم ہیں نہ اکثر (برائے نام) ادبی کالموں کی طرح محض گپ شپ۔ گویا انھیں عسکری کی ماہانہ ''جھلکیاں'' کے مماثل کہا جا سکتا ہے نہ انتظار حسین کی ''باتیں اور ملاقاتیں'' کے۔ یہ سیاسی کالم بھی قرار نہیں دیے جا سکتے اگرچہ سیاست کا حوالہ، اشارۃً اور کنایۃً، جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی بڑی حد تک درست ہوگا کہ ادبی گروہ بندیوں کے قضیے میں غیر جانب داری ان کو پسند ہے چاہے کبھی کبھار ایک خاص طرف ان کا ہلکا میلان جھلک جاتا ہو۔

اس کے علاوہ جس رسالے اور اس سے پہلے جس اخبار میں یہ کالم شائع ہوتے رہے (اور ہو رہے ہیں) اس کی دائیں بازو کی سیاست سے خامہ بگوش کی ادبی حیثیت کا کوئی میل نہیں چاہے مدیر مرحوم کے ان سے ذاتی تعلقات کی نوعیت کتنی بھی گہری کیوں نہ رہی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں مستند ترقی پسندوں (یا ان کی باقیات) کی ناموری مقصود ہے نہ سکہ بند اسلام پسندوں کی قدر افزائی۔ یوں کسی کتاب یا کسی گفتگو پر رائے زنی کرتے ہوئے خصوصیت میں تھوڑی سی عمومیت پیدا ہو جائے تو اور بات ہے لیکن یہ بات خامہ بگوش کے وسیع ادبی روابط پر کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم چند ایک روابط تقاضائے بشری کے طور پر کہیں نہ کہیں قربتِ خاص کا اشارہ ضرور کرتے ہیں جنھیں پڑھنے والا چاہے تو نظر انداز کر سکتا ہے یا زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرے تو ایک طرح کا ''جھکاؤ'' کہہ سکتا ہے۔ پھر بھی خامہ بگوش کے بارے میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کسی کے سامنے جھکنے والے آدمی نہیں، بس ذرا کی ذرا مروت کر بیٹھیں تو الگ ہے۔ اگرچہ یہ ذرا سی مروت بھی بعض اوقات بہت مہنگی پڑتی ہے۔

جن لوگوں کا وہ بالکل لحاظ نہیں کرتے، ان میں ہر طرح کے ادیب اور دانشور شامل ہیں، اپنے بھی اور بیگانے بھی لیکن وہ سب کو اپنا ہی سمجھ کر ان سے بے تکلفانہ سلوک کر جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کام خالصتاً اللہ کے لیے انجام دیتے ہیں اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نیشِ عقرب میں کوئی کینہ نہیں ہوتا۔ البتہ خامہ بگوش کے بارے میں کہی گئی دوسری باتوں کی طرح اسے بھی پوری طرح درست قرار دینا مشکل ہے کہ ان کی کاٹ اکثر دودھاری ہوتی ہے۔ پہلوداری کا کمال ہی یہی ہے کہ اِدھر سے اُدھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف ہاہاکار مچتی ہے تب پتا چلتا ہے کون کون زد میں آ گیا۔ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ شخصی اور خصوصی تصاویر کا یہ مرقع مجموعی طور پر کس طرح کا نقشہ بناتا ہے؟ اسے ادب کا اور ادبی کلچر کے زوال کا نقشہ ہی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ شمیم حنفی نے کہا ہے اور بڑے ادیبوں کا اور ادبی کلچر کے زوال کا نقشہ ہی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ شمیم حنفی نے کہا ہے اور بڑے ادیبوں کے چھوٹے پن کا انکشاف بھی جیسا کہ ''دانشور'' کے گم نام تبصرہ نگار نے کہا ہے۔ بہرحال خامہ بگوش نے زوال کی اس تصویر میں بھی اچھی خاصی تفریح کا سامان پیدا کیا ہے اور انکشاف

www.KitaboSunnat.com

بھی سچ مچ کے بڑے ادیبوں کو کم ہی کہیں موضوع بنایا ہے کہ وہ تو یوں بھی اپنے ماحول میں مستثنیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خامہ بگوش کے بہت سے کالم کتابوں کی تقریباتِ رونمائی یا ادیبوں سے رو در رو گفتگوؤں پر مشتمل ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ خامہ بگوش یا ان کے ہم زاد استاد لاغر مراد آبادی کسی ادبی تقریب میں کسی بھی حیثیت سے بطور صدر، بطور مہمان خصوصی، بطور مقرر حتیٰ کہ بطور سامع بھی، کم ہی کبھی شرکت کرتے ہیں۔ ان تقریبوں میں بھی نہیں جو خود ان کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتی ہیں۔ ضروری معلومات ان تک بالواسطہ پہنچتی ہیں لیکن فوری طور پر اور خاصی تفصیل کے ساتھ۔ وہ خود کراچی میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن لاہور اور اسلام آباد، دہلی اور لکھنؤ بلکہ بمبئی اور حیدرآباد تک کی وہ باتیں جن کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے لاتعداد ''فرشتوں'' کی مدد سے ان کے ذہنی کمپیوٹر میں فیڈ اور پروسیس ہوتی رہتی ہیں۔ جب بھی ضرورت پڑی، بٹن دبایا اور دفتر کے دفتر کھل کر رہ گئے۔ یہ ان کا روحانی تصرف ہے یا ریشہ دوانی کا کمال، اس کا فیصلہ بھی آسان نہیں۔

غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خامہ بگوش نے شاید ہی کبھی کسی ادیب سے شخصی انٹرویو کیا ہو۔ جو کالم گفتگوؤں پر مبنی بنائے جاتے ہیں ان میں بھی شخصِ مذکور کے کسی مطبوعہ یا نشری انٹرویو کا حوالہ موجود ملے گا۔ وہ یہ حوالہ بہت جلد بھول جاتا ہے اور پڑھنے والا سوال در سوال اور جواب در جواب کے جال میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور نکلتا ہے تو اس کی توجہ انٹرویو کے موقع محل کی بجائے انٹرویو دینے والے کی بوالعجبیوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں حسنِ اقتباس ان کا خاص جوہر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش کی نظر نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتی ہے۔ وہ کسی بھی مصنف کے لکھے ہوئے مختلف فقروں اور پیراگرافوں...... اور ان پر رواں رائے زنی کی مدد سے ایک ایسی خندہ آور تلخیص تیار کرتے ہیں جو زیرِ نظر تصنیف کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دے۔ پھر بھی انھیں جدید ناقدین کی ردِ تشکیل سے شکایت رہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ کسی بھی معروف نقاد کی نسبت کسی بھی تازہ کتاب کا مطالعہ کہیں زیادہ توجہ اور تفصیل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ نقاد لوگ پڑھتے وڑھتے بالکل نہیں تو زیادہ تر درست معلوم ہوتا ہے۔

پھر بھی، خامہ بگوش کو ایک سنجیدہ اور ذمے دار نقاد قرار دے کر انھیں اردو زبان کے ممتاز ناقدین کی مشہور یا بدنام زمانہ برادری میں شامل کرنا، ان کی تمام غیر سنجیدگیوں اور غیر ذمے داریوں کے ہوتے ہوئے، ناقدین کے علاوہ خود ان کے ساتھ بھی بے انصافی ہوگا۔ خصوصاً جب تک پڑھنے والے خود ہی کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں۔ میرا کام تو یہی تھا کہ پچھلے تین برس کے دوران انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کا ایک چنیدہ مجموعہ چند ایک گزارشات کے ساتھ پیش کر دوں۔ باقی رہا ان پر میرا مجوزہ مقالہ تو وہ بہتر ہے کہ میری اپنی ہی کتاب میں شامل ہو۔ یہ تو خامہ بگوش کا مال ہے جسے دوبارہ نجی ملکیت میں جانے سے پہلے قومی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں

انسان اپنی خلقت اور سرشت میں گوناگوں آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا مرقع ہے۔ اس کی پوری زندگی انھی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل و تزئین میں گزر جاتی ہے۔ خاک کا یہ پتلا بالعموم خواہشاتِ نفس کا اسیر رہتا ہے اور حیاتِ مستعار کی پوری نقدی کھیل تماشوں میں صرف کر دیتا ہے۔ زر و مال کی طلب اور اس کی محبت نفس خواہشیں، نام و نمود اور شہرت کی تمنا، جاہ و منصب کی حرص اور مجموعی طور پر ایک خوشحال اور مال و متاع سے بھرپور، ایک اونچے "معیارِ زندگی" کے لیے جد و جہد بیشتر انسانوں کو ایک کربِ مسلسل میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہی وہ اسلوبِ حیات ہے جسے قرآنِ حکیم میں "خسران" سے تعبیر کیا گیا ہے (اِنَّ الانسانَ لَفِی خُسرہ)۔

خوش بخت ہیں وہ معدودے چند لوگ جو خواہشاتِ نفس کے اس طغیان سے بچ بچا کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچ جاتے ہیں۔ جناب مشفق خواجہ، جنھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں شامل تھے۔ (یہیں سمجھ میں آتا ہے کہ "کلیجہ منہ کو آنا" کسے کہتے ہیں اور اس میں کتنا رنج و غم رکھنا، ہجر و فراق اور کتنی محرومی پوشیدہ ہے۔)

خواجہ صاحب ایک مہذب، مستغنی اور شائستہ انسان تھے۔ انھوں نے اس درجہ اپنی تہذیبِ نفس کر لی تھی کہ وہ ہر طرح کے نام و نمود، جاہ و منصب اور مال و متاع کی ہر خواہش سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ علامہ اقبال کا یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے:

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

ادب کی دنیا میں اعتراف (recognition) آج کے ادیب اور شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ہم سب 'اِلّا ماشاء اللہ' اسی انسانی کمزوری کا شکار ہیں۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں اس پر ہمیں داد ملنی چاہیے۔ اگر کتاب چھپے (اور کیوں نہ چھپے بلکہ اگر ہر سال ایک نئی کتاب چھپے تو کیا خوب ہے!) فلیپ پر تعریفی کلمات، ایک تحسینی دیباچہ، چند توصیفی تقریظیں۔ پھر اخبارات و رسائل میں کچھ تبصرے۔ ایک دو شہروں میں بلکہ اگر ہو سکے تو بیرون ملک اردو کی نئی بستیوں میں تقریبات اجرائی و رونمائی۔ صاحبِ کتاب کے بارے میں کسی ادبی

WWW.KITABOSUNNAT.COM

رسالے کا خاص نمبر یا گوشہ ہی سہی۔ اگر صاحب کتاب شاعر ہیں تو ان کا بلند پایہ کلام ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہونا چاہیے۔ اب صاحب کتاب کو، اس کتاب پر کوئی ادبی ایوارڈ بھی ملے اور ''صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی'' کی خواہش تو بالکل فطری ہے۔ مشفق خواجہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھے۔

ہماری بعض جامعات میں، زندہ شخصیات ادب پر بھی سندی مقالے لکھوانے کی روایت موجود ہے۔ خواجہ صاحب ہر اعتبار سے اس کا استحقاق رکھتے تھے کہ ان کے علمی و ادبی کارنامے کو موضوع مقالہ بنایا جائے مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان پر کچھ لکھا جائے۔ باوجود اس کے کہ علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے وہ قدردان تھے اور کام کرنے والوں کی ممکنہ حد تک اور خوش دلی کے ساتھ مدد کرتے، اپنے معاملے میں وہ کسی طرح کا تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیتے تھے۔ میرے علم میں ہے کہ پروفیسر تحسین فراقی صاحب نے اپنے ایک شاگرد حافظ محمد قاسم (متعلم ایم اے اردو، اورینٹل کالج لاہور) کے تحقیقی مقالے کا موضوع تجویز کیا ''مشفق خواجہ بطور مدون......'' جب خواجہ صاحب تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے اسے ناپسند کیا اور فراقی صاحب سے بھی خفا ہوئے۔ فراقی صاحب نے تو یہ موضوع میرٹ پر تجویز کیا تھا، خواجہ صاحب بہر حال اس کا استحقاق رکھتے تھے۔ مگر خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ لوگ اسے ''حق دوستی'' پر محمول کریں گے۔ (یہ معلوم ہے کہ خواجہ صاحب فراقی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اس مقالے کے نگران ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر صاحب سے بھی خواجہ صاحب کو خاص تعلق خاطر تھا۔) بایں ہمہ مقالہ نگار نے اپنا کام جاری رکھا۔

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر صاحب نے خواجہ صاحب کے برادر بزرگ خواجہ عبدالقیوم اور بعض دیگر عزیزوں سے رابطہ قائم کیا تاکہ مقالے کے باب اول کے لیے، خواجہ صاحب کے کچھ سوانحی حالات معلوم کیے جائیں۔ خواجہ عبدالقیوم صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے مزاج سے واقف تھے، اس لیے انھوں نے، از راہ احتیاط، معلومات فراہم کرنے سے پہلے مشفق خواجہ صاحب سے بات کی تو انھوں نے منع کر دیا۔ چنانچہ عالمگیر صاحب اور مقالہ نگار کو، خواجہ صاحب کے سوانحی اور شخصی حالات کے ضمن میں کوئی نئی بات یا مزید معلومات نہ مل سکیں۔ مقالہ بہر حال مکمل ہو گیا، طالب علم کو ڈگری بھی مل گئی۔ کچھ عرصے کے بعد، شعبہ اردو کے مجلے ''باز یافت'' (مدیر: تحسین فراقی) میں ''کلیات یگانہ'' پر مذکورہ طالب کا تبصرہ شائع ہوا تو خواجہ صاحب نے پھر تحسین صاحب سے خفگی کا اظہار کیا۔ فی الحقیقت وہ خلوص دل سے سمجھتے تھے کہ عالم اور شاعر و ادیب کے لیے شہرت اور نام و نمود مہلک ہے۔ ایک بار'' راقم الحروف کو خط میں لکھا: ''ہوس، دولت و شہرت کی ہو، نفس امارہ کی یا کتابوں کی، اس کی کوئی انتہا نہیں۔ الحمدللہ میں ہر معاملے میں قناعت پسند ہوں۔''

خامہ بگوش کے کالم عین مین تنقیدی کالم ہیں نہ اکثر (برائے نام) ادبی کالموں کی طرح محض گپ شپ۔ گویا انھیں عسکری کی ماہانہ ''جھلکیاں'' کے مماثل کہا جا سکتا ہے نہ انتظار حسین کی ''باتیں اور ملاقاتیں'' کے۔ یہ سیاسی کالم بھی قرار نہیں دیے جا سکتے اگرچہ سیاست کا حوالہ، اشارۃً اور کنایۃً، جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی بڑی حد تک درست ہوگا کہ ادبی گروہ بندیوں کے قضیے میں غیر جانب داری ان کو پسند ہے چاہے کبھی کبھار ایک خاص طرف ان کا ہلکا میلان جھلک جاتا ہو۔

اس کے علاوہ جس رسالے اور اس سے پہلے جس اخبار میں یہ کالم شائع ہوتے رہے (اور ہو رہے ہیں) اس کی دائیں بازو کی سیاست سے خامہ بگوش کی ادبی حیثیت کا کوئی میل نہیں چاہے مدیر مرحوم کے ان سے ذاتی تعلقات کی نوعیت کتنی بھی گہری کیوں نہ رہی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں مستند ترقی پسندوں (یا ان کی باقیات) کی ناموری مقصود ہے نہ سکہ بند اسلام پسندوں کی قدر افزائی۔ یوں کسی کتاب یا کسی گفتگو پر رائے زنی کرتے ہوئے خصوصیت میں تھوڑی سی عمومیت پیدا ہو جائے تو اور بات ہے لیکن یہ بات خامہ بگوش کے وسیع ادبی روابط پر کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم چند ایک روابط تقاضائے بشری کے طور پر کہیں نہ کہیں قربتِ خاص کا اشارہ ضرور کرتے ہیں جنھیں پڑھنے والا چاہے تو نظر انداز کر سکتا ہے یا زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرے تو ایک طرح کا ''جھکاؤ'' کہہ سکتا ہے۔ پھر بھی خامہ بگوش کے بارے میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کسی کے سامنے جھکنے والے آدمی نہیں، بس ذرا کی ذرا مروت کر بیٹھیں تو الگ ہے۔ اگرچہ یہ ذرا سی مروت بھی بعض اوقات بہت مہنگی پڑتی ہے۔

جن لوگوں کا وہ بالکل لحاظ نہیں کرتے، ان میں ہر طرح کے ادیب اور دانشور شامل ہیں، اپنے بھی اور بیگانے بھی لیکن وہ سب کو اپنا ہی سمجھ کر ان سے بے تکلفانہ سلوک کر جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کام خالصتاً اللہ کے لیے انجام دیتے ہیں اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نیشِ عقرب میں کوئی کینہ نہیں ہوتا۔ البتہ خامہ بگوش کے بارے میں کہی گئی دوسری باتوں کی طرح اسے بھی پوری طرح درست قرار دینا مشکل ہے کہ ان کی کاٹ اکثر دو دھاری ہوتی ہے۔ پہلوداری کا کمال ہی یہی ہے کہ اِدھر سے اُدھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف ہاہا کار مچتی ہے تب پتا چلتا ہے کون کون زد میں آ گیا۔ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ شخصی اور خصوصی تصاویر کا یہ مرقع مجموعی طور پر کس طرح کا نقشہ بناتا ہے؟ اسے ادب کا اور ادبی کلچر کے زوال کا نقشہ ہی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ شمیم حنفی نے کہا ہے اور بڑے ادیبوں کا اور ادبی کلچر کے زوال کا نقشہ ہی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ شمیم حنفی نے کہا ہے اور بڑے ادیبوں کے چھوٹے پن کا انکشاف بھی جیسا کہ ''دانشور'' کے گم نام تبصرہ نگار نے کہا ہے۔ بہرحال خامہ بگوش نے زوال کی اس تصویر میں بھی اچھی خاصی تفریح کا سامان پیدا کیا ہے اور انکشاف

WWW.KITAABISTAN.COM

میں بھی سچ مچ کے بڑے ادیبوں کو کم ہی کہیں موضوع بنایا ہے کہ وہ تو یوں بھی اپنے ماحول میں مستثنیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خامہ بگوش کے بہت سے کالم کتابوں کی تقریباتِ رونمائی یا ادیبوں سے رو در رو گفتگوؤں پر مشتمل ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ خامہ بگوش یا ان کے ہم زاد استاد لاغر مراد آبادی کسی ادبی تقریب میں کسی بھی حیثیت سے بطور صدر، بطور مہمان خصوصی، بطور مقرر حتیٰ کہ بطور سامع بھی، کم ہی کبھی شرکت کرتے ہیں۔ ان تقریبوں میں بھی نہیں جو خود ان کے زیر اہتمام منعقد ہوتی ہیں۔ ضروری معلومات ان تک بالواسطہ پہنچتی ہیں لیکن فوری طور پر اور خاصی تفصیل کے ساتھ۔ وہ خود کراچی میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن لاہور اور اسلام آباد، دہلی اور لکھنؤ بلکہ بمبئی اور حیدر آباد تک کی وہ باتیں جن کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے لاتعداد ''فرشتوں'' کی مدد سے ان کے ذہنی کمپیوٹر میں فیڈ اور پروسیس ہوتی رہتی ہیں۔ جب بھی ضرورت پڑی، بٹن دبایا اور دفتر کے دفتر کھل کر رہ گئے۔ یہ ان کا روحانی تصرف ہے یا ریشہ دوانی کا کمال، اس کا فیصلہ بھی آسان نہیں۔

غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خامہ بگوش نے شاید ہی کبھی کسی ادیب سے شخصی انٹرویو کیا ہو۔ جو کالم گفتگوؤں پر مبنی بنائے جاتے ہیں ان میں بھی شخصِ مذکور کے کسی مطبوعہ یا نشری انٹرویو کا حوالہ موجود ملے گا۔ وہ یہ حوالہ بہت جلد بھول جاتا ہے اور پڑھنے والا سوال در سوال اور جواب در جواب کے جال میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور نکلتا ہے تو اس کی توجہ انٹرویو کے موقع محل کی بجائے انٹرویو دینے والے کی بوالعجبیوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں حسن اقتباس ان کا خاص جوہر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش کی نظر نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتی ہے۔ وہ کسی بھی مصنف کے لکھے ہوئے مختلف فقروں اور پیراگرافوں...... اور ان پر رواں رائے زنی کی مدد سے ایک ایسی خندہ آور تلخیص تیار کرتے ہیں جو زیرِ نظر تصنیف کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دے۔ پھر بھی انھیں جدید ناقدین کی ردِ تشکیل سے شکایت ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ کسی بھی معروف نقاد کی نسبت کسی بھی تازہ کتاب کا مطالعہ کہیں زیادہ توجہ اور تفصیل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ نقاد لوگ پڑھتے وڑھتے بالکل نہیں تو زیادہ تر درست معلوم ہوتا ہے۔

پھر بھی، خامہ بگوش کو ایک سنجیدہ اور ذمے دار نقاد قرار دے کر انھیں اردو زبان کے ممتاز ناقدین کی مشہور یا بدنام زمانہ برادری میں شامل کرنا، ان کی تمام غیر سنجیدگیوں اور غیر ذمے داریوں کے ہوتے ہوئے، ناقدین کے علاوہ خود ان کے ساتھ بھی بے انصافی ہوگا۔ خصوصاً جب تک پڑھنے والے خود ہی کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں۔ میرا کام تو یہی تھا کہ پچھلے تین برس کے دوران انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کا ایک چنیدہ مجموعہ چند ایک گزارشات کے ساتھ پیش کر دوں۔ باقی رہا ان پر میرا مجوزہ مقالہ تو وہ بہتر ہے کہ میری اپنی ہی کتاب میں شامل ہو۔ یہ تو خامہ بگوش کا مال ہے جسے دوبارہ نجی ملکیت میں جانے سے پہلے قومی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔

کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں

انسان اپنی خلقت اور سرشت میں گوناگوں آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا مرقع ہے۔ اس کی پوری زندگی انھی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل و تزئین میں گزر جاتی ہے۔ خاک کا یہ پتلا بالعموم خواہشاتِ نفس کا اسیر رہتا ہے اور حیاتِ مستعار کی پوری نقدی کھیل تماشوں میں صرف کر دیتا ہے۔ زر و مال کی طلب اور اس کی محبت نفس خواہشیں، نام و نمود اور شہرت کی تمنا، جاہ و منصب کی حرص اور مجموعی طور پر ایک خوشحال اور مال و متاع سے بھرپور، ایک اونچے ”معیارِ زندگی“ کے لیے جدوجہد بیشتر انسانوں کو ایک کربِ مسلسل میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہی وہ اسلوبِ حیات ہے جسے قرآنِ حکیم میں ”خسران“ سے تعبیر کیا گیا ہے (اِنَّ الاِنسَانَ لَفِی خُسرٍ)۔

خوش بخت ہیں وہ معدودے چند لوگ جو خواہشاتِ نفس کے اس طغیان سے بچ بچا کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچ جاتے ہیں۔ جناب مشفق خواجہ، جنھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں شامل تھے۔ (یہیں سمجھ میں آتا ہے کہ ”کلیجہ منہ کو آنا“ کسے کہتے ہیں اور اس میں کتنا رنج و غم رکھنا، ہجر و فراق اور کتنی محرومی پوشیدہ ہے۔)

خواجہ صاحب ایک مہذب، مستغنی اور شائستہ انسان تھے۔ انھوں نے اس درجہ اپنی تہذیبِ نفس کر لی تھی کہ وہ ہر طرح کے نام و نمود، جاہ و منصب اور مال و متاع کی ہر خواہش سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ علامہ اقبال کا یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے:

ایّام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

ادب کی دنیا میں اعتراف (recognition) آج کے ادیب اور شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ہم سب 'اِلّا ماشاءاللہ' اسی انسانی کمزوری کا شکار ہیں۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں اس پر ہمیں داد ملنی چاہیے۔ اگر کتاب چھپے (اور کیوں نہ چھپے بلکہ اگر ہر سال ایک نئی کتاب چھپے تو کیا خوب ہے!) فلیپ پر تعریفی کلمات، ایک تحسینی دیباچہ، چند توصیفی تقریظیں۔ پھر اخبارات و رسائل میں کچھ تبصرے۔ ایک دو شہروں میں بلکہ اگر ہو سکے تو بیرونِ ملک اردو کی نئی بستیوں میں تقریباتِ اجرائی و رونمائی۔ صاحبِ کتاب کے بارے میں کسی ادبی

خوش بخت ہیں کراچی کے وہ ادیب، شاعر، دانش ور اور اہل قلم جو مشفق خواجہ جیسی نعمت سے مستفیض ہوتے رہے۔ اب وہ اس نعمت سے محروم ہو گئے ہیں لیکن یہ محرومی صرف کراچی والوں کی نہیں ہے، پوری اردو دنیا اور دنیائے علم و ادب کی محرومی ہے۔

مرحوم "اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔" یہ ایک روایتی جملہ ہے لیکن یہ جملہ اگر کسی پر صادق آتا ہے تو مشفق خواجہ پر۔ انھوں نے اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود، تن تنہا ایسے بلند پایہ اور معیاری و مثالی تحقیقی کام انجام دیے جو اداروں کے کرنے کے تھے۔ اس کے باوجود یہ ایک سفاک حقیقت ہے کہ کار دنیا کسے تمام نہ کرد کسے تمام نہ کرد۔ ابھی کتنے ہی کام مشفق خواجہ کے پیش نظر تھے جو وہ انجام دینا چاہتے تھے، مکمل کرنا چاہتے تھے۔ بے گفتنیہا کہ ناگفتہ ماند۔ مرحوم، اس آرزوئے ناتمام کے ساتھ عالم جاودانی کو رخصت ہوئے ہوں گے کہ کچھ مہلت ملے تو اپنے علمی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچادوں۔ مگر رہے نام اللہ کا۔ ان کی بہت سی تحریریں، بہت سے مضامین، بہت سے تبصرے غیر مدون ہیں یہ سب کئی جلدوں میں سمائیں گے۔

مشفق خواجہ کی شخصیت اور ان کی علمی نہاد و افتاد طبع کو سمجھنے کے لیے ان کے مکاتیب ایک بڑا قیمتی اور اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب محمد عالم مختار حق نے اپنے نام مرحوم کے خطوط حواشی کے ساتھ مرتب کر دیے ہیں۔ یہ کتاب بہت جلد آنے والی ہے۔ راقم کے نام مکاتیب مشفق خواجہ کا مجموعہ بھی تیار ہے۔ چند خطوط "مخزن" میں چھپے ہیں اور ایک بڑی تعداد "الزبیر" اور "مکالمہ" میں آنے والی ہے۔ جو اصحاب مشفق خواجہ سے قربت و محبت اور "باما آشنا بود" کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اس محبت و تعلق کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے نام مرحوم کے خطوط، مختصر توضیحات کے ساتھ شائع کر دیں اور اس کار خیر میں تاخیر نہ کریں۔ رہا ان کی تحریروں کی تدوین کا کام یا ان کے ناتمام علمی و ادبی منصوبوں کی تکمیل وہ سارے علمی و ادبی ادارے کریں جن کے مشفق خواجہ رکن رکین رہے، جن کی مختلف مجلسوں اور کمیٹیوں میں وہ شریک ہو کر اپنا قیمتی وقت دے کر انھیں مشورے دیتے اور ان کی رہبری کرتے رہے۔ ان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کے ناتمام علمی منصوبوں کی تکمیل اور ان کی تحقیقات ادبی کی تدوین کا اہتمام کریں۔ یہ ان کے ذاتی منصوبے نہیں تھے، اردو زبان و ادب کے ترقیاتی اجتماعی منصوبے تھے، جنھیں بروئے کار لانا اور پایۂ تکمیل تک پہنچانا، ان اداروں پر ایک طرح سے قرض ہے۔ ان میں انجمن ترقیِ اردو، مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیاتِ اردو، مجلسِ ترقیِ ادب اور اقبال اکادمی جیسے ادارے شامل ہیں جو سب باوسائل ہیں اور بخوبی ایسا کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف احساس، نیت اور عزم کی ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

حیرت ہوتی ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور مشاغل کے باوجود انھوں نے ایسے پہاڑ کام کیوں کر انجام دیے؟ میں سوچتا ہوں شاید اس لیے کہ وہ وقت کو اور زندگی کے ایک ایک لمحے کو خدا کی امانت سمجھتے تھے اور اس امانت کو انھوں نے دیانت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے: ''ہر گزرا ہوا لمحہ ہی انسان کا اصل نامۂ اعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ لمحہ بے کار گزرا ہے تو نامۂ اعمال پر ایک سیاہ نقطے کا اضافہ ہو جائے گا۔'' (مکتوب بنام محمد حمزہ فاروقی، مخزن، نمبر ۱۰، ص ۳۶) جو لوگ انھیں جانتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ مشفق خواجہ نے اپنے قلبِ شفاف کو سیاہ نقطوں سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔

وہ ایک بے مثال شخص تھے۔ اپنے اصول و نظریات اور معیارات کے ساتھ، اسلام، پاکستان، اردو اور ادب کے ساتھ ان کی وفاداری اور ایفائے عہد نہایت محکم، مستحکم اور استوار تھا۔ وہ ایک مخلص اور بے ریا انسان تھے۔ سچائی، راستی اور خیر کے قدر دان اور علم بردار تھے۔ شہرت، نمود و نمائش، تصنع اور بناوٹ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انھیں گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص خصوصاً ادیب، شاعر، محقق یہ طرزِ عمل اختیار کرے۔

پاکستان ہی میں نہیں، بھارت ہی میں نہیں، پوری دنیا میں، جہاں جہاں اردو زبان و ادب کا چرچا ہے:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کے مصداق مشفق خواجہ کا نام زندہ رہے گا اور وہ اردو ادب، اردو تحقیق و تدوین اور اردو طنز و مزاح کے ایک قابلِ فخر سپوت کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے اور بقائے دوام کے دربار میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا رہے گا۔

میرے عزیز دوست سجاد میر نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ ہر ادب و تحقیق کے میدان میں بڑے نام ہیں مگر سچ کہتا ہوں، کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں ہے۔ ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس شہر ہی میں نہیں، اس ملک میں بھی اور پورے برصغیر میں بھی، بلکہ جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں وہاں تک۔''

(''نوائے وقت'' لاہور، ۲۴ فروری ۲۰۰۵ء)

سید محمد عقیل رضوی

مشفق خواجہ سے چند ملاقاتیں

اب سن تو صحیح طور سے یاد نہیں مگر غالباً ۸۸۔۱۹۸۹ء رہا ہوگا جب لکھنؤ کی کسی ادبی تقریب میں مشفق خواجہ تشریف لائے تھے۔ میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی کسی میٹنگ سے لوٹ کر عابد سہیل صاحب کی کتابوں کی دکان پر حسب معمول جا کر بیٹھا تھا کہ ایک بھرے بھرے جسم کے خوش پوش، ادھیڑ عمر کے صاحب دکان کے اندر داخل ہوئے اور آتے ہی عابد سہیل صاحب سے انھوں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں مشفق خواجہ ہوں، پاکستان سے آیا ہوں۔ میرے ساتھ غالباً احمر لاری صاحب تھے۔ عابد سہیل صاحب نے پھر ہم لوگوں کا ان سے تعارف کرایا اور پھر ادھر ادھر کی ادبی باتیں چل نکلیں۔ مشفق خواجہ صاحب لکھنؤ کی کسی ادبی تقریب کے علاوہ کچھ یگاؔنہ چنگیزی کے حالات، کچھ ان کی کتابیں، کچھ تخلیقات وغیرہ بھی جمع کر رہے تھے۔ ہم لوگوں سے بھی انھوں نے استفسار کیا۔ ہم میں سے جو کچھ بھی جو جانتا تھا، اس نے وہ بتایا مگر عابد سہیل صاحب نے اس واقعۂ فاجعہ کی تفصیل بیان کی جو یگاؔنہ کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ میں پیش آیا تھا۔ عابد سہیل اس وقت یونیورسٹی کے طالب علم تھے جب یگاؔنہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ پھر ہم لوگ امین آباد کے ایک چائے خانے میں گئے۔ چائے وغیرہ کے بعد میں نے مشفق خواجہ سے اجازت لی اور شام کی گاڑی میں الہٰ آباد واپس چلا گیا۔

مشفق خواجہ سے دوسری ملاقات فروری ۱۹۹۳ء میں کراچی میں ہوئی جب میں پہلی بار، پاکستان احتشام حسین انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کے لیے کراچی گیا۔ یہ سیمینار پاکستان کے مشہور ادبی رسالے 'ارتقا' نے منعقد کیا تھا جو کراچی کے مشہور آڈیٹوریم نیپا میں ۱۱،۱۲ فروری ۱۹۹۳ء کو ہوا تھا۔ یہیں دوسری بار مشفق خواجہ سے ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے احتشام حسین پر کوئی مقالہ تو نہیں پڑھا مگر مقالات جو پڑھے گئے اور ان پر جو بحثیں ہوئیں ان میں حصہ لیا۔ یہیں انھوں نے مجھے کراچی کی غالب لائبریری میں ایک تقریر کی دعوت دی۔ یہ تقریر 'اردو افسانے کی نئی صورت حال' پر تھی جس کی صدارت مشہور صحافی مختار زمن نے کی تھی جو الہٰ آباد یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم کے شاگرد رہ چکے تھے۔ تقریر کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشفق خواجہ نے سب کا بڑا مسکت جائزہ پیش کیا۔ اگرچہ وہ تحقیق کے آدمی تھے مگر جس ڈھنگ سے انھوں نے جدید علامتی اور دوسرے نئے افسانوں پر باتیں کی تھیں میں انھیں سن کر متحیر رہ گیا کہ

عموماً محققین تحقیق کی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ انھیں ادب کی نئی صورت حال کی بہت کم خبر ہوتی ہے مگر مشفق خواجہ نے نئے اور گم ہوتے ہوئے علامتی افسانوں پر جس طرح باتیں کی تھیں وہ بے حد معلوماتی تھیں۔ علامتی افسانوں کے زوال کے اسباب پر ان کی بحث خاصی منطقی اور رضا جو تھی۔ جیسا کہ سیمناروں میں ہوتا ہے، علی حیدر ملک اور فردوس حیدر نے خواجہ صاحب سے اختلاف بھی کیا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے انور سجاد کے افسانے ’گائے‘ پر خاصی بحث ہوئی۔ علی حیدر ملک نے ’گائے‘ کو عالمگیر افسانے کی صف میں رکھنے کی پچ کی مگر خواجہ صاحب نے اردو کے جدید علامتی افسانوں کو تقریباً رد کیا۔ اس ضمن میں اور بہت سی باتیں ہوئیں مگر مشفق خواجہ اپنی رائے پر جمے رہے اور یہ ایک محقق کا تیقن تھا۔ ان کی تقریر بے حد صاف اور شستہ تھی اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اصلاً پنجاب کے، غالباً لاہور کے رہنے والے ہیں تو میں دنگ رہ گیا کہ ان کا لہجہ ش، قاف اور بولنے کا انداز بالکل یو پی والوں جیسا تھا۔ مذاق اور دلچسپ باتیں بھی درمیان گفتگو بڑے سلیقے سے کرتے جاتے تھے۔ بعد کو وہیں یہ طے ہوا کہ شام کو ہم سب لوگ کراچی کے سب سے پرانے کلب میں کھانا کھائیں گے۔ ہمارے ساتھ ایک معمر سے خوب صورت صاحب بھی اس ادبی محفل میں تھے جن کا نام لطف اللہ تھا۔ مشفق خواجہ نے ان سے میرا تعارف کرایا اور یہ بھی کہا کہ لطف اللہ صاحب نے شعرأ اور ادبأ کی آوازوں کا ایک میوزیم تیار کیا ہے۔ پہلے ہم لوگ وہاں چلیں گے۔ آپ بھی یہ عجوبہ دیکھیے جو برصغیر میں اپنی نوعیت کی انوکھی چیز ہے، پھر وہاں سے ہم لوگ ڈنر کھانے چلیں گے۔ شام کو مشفق خواجہ مجھے لے کر ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے فیز ٦ کے مکان ’خیابان سحر‘ میں پہنچے۔ وہاں پہلے سے ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ یہ ہاجرہ مسرور نکلیں جن سے خواجہ صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ میں ہاجرہ سے پہلے کبھی نہ ملا تھا لیکن ان کی بہت سی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ اس لیے غائبانہ طور پر تو واقف تھا ہی۔ پھر خواجہ صاحب مجھے لے کر لطف اللہ صاحب کے آوازوں والے کمرے میں آئے۔ بیسویں صدی کے وسط کے تقریباً تمام اہم شعرأ اور ادیبوں کی آوازیں ہم نے اس آوازوں کے عجائب گھر میں سنیں اور پھر مشفق خواجہ صاحب مجھے ساتھ لے کر کراچی کے پرانے کلب میں پہنچے۔ یہ کلب ۱۸۸۸ء میں انگریزوں نے یہاں کی انگلش سوسائٹی کے لہو و لعب اور لذتِ کام و دہن کے لیے بنایا تھا جو سمندر کے پانی پر تقریباً تیر رہا تھا۔ ہاجرہ مسرور نے یہاں اپنا ایک چھوٹا سا افسانہ سنایا۔ پھر مشفق خواجہ صاحب نے لکھنوی تہذیب اور اس کے آخری دور پر باتیں شروع کیں تو نوابی دور، تاریخ، انگریزوں کی لکھنؤ پر لکھی ہوئی کتابیں خصوصاً میجر سلیمن کی کتاب A JOURNEY THROUGH THE KINGDOM OF OUDH اور میجر برڈ (Bird) کی کتاب SPOLIATION OF OUDH پر بے حد معلوماتی اور

WWW.KITAABISTAN.COM

تحقیقی باتیں کیں۔ پھر اس میں میجر سلیمن کے فرضی قصوں کا دوسرے تاریخی واقعات سے تقابلی تجزیہ کر کے انگریزوں کی من گھڑت تاریخ پر دلچسپ باتیں کیں۔ میں ان کی، ان معلومات اور تجزیوں پر حیران رہ گیا۔ باجرہ کو شاید یہ سب باتیں کچھ غیر دلچسپ معلوم ہوئیں کہ انھوں نے مذاقاً کہا ”جہاں دو محققین مل جاتے ہیں بحث کر کر کے محفل کا سارا مزہ ختم کر دیتے ہیں“ مگر خیر، اس وقت تک مشفق خواجہ کی ’خامہ بگوش‘ کتابی شکل میں نہیں آئی تھی۔ تاہم چھُٹ پُٹ مضامین دلی کی ’کتاب نما‘ میں شائع ہو رہے تھے۔ کراچی کلب کی یہ صحبت بہت دلچسپ رہی۔ مرنے سے کچھ پہلے خواجہ مرحومؔ نے ’کلیاتِ یگانہ چنگیزی‘ بھی مرتب کر دیا جو غالباً ان کا آخری بے حد اہم کارنامہ ہے۔ ہندوستان میں بھلا کس میں ہمت اور شوق رہ گیا ہے کہ یگانہؔ جیسے تیکھے اور تقریباً ’مردودِ بارگاہ‘ شاعر پر اتنا اہم کام اس سلیقے سے کرتا۔ کم از کم لکھنؤ تو یگانہؔ سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ ایک باقر مہدی ہیں جو کبھی کبھی یگانہؔ پر کچھ لکھ دیا کرتے تھے مگر اب تو وہ بھی ’منقار زیرِ پر‘ ہو چکے ہیں۔

آج جب مشفق خواجہ کے مرنے کا ذکر سنتا ہوں تو ان کا سنجیدہ مگر مسکراتا ہوا چہرہ بار بار سامنے گھوم جاتا ہے اور پھر چکبستؔ لکھنوی کا یہ شعر ذہن میں اُبھرتا ہے:

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو

تاہم حقیقت یہی ہے کہ اتنا بڑا عالم اور اتنا بڑا محقق و ادیب اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔

محمد راشد شیخ

مشفق خواجہ اور ان کا ’کتب خانہ‘

”کسی کا امیر خانہ ہوتا ہے، کسی کا غریب خانہ، ہمارا کتب خانہ ہے۔“ مشفق خواجہ نے یہ الفاظ اس وقت ادا کیے تھے جب چند برس قبل ہندوستان کے نامور ادیب اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر عبدالغنی پٹنہ سے کراچی آئے ہوئے تھے اور خواجہ صاحب کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ یوں گھر تو سب ہی کے ہوتے ہیں لیکن خواجہ صاحب جیسا گھر نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ چھوٹے سائز کا یہ تیرہ کمروں پر مشتمل گھر جس میں سب کے سب کمرے کتابوں سے بھرے ہوئے نہیں بلکہ اَٹے ہوئے اور اب تو یہ صورت ہوگئی تھی کہ الماریوں میں کتابیں رکھنے کی جگہ نہ رہی تو فرش بھی کتابوں سے بھر چکے تھے۔ کتب خانے اور شاید اس سے بڑے کتب خانے اور لوگوں کے بھی ہوں گے لیکن یہ وہ کتب خانہ ہے جس کے دروازے طویل عرصے سے امیر، غریب، چھوٹے، بڑے ہر ایک کے لیے کھلے تھے۔ خواجہ صاحب کے بارے میں جب کبھی سوچا، یہ سوال اکثر ذہن میں آیا کہ اہل قلم تو اور بھی ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ اردو کی برصغیر پاک و ہند میں کوئی علمی ادبی کتاب چھپے، مصنف دستخطی نسخہ خواجہ صاحب کو پیش کرنے میں خوشی محسوس کرتا اور وہ کتاب خواجہ صاحب کی میز پر ضرور نظر آتی؟ جواب علامہ اقبال کے اس مصرعے میں موجود ہے:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے

حقیقت بھی یہ ہے کہ خواجہ صاحب جس بے غرضی اور خلوص سے دوسروں کی عملی مدد کرتے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پوری اردو دنیا سے جو کوئی ان سے کسی نادر کتاب حتیٰ کہ نادر مخطوطے کے حصول کے لیے درخواست کرتا، کوئی اور اس کی مدد کرے یا نہ کرے خواجہ صاحب اس کی پکار پر لبیک کہتے اور فوٹو اسٹیٹ کرا کے اپنے خرچ پر رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کرتے۔ کیا علمی امداد کی ایسی کوئی مثال ہمارے معاشرے میں ملتی ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی زندگی حصول علم اور فروغ علم کے لیے وقف کردی تھی۔ ہمارے معاشرے میں ہر طرف مادہ پرستی کا غلبہ ہو چکا ہے۔ زندگی کا مقصد محض روپے پیسے جمع کرنا اور اس میں اضافہ کرنا عام ہو گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی تمام زندگی اس طرزِ زندگی کے خلاف جہاد میں گزری۔ ان کی نظر میں حصول علم اور دوسروں کی علمی امداد ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب کوئی امیر کبیر آدمی نہ تھے، وسائل محدود اور اس پر طرح طرح کے امراض کا ساتھ لیکن انھوں نے اپنے دکھ اور اپنی تکلیفوں پر پردہ ڈال کر دوسروں کی مدد کرنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ اس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جو کبھی خواجہ صاحب کی محفل میں بیٹھا ہو۔ وہ اپنے دلچسپ اور چبھتے ہوئے جملوں سے محفل کو زعفران زار بنانے کا فن جانتے تھے۔ مخاطب کو لاجواب کرنے اور اسے دلائل سے قائل کرنے میں خواجہ صاحب اپنی مثال آپ تھے۔ خواجہ صاحب کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ اچھا دوست ضائع کر دیتے ہیں لیکن اچھا جملہ نہیں۔ واقعات تو بہت سے ہیں لیکن یہاں خواجہ صاحب کی بذلہ سنجی اور دلچسپ جملوں کی ادائیگی کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔

ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے انھیں اپنا ماضی بے اختیار یاد آیا اور فرمانے لگے ”ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا۔ دایہ بچہ جنوا کر تھوڑا سا گڑ اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔“ خواجہ صاحب ان صاحب کی باتیں پچھلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی ان صاحب سے یوں گویا ہوئے: ”اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔“ اس جملے کو سنتے ہی پوری محفل زعفران زار بن گئی۔ اس طرح کے جملے خواجہ صاحب کے گھر اتوار کی نشست میں حاضرین کو بار بار سننے کو ملتے تھے۔

مشفق خواجہ کا قلمی نام تمام اردو دنیا میں اس قدر مشہور ہوا کہ اصل نام لوگ بھول گئے۔ ان کا اصلی نام خواجہ عبدالحئی تھا۔ خواجہ صاحب کے والد محترم خواجہ عبدالوحید (وفات ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء) مشرقی و مغربی علوم کے ماہر، علامہ اقبال کے ہم جلیس اور کئی علمی کتب کے مصنف تھے۔ ان کے حقیقی چچا خواجہ عبدالمجید اردو کی ضخیم لغت ’جامع اللغات‘ کے مؤلف تھے۔ ان کے نانا میاں میر بخش کا لاہور میں ’کریمی پریس‘ تھا جس میں علامہ اقبال اور دیگر مشاہیر کی کتب شائع ہوتی تھیں۔ اس علمی گھرانے میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ صاحب کی ولادت ہوئی۔ ان کی جائے ولادت محمد نگر، لاہور ہے۔ جب خواجہ عبدالوحید لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے تو یہیں مشفق خواجہ نے بی اے اور ۱۹۵۸ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ ایم۔ اے تو بے شمار ہوں گے لیکن خواجہ صاحب نے مسلسل مطالعے اور محنت سے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ اردو ادب کا خواہ کوئی موضوع ہو، تحقیق کرنے والا طالب علم ان سے ضرور مدد حاصل کرتا اور خواجہ صاحب بڑی فراخ دلی سے ان کی مدد کرتے۔ یوں گزشتہ چالیس برسوں میں پی ایچ ڈی کرنے والے بیشتر خواتین و حضرات خواجہ صاحب کی مدد ہی کی بنا پر یہ ڈگری حاصل کر پائے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

خواجہ صاحب محض ۲۳ برس کی عمر میں اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے معاون بن چکے تھے۔ بابائے اردو سے ان کا تعلق ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا جو ١٦ اگست ١٩٦١ء کو بابائے اردو کے انتقال تک جاری رہا۔ بابائے اردو خواجہ صاحب پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں انھیں انجمن ترقی اردو کے معروف پرچوں یعنی سہ ماہی 'اردو' اور ماہنامہ 'قومی زبان' کا مدیر مقرر کیا۔ یوں تو خواجہ صاحب نے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک انجمن ترقی اردو کی ملازمت کی لیکن حقیقتاً تادم آخر ان کا انجمن سے گہرا تعلق رہا۔ بابائے اردو کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کے علمی منصوبوں کے مختلف مراحل کی نگرانی سے تکمیل تک کا نازک کام اور ان کی نشر و اشاعت میں خواجہ صاحب کا پس پردہ کردار رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ بابائے اردو کے انتقال کے بعد خواجہ صاحب ہی نے انجمن ترقی اردو کے علمی منصوبوں کی تکمیل اور رسائل کی اشاعت کی ذمہ داری اعزازی طور پر سنبھال رکھی تھی۔ وفاداری بشرط استواری کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

خواجہ صاحب نے اپنا قیمتی وقت اور صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ انجمن ترقی اردو اور ادارہ یادگارِ غالب کے اشاعتی منصوبوں کی نگرانی تادم آخر کرتے رہے۔ انتقال سے قبل ادارۂ یادگارِ غالب کی تقریباً درجن بھر کتب ان کی نگرانی میں اشاعت کے مختلف مراحل میں تھیں۔ اب ان کے بعد اس بے غرضی سے ان اداروں کی کون خدمت کر سکے گا؟

خواجہ صاحب جتنے وسیع المطالعہ شخص تھے اور جتنے بڑے علمی کام وہ کر سکتے تھے، اس کے مقابلے میں ان کی مطبوعہ کتب بہت کم ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کی زندگی اور ان کی صلاحیتیں اپنی ذات اور اپنے کاموں کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے وقف تھیں۔ ان کی کتابوں میں 'تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا' (تحقیق و ترتیب) اقبال از احمد دین ، غالب اور صفیر بلگرامی، جائزۂ مخطوطاتِ اردو (جلد اول)، تحقیق نامہ (مجموعۂ مقالات)، ابیات (شعری مجموعہ)، کلیات یگانہ (تحقیق) اور ادبی کالموں کے تین مجموعے یعنی 'خامہ بگوش کے قلم سے'، 'سخن در سخن' اور 'سخن ہائے ناگفتنی' شامل ہیں۔ خواجہ صاحب دیگر کئی علمی و ادبی منصوبوں پر کام کر رہے تھے اور ان کے کئی مقالات اور کتابیں غیر مطبوعہ تھیں لیکن وہ انھیں شائع نہیں کراتے تھے۔ اس کی اصل وجہ ایک مرتبہ راقم نے یہ بیان کی کہ جب کوئی کتاب مکمل ہو جاتی ہے تو نظروں سے گر جاتی ہے۔ یہ مسئلہ صرف خواجہ صاحب ہی کا نہیں بلکہ بہت سے اور کاملیت پسند (Perfectionist) مصنفین کے ساتھ رہتا ہے۔ جائزۂ مخطوطات اردو کی کل چار جلدیں تیار کی تھیں۔ دوسری جلد ناشر نے ضائع کر دی۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی شائع نہ ہو سکیں۔ خواجہ صاحب کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ ان چاروں جلدوں کی اشاعت کے بعد وہ شہر شہر گاؤں گاؤں جا کر مخطوطاتِ اردو پر کم از کم دس بارہ جلدوں میں کام کریں لیکن ان کا یہ منصوبہ بھی ہمارے علم دشمن رویے کی بھینٹ چڑھ گیا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق (ص ۱۱۷)

☆ (نظیر صدیقی کے بقول) ”بمبئی کے نسوانی حسن میں روئے جمیل سے زیادہ لباس حریر کو دخل ہے۔ چنانچہ جب مجھے کسی نسوانی چہرے کو دیکھ کر مایوسی ہوتی تو تلافی کے لیے میں اس کے لباس کو دیکھنے لگتا۔“ شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے مومن خان مومن نے کہا تھا:

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی (ص ۲۲۳، ۲۲۴)

☆ ڈاکٹر گیان چند قدیم ادب کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے تہ کی خبر لاتے ہیں لیکن ساحل پر کھڑے ہوئے شاعروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ رویہ اہل تحقیق کی روایتی شان بے نیازی کے عین مطابق ہے اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ موتی سمندر کی تہ میں ہی ہوتے ہیں۔ ساحل پر خس وخاشاک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کا بھی یہی خیال تھا:

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات خار و خس وخاک (ص ۱۸۴)

خامہ بگوش بعض اوقات جملے کی ساخت میں شاعری سے بھی مدد لیتے ہیں جس سے تحریر میں شعریت کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

☆ اس مقالے کو فیض صاحب نے اپنے دل ریزہ ریزہ کی طرح گنوا دیا۔ (ص ۲۳۱)

☆ غالب کی کوئے ملامت کی طرح کوئے سیاست میں بھی داخلہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جسے کہیں امان نہ ملے، اسے یہاں سایۂ دیوار مل جاتا ہے۔ (۲۳۲)

☆ پہلے کوئے صحافت میں وہی آتے تھے جنھیں جان ودل عزیز نہیں ہوتے تھے، اب جان ودل کی جگہ ایمان نے لے لی ہے۔ (ص ۲۷۷)

خامہ بگوش کے کالموں میں اردو اشعار کے علاوہ کہیں کہیں فارسی اشعار اور ضرب الامثال کے نمونے بھی موجود ہیں۔ یہاں چند نمونے درج کیے جا رہے ہیں:

☆ اس موقعے پر ان (جون ایلیا) کا مجموعہ ”شاید“ شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ضخیم مجلّہ بھی منظر عام پر آیا جس میں ساٹھ ستر ہم عصروں نے انھیں ”خراج تحسین“ پیش کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس خراج تحسین کے ڈانڈے ”تحسین ناشناس“ سے جا ملتے ہیں۔ (ص ۲۵۷)

☆ رشید احمد صدیقی، کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کی وفات کے بعد اردو طنز ومزاح میں جو خلا پیدا ہوا

WWW.KITAABISTAN.COM

میں کتابیں ہیں، رسائل ہیں، مخطوطات ہیں مگر خواجہ صاحب نہیں۔ عجب نہیں کہ کسی گوشے سے خواجہ صاحب کا یہی شعر سنائی دے جائے

بجھے ہوئے درودیوار دیکھنے والو!
اسے بھی دیکھو، جو اک عمر یاں گزار گیا

WWW.KITAABISTAN.COM

وحید الرحمٰن خان

خامہ بگوش کا اُسلوب

اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''طریقہ، راستہ، روش''(۱) کے بیان کیے گئے ہیں۔ فارسی زبان میں ''اسلوب'' کے لیے ''سبک'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر ملک الشعرا بہار کی تحقیق کے مطابق:

> ''سبک در لغت تازی بمعنی گداختن و ریختن زر و نقرہ است و سبیکہ پارہ نقرۂ گداختہ را گویند، ولی ادبائی قرن اخیر سبک را مجازاً بمعنی ''طرزِ خاصی از نظم یا نثر'' استعمال کردہ اند و تقریباً آن را در برابر ''ستیل: Style ''از وپائیان نہادہ اند''(۲)

ترجمہ: عربی زبان میں سبک کے معنی سونے یا چاندی کو پگھلا کر کسی سانچے میں ڈھالنے کے ہیں اور ''سبیکہ'' پگھلی ہوئی چاندی کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ادیبوں نے سبک کو مجازاً نظم یا نثر کے طرزِ خاص کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس کو تقریباً یورپی ادیبوں اور نقادوں کی اصطلاح Style کے ہم معنی قرار دیا ہے۔ Penguin Dictionary میں اسلوب Style کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

> The characteristic manner of expression in prose or verse:how a particular writer says things.The analysis and assessment of style involves examination of a writer's choice of words, his figures of speech.The devices (rhetorical and otherwise). the shape of his sentences (whether they be loose or periodic).the shape of his paragraphs-indeed. of every conceivable aspect of his language and the way in which he uses it".(3)

ترجمہ: نظم و نثر میں اظہار و بیان کا خصوصی انداز یعنی کوئی خاص لکھنے والا کسی بات کو کیسے بیان کرتا ہے: اسلوب کا تجزیہ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین (ذیل کے عناصر سے ہوتا ہے) لکھنے والے کا انتخابِ الفاظ؛ صنائع و بدائع اور دوسرے ذرائع (جن میں خطیبانہ

WWW.KITABOSUNNAT.COM

> اور دیگر طریقے بھی شامل ہیں)؛ اس کے جملوں کی ساخت (کیا وہ ڈھیلے ڈھالے یا طویل ہیں) اور اس کے پاروں کی ساخت غرض اس کی زبان اور اس کے استعمال خاص کے بارے میں ہر وہ پہلو جو انسانی ذہن میں آسکتا ہو، اسلوب کا مطالعہ کہلاتا ہے۔

گویا اسلوب سے مراد کسی شاعر یا ادیب کا ادائے مطلب کا وہ انداز اور جذبات و خیالات کے اظہار و بیان کا وہ طریقہ ہے جو مصنف کی انفرادی خصوصیات سے وجود پزیر ہوتا ہے۔ مصنف کی یہ انفرادی خصوصیات جہاں اس کے انتخاب و استعمال الفاظ اور جملوں کی ساخت و ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے وہاں یہ مصنف کے مزاج، کردار، ماحول، مطالعہ، مشاہدہ اور اندازِ فکر جیسے عوامل سے بھی تشکیل پاتی ہیں۔ انفرادی خصوصیات کی اس رنگارنگی سے مختلف اسالیب وجود میں آتے ہیں۔ طارق سعید نے اپنی کتاب ''اسلوب اور اسلوبیات'' میں مشرق و مغرب کے مختلف تصورات و نظریات کی روشنی میں ''اسلوب'' کی مجموعی طور پر اکیس اقسام گنوائی ہیں۔ بعدازاں ان اقسام کی قطع و برید اور تحدید کرتے ہوئے وہ اسلوب کی نو اساسی قسمیں بیان کرتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ تعقیدی اسلوب
۲۔ مقفیٰ، مسجع، مرجز رنگین اور مرصع اسالیب
۳۔ بنیادی، سپاٹ، سادہ اسالیب
۴۔ بیانیہ، توضیحی اسلوب
۵۔ شگفتہ اور تاثراتی اسلوب
۶۔ انانیتی، خطیبانہ، جلیل اسلوب
۷۔ ظرافت اور طنز آمیز اسلوب
۸۔ ہیجانی، ماورائی، منتشر خیالی کا شکستہ اسلوب
۹۔ امتزاجی اسلوب (۴)

اگرچہ طارق سعید کی اس درجہ بندی سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، تاہم بغرضِ مطالعہ ان اقسام کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم خامہ بگوش کے کالموں کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے اسلوب کو ''ظرافت اور طنز آمیز اسلوب'' کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ خامہ بگوش اپنی کالمانہ تحریروں کی بدولت ایک طنز و مزاح نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کالموں میں طنز اور مزاح کا ایک دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔

یہاں طنز اور ظرافت باہم شیر و شکر دکھائی دیتے ہیں۔

مزاح اس شگفتہ کیفیت کا نام ہے جو زندگی اور ماحول کی ناہمواریوں اور بے ربطیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ بے ڈھنگی اور بے ہنگم چیزوں کو دیکھ کر ہم میں ہنسنے اور مسکرانے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ ایک مزاح نگار گرد و پیش کے ماحول کی ناہمواریوں اور بے قاعدگیوں کو دریافت کرتا ہے اور انھیں ہمدردانہ شعور کے ساتھ فنکارانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری خندۂ زیرِ لب کی کیفیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ مزاح نگار مختلف حربوں سے کام لیتے ہوئے تبسم، شگفتگی اور تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیق مزاح کے پانچ حربے بیان کیے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ موازنہ
۲۔ لفظی بازیگری
۳۔ مزاحیہ صورت واقعہ
۴۔ مزاحیہ کردار
۵۔ تحریف (۵)

خامہ بگوش کے ظریفانہ اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم ان ''ارکانِ خمسہ'' کے علاوہ مزاح کے دیگر حربوں کا جائزہ بھی لیں گے، نیز مزاح کے علاوہ ان عوامل اور اوصاف کو بھی بیان کریں گے جو خامہ بگوش کے اسلوب کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔

۱۔ موازنہ

موازنہ مزاح کی تخلیق کا ایک اہم حربہ ہے۔ یہ دو اشیاء کے مابین وہ تقابلی صورت ہے جو بیک وقت مشابہت اور تضاد کو نمایاں کرتی ہے اور اس عمل سے وہ ناہمواری پیدا کرتی ہے جو ہنسی کی تحریک کا باعث بنتی ہے۔ خامہ بگوش اپنی تحریروں میں اس حربے کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ ایک مثال دیکھیے:

> ایک زمانہ تھا کہ جب کسی شاعر کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے تو سب سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر کسی شاعر کا مجموعہ شائع نہ ہوا ہو تو اسے شاعر کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں شاعر کے مجموعے سے اس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا تھا، اب خامیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ (ص ۲۵۶)

خامہ بگوش نے یہاں ماضی اور حال کے موازنے سے ایک دلچسپ فضا مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے اس کے علاوہ بھی موازنے کی چند سطحیں بیان کی ہیں۔ ان کے مطابق:

> یہ موازنہ کبھی نہاں اور عیاں کا ہوتا ہے، کبھی حاضر اور غائب کا موازنہ طنز کا باعث بنتا ہے اور کہیں داخلی اور خارجی کیفیت ...... غرض ٹکراؤ اور تصادم کے ذریعے وہ طنزیہ و مزاحیہ کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ (۶)

ذیل میں ظفر عالم ظفری کے اس بیان کی تصدیق کے لیے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

☆ بہتر ہوگا کہ مصنف کے نام سے پہلے اس کے کچھ بزرگوں کے نام بتادیے جائیں تاکہ ان بزرگوں کی روحوں کو شرمندہ ہونے کا موقع مل سکے۔ اس صدی کے شروع میں لکھنؤ میں منشی امیر احمد علوی بڑے پائے کے ادیب گزرے ہیں۔ یہ محسن کاکوروی کے نواسے تھے۔ امیر احمد علوی کے صاحبزادے مشیر احمد علوی، ناظر کاکوروی بھی خاصے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ زیرِ نظر آپ بیتی کے مصنف انہی ناظر کاکوروی کے فرزند ہیں۔ ان کا نام ہے قیصر تمکین اور کتاب ''خبر گیر'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ (ص ۲۶۷)

(نہاں اور عیاں کا موازنہ)

☆ کسی افسانوی مجموعے پر مشفق خواجہ سے دیباچہ لکھوانا ایسا ہی ہے جیسے سعادت یار خان رنگین کے دیوان ریختی پر نظیر صدیقی سے دیباچہ لکھوایا جائے۔ (ص ۳۲۰)

(حاضر اور غائب کا موازنہ)

☆ بے حد حیرت ہے کہ وہ کم عمری ہی میں ساٹھ برس کے ہوگئے ہیں...... ان (کی) تحریروں کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ وہ نوجوان ہوں گے...... افسوس کہ ہمارے ذہن میں انور سدید نام کا جو جوانِ رعنا تھا وہ چشم زدن میں پیر فرتوت بن گیا۔ (ص ۱۱۴)

(داخل اور خارج کا موازنہ)

موازنے کی ایک صورت لفظی بھی ہوسکتی ہے، مثلاً جب خامہ بگوش ''مکالمات افلاطون'' کے بعد ''مکالمات انیس ناگی'' کو اہم قرار دیتے ہیں (۸۹) تو خندہ آور لفظی موازنے کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

۲۔ لفظی بازیگری

لفظی بازیگری ظرافت کا ایک کارآمد حربہ ہے۔ اس کی ایک معروف صورت رعایت لفظی ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

خامہ بگوش کے ہاں رعایت لفظی کا اظہار متعدد بار ہوا ہے۔ یہ اظہار عام طور پر بے تصنع اور بے ساختہ ہوتا ہے اس میں برجستگی کا حسن پایا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ (اشک صاحب) گھنٹوں بے تکان تقریر کرتے ہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہیں۔ (ص۷۵)

☆ کتاب کا نام ''دامن یوسف'' کی بجائے ''دامن تار تار'' ہونا چاہیے کیوں کہ اس کے ہر صفحے پر ''دست زلیخا'' کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ (ص۴۸)

☆ ڈاکٹر نارنگ لسانیات ہی کے نہیں، لسّانیات کے بھی ماہر ہیں۔ (ص۵۵)

☆ کاش محترمہ اپنے خطوں کی نقل اپنے پاس رکھ لیتیں تو ان کی شمولیت سے کتاب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی۔ اس لیے کہ ایک آگ پڑھنے والے کے دل میں بھی تو بھڑک اٹھتی۔ (ص۴۱)

☆ اشک صاحب نے دراصل دو دکانیں کھول رکھی ہیں۔ گھر میں پرچون کی اور ادب میں تھوک کی دکان ہے۔ (۸۷)

☆ ممکن ہے بعض حس پیشہ کوتاہ اندیش اس بلب کو زیرو پاور کا بلب قرار دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر جمیل ہزار کینڈل پاور سے کم نہیں۔ وہ ایک ایسا چراغ انجمن افروز ہیں جس سے لوگوں کے ذہن کسب نور کرتے ہیں اور پھر بھی ماؤف نہیں ہوتے۔ (ص۹۰)

خامہ بگوش لفظوں سے بعض اوقات اس انداز میں کھیلتے ہیں کہ ان میں ایہام اور ذو معنویت (pun) کی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ محبوب الرحمٰن فاروقی نے اسی لیے انھیں ''لفظوں کا جادوگر'' کہا ہے۔(۷) خامہ بگوش کو لفظوں کے املائی اور معنوی تشابہات کو اجاگر کرنے میں کمال حاصل ہے۔ وہ ترمیم و اضافہ سے نئے الفاظ و تراکیب بھی وضع کرتے ہیں جن میں قاری کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ انجمن ترقی معکوس پسند مصنفین، خودساختیات، وروودنا مسعود، بزرگی بہ سال گرہ، اخراج تحسین، شرح ناخواندگی، ادب عالیہ امام، استقاط سخن، بلائے ہفت حجرہ، کلام ناموزوں، مشاعرہ گردی وغیرہ۔

خامہ بگوش لفظوں کے مضحکہ خیز املا سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں املائی تصرفات نہیں پائے جاتے اور اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اس عمل سے قاری کی چشم تماشا تو محظوظ ہوتی ہے لیکن اس میں ذہن کے لیے تفریح کا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔

خامہ بگوش کی تحریروں کا ایک وصف اختصار اور جامعیت ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال میں فضول خرچی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں ''کفایت لفظی'' کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اسی کفایت کو روح ذکاوت کہا گیا ہے۔ محبوب الرحمٰن فاروقی کے بقول'' (خامہ بگوش) ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور جن کے جملوں سے کبھی کوئی ایک لفظ حذف کر دینا یا بدل دینا ممکن نہیں۔''(۸)

خامہ بگوش حرمت لفظ کے قائل ہیں۔ لفظ، ان کے نزدیک محض حروف کا مجموعہ نہیں بلکہ زندہ، متحرک اور جاندار ہوتے ہیں۔ ایک کالم میں لکھتے ہیں:

> ''لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انھیں عزت بھی ملتی ہے اور ذلت بھی۔ کبھی یہ معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلند مدارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔''(۹)

ایک مزاح نگار کی حیثیت سے خامہ بگوش کے نزدیک ''لفظ'' کی بہت اہمیت ہے۔ وہ تخلیق مزاح کے لیے لفظوں سے بے تکلفی تو برتتے ہیں لیکن یہ بے تکلفی دوستانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ بعض ظرافت نگاروں کی طرح وہ لفظوں سے معاندانہ سلوک نہیں کرتے۔

۳۔ مضحک صورتِ واقعہ

خامہ بگوش مضحک صورتِ واقعہ (humorous situation) سے بھی تخلیق مزاح کا کام لیتے ہیں۔ مضحک صورت واقعہ کی کامیابی یہ ہے کہ حالات و واقعات ایک فطری بہاؤ کے تحت کسی ناہمواری کو جنم دیں، اس میں کسی شعوری کاوش کو دخل نہ ہو۔ یہ ناہمواری اکثر کسی کردار کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

> صورتِ واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاق وقت (coincidence) کو عام طور سے بروئے کار لاتا ہے۔(۱۰)

ایک ماہر مزاح نگار کی حیثیت سے خامہ بگوش تخلیق واقعہ کے لیے ان تینوں عناصر سے مدد لیتے ہیں جن سے تحریر میں شوخی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ایک مضحک واقعہ، خامہ بگوش کی زبانی نقل کیا جا رہا ہے:

> .....پچھلے دنوں ہم حیدر آباد سندھ جا رہے تھے بس میں ہمارے ساتھ جو صاحب بیٹھے تھے، ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ ہمیں

> ان صاحب کی بدذوقی پر حیرت ہوئی کہ بس کے تمام مسافر تو ڈرائیور کے ذاتی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے نازیہ اور زوہیب کے گانوں سے محظوظ ہو رہے ہیں اور یہ صاحب کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اسی دوران بلا ارادہ ہماری نظر اس صفحے پر پڑی جو موصوف کے سامنے کھلا تھا، اس پر جلی حروف میں یہ عنوان درج تھا، ''شان الحق حقی کی شادی پر، غالب سے معذرت کے ساتھ'' ہم شان صاحب کے پرانے نیاز مند ہیں اس لیے اس عنوان پر ہمیں بے حد تعجب ہوا۔ شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ شان صاحب غالب کے دیوان کی شرح لکھتے یا تضمین کرتے تو معذرت کی گنجائش تھی مگر شادی تو بالکل ایک مختلف کام ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہم نے اپنے ہم سفر سے کتاب دیکھنے کی اجازت چاہی تو انھوں نے فوراً اسے ہمارے حوالے کر دیا، جیسے وہ اسی انتظار میں ہوں کہ کوئی ان سے کتاب لے لے۔ اس کے بعد وہ تو گانے سننے میں اور ہم کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ (ص ۲۸۳،۲۸۴)

خامہ بگوش صرف ایک ''واقعہ نگار'' نہیں بلکہ ان ہاں طبع زاد اور خود ساختہ واقعات بھی ملتے ہیں۔ تاہم وہ زیادہ تر دوسروں کو پیش آنے والے واقعات سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ واقعہ کالم کی مطالعگی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہر دوسرے کالم میں کوئی نہ کوئی قصہ یا روایت ضرور پڑھنے کو ملتی ہے۔ خامہ بگوش کے پیش کردہ واقعات علمی و ادبی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی حیثیت تاریخی ہوتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

- صفیر بلگرامی کا قصہ یہ ہے کہ جب خواجہ سخن دہلوی (صاحب ''سروشِ سخن'') ان کی شاگردی سے منحرف ہو گئے تھے تو صفیر بلگرامی ان کا ذکر اس طرح کیا کرتے تھے، ''جب تک خواجہ سخن مجھ سے اصلاح لیتے رہے، اچھا شعر کہتے تھے، اب تو وہ شعر نہیں کہتے، گھاس کاٹتے ہیں۔'' (ص ۱۶۳،۱۶۴)
- جس زمانے میں وہ (نظم طباطبائی) کلکتے میں تھے، وہاں کے ایک انگریز صاحب بہادر نے کچھ شاعروں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ آپ لوگ اردو کی ایک ایسی گرامر لکھ دیں جو عام لوگوں کے کام آ سکے۔ ان شاعروں نے آپس میں مشورہ کر کے صاحب بہادر کو جواب دیا، ''ہم یہ کام نہایت

خوش دلی سے کر دیں گے بشرطیکہ گرامر کی کتاب منظوم ہو۔” صاحب بہادر کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے پوچھا، “کتاب نثر میں کیوں نہ ہو؟” جواب ملا، “نظم لکھنا ہمارے لیے آسان ہے، زندگی بھر اس کی مشق کی ہے، نثر لکھنا ایک بالکل مختلف کام ہے جو ہم لوگوں کے بس کا نہیں۔” (ص ۱۷۵)

☆ ایک نئے شاعر نے ایک پرانے شاعر کے سفارشی خط کے ساتھ اپنی غزل شاہد احمد دہلوی مرحوم کو رسالہ “ساقی” میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ شاہد صاحب نے اس کے جواب میں شاعر کو لکھا، “آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جن صاحب سے آپ نے سفارشی خط لکھوایا ہے، ان کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں، لہٰذا غزل واپس بھیج رہا ہوں۔” (ص ۱۸۳)

خامہ بگوش اس طرح کے دلچسپ واقعات محض قصہ گوئی کے شوق میں نقل نہیں کرتے بلکہ صورت حال کے مطابق ان کا اطلاق کرتے ہیں اور اگر انھیں کوئی واقعہ میسر اور مستحضر نہ ہو تو وہ خود کوئی واقعہ تخلیق کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے طبع زاد واقعات میں استاد لاغر مرادآبادی کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ایک مضحک کردار ہے اس لیے اس کی موجودگی سے واقعے میں دلچسپی اور شگفتگی کے عنصر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ لطیفہ

لطیفہ، واقعے کی لطیف ترین صورت ہے۔ مزاح نگار تحریر کو دلچسپ اور شگفتہ بنانے کے لیے لطائف و ظرائف سے بھی مدد لیتے ہیں۔ لطائف کو عام طور پر ایک غیر تخلیقی کام کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مزاح نگار مستعمل اور مستعار لطیفوں کو اپنی تحریر میں جگہ دیتے ہیں اور لطیفے کے استعمال میں جس بروقتی اور برجستگی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا خیال نہیں رکھتے۔ خامہ بگوش کی خوبی یہ ہے کہ وہ پامال لطائف سے گریز کرتے ہیں۔ وہ تازہ لطائف کو بروقت اور برمحل استعمال کرنے کے ہنر سے واقف ہیں؛ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی کے گوپی چند نارنگ سے مخاطب ہونے پر لکھتے ہیں:

> جب آپ کی کوئی اچھی تحریر دیکھتا ہوں تو رشک آتا ہے کہ کاش یہ میں نے لکھی ہوتی، کبھی میری بھی کسی ٹوٹی پھوٹی تحریر دیکھ کر آپ کا بھی جی للچاتا ہوگا۔ (ص ۵۷)

تو اس موقعے پر خامہ بگوش لطیفہ “چست” کرتے ہیں:

> ایک مرتبہ حبیب جالب نے مرحوم ناصر کاظمی سے کہا، “جب کبھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں، دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے

چھپتی۔" ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد حبیب جالب نے پوچھا، "میری غزل دیکھ کر آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟" ناصر کاظمی نے کہا، "خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی۔" (ص ۵۷، ۵۸)

اسی طرح ایک انٹرویو میں جب پروین شاکر، عطاء الحق قاسمی کے سوال کے جواب میں کہتی ہیں کہ انھوں نے "خوشبو" میں سارا کلام شامل نہیں کیا بلکہ بہت سی تخلیقات مسترد بھی کی ہیں، تو ان کے بیان پر خامہ بگوش نے ایک لطیفے کی صورت میں یوں تبصرہ کیا ہے:

> ......ایک شاعر نے اپنا مجموعۂ کلام ایک نقاد کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا: "میں نے اپنا آدھا کلام رد کر دیا ہے اور آدھا اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔" نقاد نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا: "یہ آپ نے اچھا کیا۔ پڑھنے والوں کو اس سے بڑی سہولت ہوگی کہ انھیں بھی آپ کا آدھا کلام ہی رد کرنا پڑے گا۔" (ص ۲۲۱)

خامہ بگوش سیاسی، سماجی اور مذہبی لطائف کے بجائے ادبی لطائف کو اپنے کالموں کی زینت بناتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس باب میں ان کی معلومات محققانہ نوعیت کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ......اردو میں ادبی لطیفوں کی پہلی کتاب "بزمِ خیال" ہے جو صفدر میرزا پوری نے لکھی تھی۔ یہ موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری اور بہترین کتاب "انتخاب نادرہ" ہے جو منشی دیبی پرشاد بشاش کی تصنیف ہے۔ یہ دوسری دہائی میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں مفتی ولی اللہ ایبٹ آبادی کی کتاب "نمکدان فصاحت" لاہور سے اور مفتی انتظام اللہ شہابی کی "لطائف الشعراء" تقسیم ہند سے کچھ پہلے دہلی سے چھپی تھی۔"(۱۱)

اس اقتباس سے خامہ بگوش کی لطائف سے دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ خامہ بگوش محض لطیفہ باز نہیں، وہ لطیفہ ساز بھی ہیں۔ انور سدید کے نزدیک:

> ان کا مزاحی عمل لطیفے کی تعمیر و تخلیق کے عمل سے زیادہ مشابہ ہے۔ وہ بات کو آہستہ آہستہ ایک مخصوص بلندی تک لاتے اور جذباتی فضا پیدا کرتے ہیں اور بلندی سے جب اچانک گیند کو لڑھکا دیتے ہیں تو ان کی مطلوبہ مزاحی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ (۱۲)

ذیل میں خامہ بگوش کے ''مزاحی عمل'' کا ایک نمونہ دیا جا رہا ہے۔

> اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر وزیر آغا جیسا صاحب فکر نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار ملا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید جیسا بالغ نظر عقیدت مند اور طرف دار ملا۔ ڈاکٹر انور سدید کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں ہم جیسا حوصلہ مند قاری ملا۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر انور سدید کی بیس عدد تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ہماری صحت بھی اتنی اچھی ہے کہ ان کی زیر طبع نصف درجن کتابوں کے انتظار میں ہم زندگی کے دن ایسی بے چینی سے کاٹ رہے ہیں جیسے کوئی مجرم عمر قید کی سزا رہائی کی امید میں کاٹتا ہے۔ (ص ۱۲۷)

یہاں مزاحی کیفیت میں بتدریج وہ ارتقا نظر آتا ہے جس کے انجام پر مسکراہٹ قاری کا استقبال کرتی ہے۔

۵۔ افسانہ

واقعے اور لطیفے کے ساتھ ساتھ خامہ بگوش کی تحریروں میں افسانوی عناصر کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ موضوع کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے بعض اوقات ایک افسانوی ماحول اور فضا ترتیب دیتے ہیں لیکن اس عمل میں بھی اپنی روایتی زندہ دلی اور شگفتگی کو قائم رکھتے ہیں۔ ان کے ایک ''شگفتہ افسانے'' کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

> ایک محفل میں فیض احمد فیض کے کمالات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ ایک ضرورت سے زیادہ ترقی پسند نے فرمایا: ''فیض کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو بہت سے ایسے اشعار دیے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔'' اس کے بعد انھوں نے یہ دو شعر سنائے:
>
> میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
> لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
> ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
> جہاں تلک بھی ستم کی سیاہ رات چلے
>
> اہل محفل ان شعروں پر جھومنے لگے اور ہمارا سر گھومنے لگا۔ ہم نے گزارش کی کہ یہ شعر

فیض کے نہیں ہیں۔ اس پر نقاد موصوف نے طنزیہ انداز میں فرمایا: ”تو کیا آپ کے ہیں؟“ ایک دوسرے صاحب نے جناب نقاد کی تائید میں کہا: ”تمام سیاسی جلسوں میں یہ شعر فیض ہی کے نام سے پڑھے جاتے ہیں۔“ تیسرے صاحب یوں لب کشا ہوئے: ”اب لوگ فیض کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کے شعروں کو بھی ان کے شعر ماننے کے لیے تیار نہیں۔“ اگرچہ اس ہجوم عاشقاں میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا لیکن ہم نے ہمت سے کام لے کر عرض کیا: ”بلاشبہ فیض بڑے شاعر ہیں لیکن ہر اچھا شعر ان کا نہیں ہوسکتا۔ دوسروں نے بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ جو دو شعر آپ نے سنائے ہیں، وہ فیض کے نہیں مجروحؔ سلطان پوری کے ہیں......“ (ص ۳۱۰)

۶۔ انشائیہ

خامہ بگوش کی شگفتہ مزاجی بعض مقامات پر ”انشائیے“ کی تخلیق کا موجب بنتی ہے۔ انشائیے کی تعریف کے بارے میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ تاہم ایک بات طے ہے کہ انشائیہ دراصل چراغ سے چراغ جلانے کا نام ہے۔ یہ چراغ کبھی لفظ کی صورت میں اور کبھی خیال کی شکل میں روشن ہوتے ہیں۔ خامہ بگوش کے ہاں ٹکڑوں کی صورت میں متعدد انشائیے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ایک مختصر انشائیہ ملاحظہ ہو جس کا عنوان ”کاغذ اور عبدالعزیز خالد“ ہوسکتا ہے:

> ......سمندر کو کوزے میں بند کرنا اور کوزے کے پانی کو سمندر میں تبدیل کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دائیں ہاتھ کا کھیل یہ ہے کہ وہ خالد کے خیالات عالیہ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اور صفحۂ قرطاس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس سارے بوجھ کو بخوبی سہار لیتا ہے، اسی لیے تو خالد کی کتابوں میں نہایت دبیز اور مضبوط کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کاغذ وہی ہے جس سے پرانے زمانے میں کاغذی پیرہن تیار کیے جاتے تھے۔ فریادی انھیں پہن کر فریاد کرتے تھے۔ اب کاغذی پیرہن کا رواج نہیں رہا۔ اس لیے کاغذ پر جو کچھ لکھا ہوتا ہے اسی کو پڑھ کر فریاد کی لے تیز ہو جاتی ہے۔ (ص ۹)

خامہ بگوش کا انشائی رویہ جہاں خیال و حرف کے نئے دریچے وا کرتا ہے وہاں شگفتہ طبعی کا باعث بھی بنتا ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

۷۔ مزاحیہ کردار

مزاحیہ کردار مزاح نگاری کا ایک خاص حربہ ہے۔ اکثر شگفتہ نگار تخلیق مزاح کے لیے کوئی نہ کوئی مزاحیہ کردار تخلیق کرتے ہیں۔ مشتاق یوسفی کا مرزا عبدالودود بیگ اور خالد اختر کا چچا عبدالباقی ایسے ہی مضحک کردار ہیں۔ خامہ بگوش نے بھی استاد لاغر مراد آبادی کے نام سے ایک کردار وضع کر رکھا ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کردار ادبی دنیا کا ایک فرد ہے۔ ادبی کردار کی پیشکش اس لیے ضروری تھی کہ خامہ بگوش کے کالموں کے موضوعات علم و ادب سے متعلق ہیں۔ ناقدین نے اگرچہ لاغر مراد آبادی کو چچا چھکن اور خوجی کے مماثل قرار دیا ہے، تاہم یہ کردار ذاتی خصوصیات کی بنا پر اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی کی انفرادیت یہ ہے کہ "وہ ایک ایسا کردار ہے جو ادب کے جملہ مسائل کا شعور رکھتا ہے اور ان پر اپنی گراں قدر رائے بھرپور انداز میں پیش کرنا اپنا حق تصور کرتا ہے"(١٣) یوں لاغر مراد آبادی ادبی کالموں کے ایک کردار کی حیثیت سے منظر عام پر آتا ہے اور چونکہ ادبی کالموں میں واقعاتی مزاح کی گنجائش کم کم ہوتی ہے، اس لیے اس کردار میں ہمیں حرکت و عمل کا فقدان نظر آتا ہے۔ یہ ایک جامد کردار ہے لیکن جب خامہ بگوش کو تخلیق واقعے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس میں بھی زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور وہ بلا تکلف واقعہ کا مرکزی کردار بن کر ماحول کو دلچسپ اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔ لاغر مراد آبادی کسی احمق کردار کا نام نہیں، وہ ایک بت طناز ہے۔ وہ ادبی معاشرے کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر ایک سخت گیر نقاد کی طرح تبصرہ کرتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> انیس ناگی کا خیال ہے کہ غالب کے اپنی بیوی سے تعلقات ناخوشگوار تھے۔ دلیل یہ دی کہ دن بھر تو غالب قلعۂ معلی میں رہتے تھے اور شام کو شراب پیتے اور دوستوں سے گپ بازی کرتے تھے۔ استاد لاغر مراد آبادی نے یہ سن کر فرمایا: "یہ عجیب و غریب منطق ہے۔ آج کل کے اکثر ادیب صبح سے شام تک دفتروں میں رہتے ہیں اور پھر رات کے ایک بجے تک پاک ٹی ہاؤس قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھتے ہیں، کیا ان سب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ ان کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے؟" استاد گرامی کے اس سوال کا جواب انیس ناگی ہی دے سکتے ہیں۔ دو بڑوں کے درمیان بحث میں دخل دینے کی ہم جسارت نہیں کر سکتے۔ (ص ٢١٤)

WWW.KITABOSUNNAT.COM

چونکہ زیر نظر تصنیف ''خامہ بگوش کے قلم سے'' منتخب کالموں کا مجموعہ ہے، چنانچہ یہاں صرف چند مقامات پر استاد لاغر مراد آبادی جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر کالموں کا مطالعہ کیا جائے تو لاغر مراد آبادی ایک ایسے کردار کے طور پر ابھرتا ہے جس کا کام محض مصنف سے ہم کلام ہونا ہے۔ تاہم وہ ایک جان دار ادبی مکالمے کا موجب بنتا ہے۔ ''اگلے وقتوں کے شاعران کرام'' کے عنوان سے ایک کالم مکمل طور پر مصنف لاغر مراد آبادی کے مابین مکالمے پر مشتمل ہے۔ لاغر مراد آبادی کی طنزیہ گفتگو خاصی حکمت افروز ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اسی لیے اس کردار کو دانش مند بزرگ (old wiseman) کہا ہے۔(۱۴) یہ بزرگ دراصل خامہ بگوش کا ہمزاد ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح مشفق خواجہ نے اپنے چہرے پر خامہ بگوش کا نقاب اوڑھ رکھا ہے، بالکل اسی طرح خامہ بگوش نے لاغر مراد آبادی کا لبادہ پہن رکھا ہے۔ چنانچہ ''جس بات کو (خامہ بگوش) اپنی زبان فیض ترجمان سے نہیں کہنا چاہتے، اس کو لاغر مراد آبادی کی زبان سے ادا کر دیتے ہیں۔''(۱۵) شمیم حنفی نے اس خیال کی تعبیر یوں کی ہے:

> (یہ کردار) خامہ بگوش کو درپیش بعض کٹھن گھڑیوں میں اچانک ایک غیبی سائے کی صورت نمودار ہوتا ہے، اور وہ کچھ کہہ جاتا ہے، ایک ناقابل تقلید لوچ کے ساتھ، جسے کہنے کے لیے خامہ بگوش کو ہزار بہانے درکار ہوتے ہیں۔(۱۶)

مذکورہ بالا رائے سے اس نتیجے تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ لاغر مراد آبادی ایک ''مہمان کردار'' ہے جس کی کالموں میں موجودگی وقتی اور لمحاتی ہوتی ہے۔ تاہم اس مختصر دورانیے میں وہ اپنا کردار بخوبی ادا کرتا ہے اور اپنی گفتگو سے تحریر کی شگفتگی اور معنویت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ گفتگو کا ایک نمونہ دیکھیے:

> ''(سحر انصاری) نوجوانوں ہی میں نہیں، بزرگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد لاغر مراد آبادی نے وصیت کر رکھی ہے کہ ان کی نماز جنازہ سحر انصاری سے پڑھوائی جائے۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا تو استاد نے فرمایا: ''میں اپنی کسی کتاب کی رونمائی کا اور اپنے ساتھ شام منانے کا قائل نہیں ہوں۔ شام غریباں کو تو آنا ہی ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ شام سحر انصاری کی امامت میں منائی جائے۔'' ہم نے عرض کیا: ''انصاری صاحب صرف زندہ ادیبوں کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔'' فرمایا: ''پھر تو انھیں میری تقریب میں ضرور آنا چاہیے کیوں کہ مرنے کے بعد میرا شمار بھی زندہ جاوید ادیبوں میں ہوگا۔''(۱۷)

WWW.KITABOSUNNAT.COM

استاد لاغر مراد آبادی کی لفظی موشگافی ملاحظہ ہو:

> اس کتاب (گفتگو) کے سرورق پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے: ”ترقی پسند تحریک کے نظری مسائل، اثرات اور مخالفین کے اعتراضات پر مشاہرین ادب سے بات چیت“۔ لفظ ”مشاہرین“ کا استعمال قابل غور ہے۔ ہم سے یہ معما حل نہ ہوا تو استاد لاغر مراد آبادی کو زحمت فکر دی گئی۔ انھوں نے فرمایا، ”مشاہرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو مشاہرہ لے کر......“ ہم نے استاد کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا کہ ”مشاہرین“ کا ”مشاہرے“ سے رشتہ جوڑنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ ہم نے عرض کیا: ”اس میں کچھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔“ استاد نے فرمایا: ”ہاں، اس کا بھی امکان ہے۔ آخر خود ترقی پسند تحریک بھی تو ہماری تاریخ ادب میں کتابت کی ایک غلطی ہی تو ہے۔“ (ص ۲۷۲)

سادہ لوحی، حاضر جوابی، بے ساختگی اور شگفتگی استاد لاغر مراد آبادی کے کردار کے نمایاں اوصاف ہیں لیکن ان اوصاف کے باوصف یہ ایک لازوال کردار نہیں بن پایا اور اس کی وجہ کالم کی صنف کی مجبوریاں ہیں۔ اس کے باوجود یہ اردو ظرافت کا ایک قابل ذکر کردار ضرور ہے۔

۸۔ خاکہ

لاغر مراد آبادی تو ایک فرضی اور خیالی کردار ہے لیکن خامہ بگوش ادبی دنیا کے بعض زندہ کرداروں کی جھلکیاں بھی اپنے کالموں میں پیش کرتے ہیں جن سے ان کی ”کردار نگاری“ کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ باقاعدہ طور پر خاکہ نگار نہیں ہیں لیکن ادبی معاشرے کے کسی کردار یا شخصیت کی تصویر بہت ہنر مندی سے بناتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی یہ تصاویر عام طور پر نامکمل ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں خاکہ نگاری کے مختصر نمونے آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں، اس لیے ہم انھیں ”خاکچہ نگار“ کہہ سکتے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> ہم نے میرزا ادیب کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس لیے ہمارے ذہن میں ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا تصور کچھ اس قسم کا تھا کہ لوگ انھیں سہارا دے کر اٹھاتے اور بٹھاتے ہوں گے اور ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے نوجوان ان کے لیے عصائے پیری کا کام دیتے ہوں گے لیکن جب انھیں دیکھا تو معاملہ برعکس تھا۔ وہ ماشاء اللہ جوانوں سے بڑھ کر جوان ہیں۔ چہرہ روشن، جسم پھرتیلا، چال کڑی کمان کا تیر۔ وہ ستر سے اوپر کے بالکل

نہیں لگتے اور اگر ہوں تو بھی ان کا سال ۳۶۵ دنوں کا نہیں ہو سکتا اس سے کہیں کم کا ہوگا۔ (ص ۲۶۹)

خامہ بگوش شخصیت کے محض ظاہر تک محدود نہیں رہتے بلکہ باطن کو دریافت کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ وہ نفسیاتی تجزیے کو بروئے کار لاتے ہیں اور شخصیت کی تحلیل نفسی بھی کرتے ہیں۔ وہ ''شخصیت کے اندر جو دراڑیں یعنی fissures پڑ گئی ہیں'' انھیں نمایاں کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ (۱۸) خامہ بگوش شخصی مطالعے کا کام بالواسطہ طور پر بھی انجام دیتے ہیں یعنی تصنیف کی معرفت مصنف کی شخصیت اور نفسیات کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انور سدید کے مطابق:

> (وہ) مصنف کی شخصیت کے داخلی زاویوں تک اس کی تصنیف کے حوالے سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کتاب وہ آئینہ ہے جو مصنف کے خد و خال کا انعکاس مشفق خواجہ پر کرتا ہے۔''(۱۹)

اگرچہ خامہ بگوش کے تصویر خانے کی بیشتر تصاویر نامکمل اور ادھوری ہیں لیکن ان میں سے اکثر شوخ رنگوں سے بنائی گئی ہیں۔ زیادہ تر نقش خامہ بگوش کی شوخی تحریر کے فریادی ہیں کیوں کہ ''ان میں بہت سے تصویریں ایسی ہیں جنھیں ہیئت کذائی یعنی مسخاکی (caricaturing) کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔''(۲۰)

مشتاق یوسفی نے کیری کیچر (caricature) کے لیے ''مسخاکہ'' (مسخ + خاکہ) کی ترکیب وضع کی ہے۔ ذیل میں خامہ بگوش کے مختلف ''مسخاکوں'' سے چند جملے نقل کیے جا رہے ہیں:

☆ (سلطان جمیل نسیم) دیکھنے میں لڑکے ہی نظر آتے ہیں اور لڑکے بھی ایسے جیسے ابھی ابھی میر تقی میر کی کلیات سے برآمد ہوئے ہوں۔ (ص ۳۲۱)

☆ ہم کم از کم تین ایسے آدمیوں کو جانتے ہیں جنھیں باقر مہدی نے ہمیشہ خوش رکھا ہے۔ ان میں سر فہرست تو باقر مہدی خود ہیں، حسن اتفاق سے باقی دو افراد کا نام بھی باقر مہدی ہی ہے۔ (ص ۱۷۳)

☆ اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ ان کی ایک ہتھیلی پر تصوف ہے اور دوسری پر دنیا۔ وہ یاد نہیں رکھتے کہ کس ہتھیلی پر کیا ہے، لہٰذا تصوف سے کاروبار دنیا کو اور دنیاوی سوجھ بوجھ سے مسائل تصوف کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا لیتے ہیں۔ (ص ۱۰۵)

☆ عتیق احمد سے ہمیں ذاتی نیاز مندی کا شرف حاصل ہے اور ان کے صاحب مطالعہ ہونے کے ہم چشم دید بلکہ بچشم گریاں گواہ ہیں۔ (ص ۱۵۷)

خامہ بگوش کے ہاں اس نوع کی مثالیں متعدد جگہوں پر ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ قائم کرنا مشکل نہیں کہ ان کے اندر ایک فطری خاکہ نگار موجود ہے لیکن ''وسعت بیان'' کے لیے انھیں ''خاکچے'' کی تنگنائے سے نکلنا ہوگا۔

۹۔ تحریف

تحریف (parody) ظرافت نگاری کا ایک معروف حربہ ہے۔ تحریف کسی سنجیدہ کلام کی غیر سنجیدہ نقالی کا نام ہے۔ اسے مضحک نقالی، ہجویہ تقلید اور تقلید معکوس بھی کہا گیا ہے لیکن اب تحریف کا لفظ ہی ایک ادبی اصطلاح کے طور پر رواج پا چکا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ (۲۱)

تاہم تحریف میں لفظی کے علاوہ معنوی نقالی بھی کی جا سکتی ہے اور تضحیک کے علاوہ یہ تحسین کی ایک شکل بھی ہو سکتی ہے۔ ظرافت کی شریعت میں تحریف گویا فرض کی طرح شامل ہے چنانچہ ہمیں صف اول کے تمام مزاح نگاروں کے ہاں کسی نہ کسی سطح پر تحریف کا استعمال نظر آتا ہے۔ پطرس کا ''لاہور کا جغرافیہ'' اور ابن انشا کی ''اردو کی آخری کتاب'' تحریف کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ خامہ بگوش کے کالم ''رسالہ در معرفت ابنِ انشا'' کو انور سدید نے بے مثال پیروڈی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ایک تحریف سے ہی انھوں نے مزاح نگاروں میں مقام امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ (۲۲) اس تحریف کی ''تمہید'' درج ذیل ہے:

> ''دنیائے ادب بھی عجیب جائے عبرت ہے کہ جہاں شہرت اور گم نامی دونوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کل جو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں صف اول میں تشریف فرما تھے، آج ان کا نام و نشاں صف نعال میں بھی نہیں ملتا۔ ادبی تاریخوں کے متن تو کیا حواشی بھی ان کے تذکرے سے خالی ہیں۔ بشرطیکہ یہ ادبی تاریخیں انھوں نے خود نہ لکھی ہوں۔ (۲۳)

اس کالم میں خامہ بگوش نے تمہید، سبب تالیف، وطن، تصانیف، مشاغل، معاصرین اور خاتمہ کے عنوانات کے تحت قدیم طرز تحریر کا جدید انداز میں چربہ اتارا ہے۔

زیر مطالعہ تصنیف ''خامہ بگوش کے قلم سے'' میں تحریف کا محض ایک نمونہ شامل ہے لیکن اس نمونے کو بآسانی اردو ادب کی چند یادگار تحریفات میں رکھا جا سکتا ہے۔ کالم ''ایک اور غالب شکن'' میں خامہ بگوش نے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

غالب کی مکتوب نگاری کے اسلوب کی نقالی کی ہے۔ طرز غالب میں خط تحریر کرنا کسی قیامت سے کم نہیں لیکن اس کالم میں " غالب کے انداز نگارش کی نقل اس خوبی کے ساتھ کی گئی ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔" (۲۴)

غالب کے اسلوب میں لکھے گئے اس خط کا آغاز دیکھیے:

> سعادت و اقبال نشان، اختر فلک معنی و بیان، محمد خالد المتخلص بہ اختر کو غالب خستہ کا سلام پہنچے۔ تمھاری کتاب "مکاتیب خضر" بہ سبیل ڈاک آئی۔ تمھارا نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیوں شایان لطف گردانا۔ بہت سوں سے تمھارے بارے میں پوچھا لیکن کوئی آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو، ظرافت میں ید طولی رکھتے ہو، یعنی عجیب و غریب ہو۔ (ص ۲۴)

اب اختتام ملاحظہ ہو:

> اچھا، اب اجازت دو۔ کوئی بات بری لگے تو معاف کر دینا مگر خدا کے لیے انتقام کے خیال سے میرے انداز تحریر میں کوئی اور کتاب نہ لکھ دینا۔ میری جان! اپنا راستہ الگ نکالو کہ تمھارے لکھے کو دیکھ کر لوگ یہ کہیں ابداع اس کو کہتے ہیں۔ جدت طرز اس کا نام ہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمھاری تحریر دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ یہ چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔
>
> اپنے کرم فرماؤں سے نجات کا طالب۔ غالب۔ (ص ۲۷)

۱۰۔ شعریت

خامہ بگوش کی تحریروں میں اسلوب کی تحریف کے بعض نمونے تو دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن ان کے ہاں شعر یا مصرعے کی تحریف کی مثالیں نہیں پائی جاتیں۔ دراصل وہ اپنی نثر میں "شاعری" کی آمیزش کم کم ہی کرتے ہیں لیکن جب کہیں کسی شعر یا مصرعے کو بروئے کار لاتے ہیں تو تحریر کی برجستگی اور معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

☆ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انور سدید اپنے لکھے پر پکڑے جائیں گے۔ انھیں غالب کی طرح یہ شکوہ نہیں ہوگا:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق (ص ۱۱۷)

☆ (نظیر صدیقی کے بقول) ''بمبئی کے نسوانی حسن میں روئے جمیل سے زیادہ لباس حریر کو دخل ہے۔ چنانچہ جب مجھے کسی نسوانی چہرے کو دیکھ کر مایوسی ہوتی تو تلافی کے لیے میں اس کے لباس کو دیکھنے لگتا۔'' شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے مومن خان مومن نے کہا تھا:

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی (ص ۲۲۳، ۲۲۴)

☆ ڈاکٹر گیان چند قدیم ادب کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے تہ کی خبر لاتے ہیں لیکن ساحل پر کھڑے ہوئے شاعروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ رویہ اہل تحقیق کی روایتی شان بے نیازی کے عین مطابق ہے اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ موتی سمندر کی تہ میں ہی ہوتے ہیں۔ ساحل پر خس وخاشاک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کا بھی یہی خیال تھا:

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات خار و خس وخاک (ص ۱۸۴)

خامہ بگوش بعض اوقات جملے کی ساخت میں شاعری سے بھی مدد لیتے ہیں جس سے تحریر میں شعریت کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

☆ اس مقالے کو فیض صاحب نے اپنے دل ریزہ ریزہ کی طرح گنوا دیا۔ (ص ۲۳۱)

☆ غالب کی کوئے ملامت کی طرح کوئے سیاست میں بھی داخلہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جسے کہیں امان نہ ملے، اسے یہاں سایۂ دیوار مل جاتا ہے۔ (۲۳۴)

☆ پہلے کوئے صحافت میں وہی آتے تھے جنھیں جان و دل عزیز نہیں ہوتے تھے، اب جان و دل کی جگہ ایمان نے لے لی ہے۔ (ص ۲۷۷)

خامہ بگوش کے کالموں میں اردو اشعار کے علاوہ کہیں کہیں فارسی اشعار اور ضرب الامثال کے نمونے بھی موجود ہیں۔ یہاں چند نمونے درج کیے جا رہے ہیں:

☆ اس موقعے پر ان (جون ایلیا) کا مجموعہ ''شاید'' شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ضخیم مجلہ بھی منظر عام پر آیا جس میں ساٹھ ستر ہم عصروں نے انھیں ''خراج تحسین'' پیش کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس خراج تحسین کے ڈانڈے ''تحسین ناشناس'' سے جا ملتے ہیں۔ (ص ۲۵۷)

☆ رشید احمد صدیقی، کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کی وفات کے بعد اردو طنز و مزاح میں جو خلا پیدا ہوا

WWW.KITABOSUNNAT.COM

تھا اسے ان دونوں (یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین) نے نہایت خوش اسلوبی سے پر کیا۔ ''خانہ خالی را دیو می گیرد'' اسی کو کہتے ہیں۔ (ص۱۴۳)

☆ معاف کیجیے گا، اقتباس ذرا طویل ہو گیا، لیکن حکایت لذیذ ہو تو ''دراز تر'' کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ (ص۱۹۰)

☆ اردو میں ایسی آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن پر ''حافظہ نباشد'' کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ (ص۱۶۰)

خامہ بگوش کی نثر میں تفریس کا عنصر بہت کم ہے۔ وہ شعروں کا استعمال بھی زیادہ نہیں کرتے اور شعری تحریف سے بھی انھیں کچھ زیادہ ذہنی مناسبت نہیں ہے۔

۱۱۔ طنز

شاخ گل پر خار بھی نمودار ہوتے ہیں۔ مزاح اگر پھول ہے تو طنز وہ کانٹا ہے جو اسی شاخ کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ اس کانٹے کا حسن اسی میں ہے کہ وہ شجر سے پیوستہ رہے اور پھول کے پہلو بہ پہلو موجود رہے۔ یہ تو خیر ''طنز'' کی شاعرانہ تعبیر ہے لیکن اس کی متعدد تنقیدی تعریفیں بھی کی گئی ہیں۔ ذیل میں اس کی ایک جامع تعریف دی جا رہی ہے جو ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' سے مستعار ہے:

> زندگی کے مضحک، قابل گرفت اور تنفر انگیز پہلوؤں پر مخالفانہ اور ظریفانہ تنقید اصطلاح میں طنز کہلاتی ہے۔ (۲۵)

اور اس کے لیے شرط یہ عائد کی گئی ہے کہ بدتمیزی، بغض وعناد اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ (۲۶)

خامہ بگوش کی کالمانہ تحریروں میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کی کارفرمائی بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق: ''ان کے ہاں وہ طنز لطیف پیدا ہوئی ہے جو کبھی نوک خار بن جاتی ہے، کبھی پھولوں کی چھڑی بن کر ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کر دیتی ہے۔''(۲۷) وہ طنز میں ظرافت کی لطافت قائم رکھتے ہیں۔

خامہ بگوش ایک بت طناز کا سا مزاج رکھتے ہیں، ان کی نظر جب بھی ادبی دنیا کے کسی قابل نفرت اور قابل گرفت پہلو پر پڑتی ہے تو وہ تنقیص وتنقید کے لیے کان پر قلم رکھ کر نکل پڑتے ہیں۔ طاہر مسعود کے بقول:

> اردو کے ادبا شعرا جن چھوٹے اور گھٹیا مسائل سے دوچار ہیں، جس قسم کی ادبی گروہ بندیاں ان میں پائی جاتی ہیں اور جس نوع کے نفسیاتی اور ذہنی عوارض کا وہ شکار نظر

تھا اسے ان دونوں (یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین) نے نہایت خوش اسلوبی سے پر کیا۔ "خانہ خالی را دیوی گیرد" اسی کو کہتے ہیں۔ (ص ۱۴۳)

☆ معاف کیجیے گا، اقتباس ذرا طویل ہو گیا، لیکن حکایت لذیذ ہو تو "دراز تر" کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ (ص ۱۹۰)

☆ اردو میں ایسی آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن پر "حافظہ نباشد" کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ (ص ۱۶۰)

خامہ بگوش کی نثر میں تفریس کا عنصر بہت کم ہے۔ وہ شعروں کا استعمال بھی زیادہ نہیں کرتے اور شعری تحریف سے بھی انھیں کچھ زیادہ ذہنی مناسبت نہیں ہے۔

۱۱۔ طنز

شاخ گل پر خار بھی نمودار ہوتے ہیں۔ مزاح اگر پھول ہے تو طنز وہ کانٹا ہے جو اسی شاخ کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ اس کانٹے کا حسن اسی میں ہے کہ وہ شجر سے پیوستہ رہے اور پھول کے پہلو بہ پہلو موجود رہے۔ یہ تو خیر "طنز" کی شاعرانہ تعبیر ہے لیکن اس کی متعدد تنقیدی تعریفیں بھی کی گئی ہیں۔ ذیل میں اس کی ایک جامع تعریف دی جا رہی ہے جو "کشاف تنقیدی اصطلاحات" سے مستعار ہے:

> زندگی کے مضحک، قابل گرفت اور تنفر انگیز پہلوؤں پر مخالفانہ اور ظریفانہ تنقید اصطلاح میں طنز کہلاتی ہے۔(۲۵)

اور اس کے لیے شرط یہ عائد کی گئی ہے کہ بدتمیزی، بغض و عناد اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔(۲۶)

خامہ بگوش کی کالمانہ تحریروں میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کی کارفرمائی بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق: "ان کے ہاں وہ طنز لطیف پیدا ہوئی ہے جو کبھی نوک خار بن جاتی ہے، کبھی پھولوں کی چھڑی بن کر ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کر دیتی ہے۔"(۲۷) وہ طنز میں ظرافت کی لطافت قائم رکھتے ہیں۔

خامہ بگوش ایک بت طناز کا سا مزاج رکھتے ہیں، ان کی نظر جب بھی ادبی دنیا کے کسی قابل نفرت اور قابل گرفت پہلو پر پڑتی ہے تو وہ تنقیص و تنقید کے لیے کان پر قلم رکھ کر نکل پڑتے ہیں۔ طاہر مسعود کے بقول:

> اردو کے ادبا، شعرا جن چھوٹے اور گھٹیا مسائل سے دوچار ہیں، جس قسم کی ادبی گروہ بندیاں ان میں پائی جاتی ہیں اور جس نوع کے نفسیاتی اور ذہنی عوارض کا وہ شکار نظر

WWW.KITABOSUNNAT.COM

آتے ہیں، ان کی تیر بہدف جراحی کے لیے خامہ بگوش ہی کے قلم کا نشتر درکار تھا۔ (۲۸)

کسی اختلافی مسئلے پر لکھتے ہوئے کوئی بھی ادیب کلی طور پر معروضیت اختیار نہیں کر سکتا اور یہ بھی درست ہے کہ ادیب اپنے تعصبات، تحفظات اور تصورات سے دامن کش نہیں ہو سکتا، اسی لیے انور ظہیر خان تمام تر اعترافات کے باوجود تسلیم کرتے ہیں:

> ممکن ہے کالم نگار (خامہ بگوش) سے بعض مقامات پر شخصیت کی پرکھ میں، موضوع کی پیشکش میں، تشنیع وظرافت، تنقیص وتنقید کسی ناپ تول میں توازن قائم کرنے میں کہیں بھول چوک بھی ہوئی ہو۔ (۲۹)

جو بات انور ظہیر نے نرم ونازک انداز میں کہی ہے، مظہر امام اسے جارحانہ اسلوب میں یوں پیش کرتے ہیں:

> وہ تصنیف کے حوالے سے مصنف کو مطعون کرنے لگتے ہیں، کردار کشی سے بھی باز نہیں آتے اور مصنف کو کمتر ہونے کا احساس تو دلاتے ہی ہیں...... وہ نفس مضمون کو سیاق و سباق سے الگ کر کے مصنف کو طنز وتشنیع کا نشانہ بنانے لگتے ہیں۔ بعض مفروضے قائم کر لیتے ہیں، قیاس کو یقین بنا دیتے ہیں...... کہیں کہیں ان کے دل کی تلخی زبان قلم سے بولنے لگتی ہے۔ کچھ لوگ اسے ایذا رسانی سے تعبیر کرتے ہیں جسے نفسیاتی اصطلاح میں sadism یا سادیت کہتے ہیں۔ (۳۰)

مظہر امام کا بیان قابل غور ضرور ہے لیکن حق یہ ہے کہ خود ان کے اپنے دل کی تلخی زبان قلم سے بولتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ نکتہ فراموش کر دیتے ہیں کہ خامہ بگوش کی ''دشمنی'' کسی نادان کی دشمنی نہیں۔ ان کی ''عداوت'' میں دانائی اور دردمندی کا عنصر بہر حال موجود رہتا ہے۔ شمیم حنفی نے ان کی تحریروں کو ایک سچے اخلاقی ملال کے علاوہ ایک سوچی سمجھی برگشتگی، غصے، جلال اور افسردگی کا ترجمان قرار دیا ہے (۳۱) لیکن مظہر امام کا غصہ، جلال اور برگشتگی کم ہونے میں نہیں آتی۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> اگر اتفاق سے مصنف کے حق میں کوئی کلمۂ خیر ان کے قلم سے ادا ہو جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ انھیں ندامت ہو رہی ہے اور وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے اگلے جملے سے پھر مصنف کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ (۳۲)

WWW.KITABOSUNNAT.COM

''کلمۂ خیر'' کے فوراً بعد ''کلمۂ حق'' کی آمد کو ڈاکٹر اسلم انصاری نے ایک اور زاویے سے دیکھا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔

خامہ بگوش کا اسلوب جدید طرز کی ''کہہ مکرنیوں'' کا اسلوب ہے۔ کہہ مکرنی حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہے، جو چار مصرعوں سے عبارت ہے۔ اس میں الفاظ و تلازمات سننے والے کے ذہن کو یقینی طور پر ایک خاص سمت کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں کہ اچانک ان کا رخ بدل جاتا ہے؛ مثلاً:

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑت پھاٹت ہیا
اے سکھی ؟ ناں سکھی دیا

خامہ بگوش بھی رموز و علائم کی ایک فضا قائم کرتے ہیں، جس سے پڑھنے والے کو اس کی توقعات کے برعکس ایک ایسے نتیجے سے آشنا کرتے ہیں، جو خیال افروز بھی ہوتا ہے اور ''عبرت آموز'' بھی۔ (۳۳)

ذیل میں چند ''عبرت آموز'' مثالیں درج کی جا رہی ہیں:

- ☆ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ان (عبدالعزیز خالد) کا کلام رکھا جائے اور دوسرے میں ان کے بارے میں لکھی گئی تحریریں تو ترازو ٹوٹ جائے گی کیوں کہ ترازو اتنا بوجھ نہیں سہار سکتی۔ (ص ۱۰)
- ☆ بشیر بدر لفظوں کو چھو کر غزل بنا دیتے ہیں، لفظوں کے اندر جو معانی ہوتے ہیں، انھیں وہ اس لیے نہیں چھوتے کہ بعض نازک چیزیں صرف چھونے سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ (ص ۲۱)
- ☆ قدرت اللہ شہاب میں بے شمار خوبیاں تھیں مگر خامیاں صرف تین تھیں: ابن انشا، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔ (ص ۶۹)
- ☆ اشفاق احمد کو اگر انیس ناگی کی شاعری سمجھ میں نہ آئے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کی سخن گوئی اور دوسرے کی سخن فہمی ''عالم بالا'' سے تعلق رکھتی ہے۔ (ص ۱۰۴)
- ☆ (رفیق) چوہدری صاحب، صرف زبانی ترقی پسند نہیں، تخلیقی کام بھی کرتے ہیں ...... بہ حیثیت میزبان چوہدری صاحب نہایت فراخ دل ہیں۔ ان کے مہمان صرف ترقی پسند ہی نہیں ہوتے،

WWW.KITABOSUNNAT.COM

شرفائے شہر بھی ان محفلوں میں بلائے جاتے ہیں (ص ۱۹۸)

☆ قومی سطح پر ہماری شرح خواندگی بہت کم ہے لیکن یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ انیس ناگی کی کتابوں کی وجہ سے ہماری شرح ناخواندگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ (ص ۲۱۳)

دراصل خامہ بگوش کا یہی وہ ہجویہ اسلوب ہے، جس میں ملاحت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ہجو ملیح ان کا خاص ہتھیار ہے۔ ہجو ملیح سے مراد کلام میں بیک وقت ہجویہ اور مدحیہ توجیہات کی موجودگی ہے۔ خامہ بگوش پر بھی وہ بات صادق آتی ہے جو انھوں نے افتخار جالب کے بارے میں لکھی ہے۔ یعنی ''وہ اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ تھوڑی سی تعریف کر کے مذمت کی جائے تو تعریف بھی مذمت کا حصہ بن جاتی ہے۔'' (ص ۱۳۰) خامہ بگوش کی تحریروں میں اس تکنیک کا استعمال جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ نامی انصاری نے ان کے اسلوب کو ''نثری ہجو ملیح'' قرار دیتے ہوئے اسے محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' سے مستفاد بتایا ہے۔(۳۴) انھوں نے خامہ بگوش کے طریق کار کی توضیح یوں کی ہے:

> وہ براہ راست کسی مصنف یا کتاب کی نکتہ چینی نہیں کرتے بلکہ ابتدا کتاب یا مصنف کی توصیف ہی سے کرتے ہیں لیکن دو ایک فقروں کے بعد وہ اپنے مخصوص طنزیہ اسلوب کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کاریگری سے ہجو کی طرف موڑ دیتے ہیں کہ قاری چونک پڑتا ہے۔ (۳۵)

اس ہجویہ عمل کو ''قصیدہ'' کے مماثل کہا جا سکتا ہے لیکن اس دعوی کی تشریح و تصدیق یوں کی جائے گی کہ خامہ بگوش ابتدا میں ''تشبیب'' کے طور پر موضوع کا تعارف اور پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد ''مدح'' کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور مصنف کی تعریف و توصیف سے کام لیتے ہیں، یہاں سے فوراً ''گریز'' کرتے ہیں لیکن یہ ''گریز'' ہجو اور طنز سے عبارت ہوتا ہے۔ آخر میں ''دعا'' کی بجائے ''مدعا'' کا اظہار کرتے ہیں اور ان کا ''مدعا'' زیادہ تر مصنف کی اصلاح اور خامیوں کی نشاندہی ہوتا ہے۔ اگر ''مدعا'' عنقا بھی ہو تو ان کے ''دام'' میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ ''وہ الفاظ و اسالیب، اشارات و علائم اور امثال و نظائر کا ایسا جال (net-work) تیار کرتے ہیں......۔ (۳۶)

ڈاکٹر اسلم انصاری نے اس تکنیک کو ''یونانی المیہ'' کے تناظر میں دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ان کے اس طرز بیان میں ایک ایسی ارتقائی حرکت نظر آتی ہے جو یونانی المیے کی حرکت سے مشابہ ہے۔ یونانی المیہ کے ہیرو کو بھی اس وقت پتا چلتا ہے جب وہ چاروں طرف

WWW.KITABOSUNNAT.COM

> سے ایسے اسباب و عوامل میں گھر چکا ہوتا ہے جو اس ناگزیر طور پر المیہ انجام کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اس سلسلۂ حرکت و عمل کا خود ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ خامہ بگوش کا ''نشانۂ تنقید'' بھی اس وقت بیدار ہوتا ہے جب اس پر ''وار'' مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ (۴۷)

ایک ماہر طنز نگار کی حیثیت سے خامہ بگوش کا وار اکثر کاری ثابت ہوتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا طنز، مزاح اور اصلاح کے امتزاج سے جنم لیتا ہے۔ خامہ بگوش کے طنز میں فکری اصلاح کا پہلو غالب ہے اور یہ مزاح سے بے نیاز بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اوروں کی طرف گلِ خنداں اور ثمرِ خیال کے ساتھ ساتھ خارِ جلال بھی پھینکتے ہیں کہ ایک کامیاب کالم نگار کے گلشن کا کاروبار انہی کے دم سے چلتا ہے۔

۱۲۔ تجاہلِ کالمانہ

خامہ بگوش کی تحریروں میں ''تجاہلِ عارفانہ'' کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ جانتے بوجھتے ہوئے انجان بن جانا ان کی ادائے خاص ہے۔ اس ادا کو عطاء الحق قاسمی کے الفاظ میں ''تجاہلِ کالمانہ'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

- (نظیر صدیقی) نے دوسری کتابوں سے بے شمار اقتباسات ہی نقل نہیں کیے، پورے کے پورے مضمون اڑا لیے ہیں؛ مثلاً اسی کتاب (اردو ادب کے مغربی دریچے) میں شامل پہلے دو مضمون (اظہار یا ابلاغ۔ اردو ادب اور شعبۂ اردو) ہم ایک اور کتاب میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے، ''میرے خیال میں'' اور یہ ۱۹۶۸ء میں ڈھاکا سے شائع ہوئی تھی۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اس دوسری کتاب کے مصنف بھی نظیر صدیقی ہی ہیں۔ (ص ۶۴)
- انیس ناگی کی دوسری کتاب ''غالب: ایک شاعر، ایک اداکار'' ہے...... غالب کے اداکار ہونے میں کیا شک ہے وہ کئی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ سہراب مودی والی فلم تو عالمی شہرت رکھتی ہے جس میں غالب نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بے مثال مظاہرہ کیا ہے۔ اس فلم میں کام کرنے کا غالب کو خاصا معقول معاوضہ ملا تھا۔ اس معاوضے کی رقم سے سہراب مودی نے مرزا غالب کے مزار کی موجودہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ (ص ۲۱۴، ۲۱۵)
- ''مکاتیب خضر'' کے بارے میں ہم ایک مفصل کالم لکھنا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے خود مرزا غالب نے، جن کی تقلید خالد نے کی ہے، ایک خط خالد کے نام لکھا ہے جو ڈاک خانے کی غلطی سے

ہمارے پاس آ گیا ہے۔ مرزا غالب اور محمد خالد اختر دونوں سے معذرت کے ساتھ، ان کی اجازت کے بغیر، یہ خط ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا غالب نے اپنے خط میں جن آرا کا اظہار کیا ہے، ان سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں۔‘‘ (ص ۲۳)

خامہ بگوش ’’تجاہل کالمانہ‘‘ کے استعمال میں کمال سادگی اور معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بھولپن کی یہ ادا تحریر کی شگفتگی میں اضافہ کر دیتی ہے۔

۱۳۔ اخلاقی اقدار

خامہ بگوش کے فکاہیہ اسلوب کی بنیاد شائستگی، شرافت اور وضعداری پر ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں دوسروں پر پھبتی کستے، فقرہ چست کرتے اور تمسخر بھی اڑاتے ہیں مگر ان نازک لمحات میں بھی بے ہودہ گوئی اور سوقیانہ پن سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اپنی متانت اور ثقاہت کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ خامہ بگوش کے ہاں اخلاقی اقدار کی پاسداری پائی جاتی ہے۔ انھیں خوش طبعی اور گزاف کے مابین فرق سے آگاہی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ’’شائستگی کا اقتضا ہے کہ ظرافت اور پھکڑ پن میں امتیاز کیا جائے۔‘‘ (ص ۲۶)

خامہ بگوش کی ظرافت ناشائستگی، ہرزہ گوئی اور بازاری پن سے پاک ہے۔ یہاں عریانی اور فحاشی کا گزر تک نہیں۔ یہ ظرافت اپنے خالق کے ذوق سلیم اور طبع شائستہ کی آئینہ دار ہے۔

۱۴۔ جملہ سازی

خامہ بگوش کے اسلوب کی ایک انفرادیت ’’جملہ سازی‘‘ بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ انتخاب الفاظ اور شوخی خیال سے ایسا جملہ ترتیب دیتے ہیں جو قاری کو ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اس نوع کے فقروں میں یاد رہ جانے والے عناصر شامل ہوتے ہیں اور اچھے شعر کی طرح یہ بھی حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ’’مجلسی ادب‘‘ میں اس طرح کے جملے لطف محفل کا باعث ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں:

> ’’خواجہ صاحب شاید اردو کے واحد مزاح نگار ہیں جن کے جملوں کو ضرب المثل جیسی شہرت عام حاصل ہے اور جنھیں مجلسی مزاح میں سب سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔‘‘ (۳۸)

انور سدید کی رائے میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ خامہ بگوش کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی کے ہاں بھی ’’قابل استعمال‘‘ شوخ و شنگ فقرے کثرت سے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ خامہ بگوش کی تصنیف میں جملوں کی ایک

بے تکلف اور دلچسپ محفل آراستہ نظر آتی ہے۔ ''جملہ سازی'' کوئی آسان کام نہیں، شاعر کی طرح نثر نگار کو بھی ایک ''جملہ تر'' کی صورت دیکھنے کے لیے سیروں خون خشک کرنا پڑتا ہے۔ خامہ بگوش کے فقرے ان کی محنت، کوشش اور دشوار پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے کالموں میں کہیں کہیں ''جملے بازی'' کا رجحان بھی دکھائی دیتا ہے جس سے تحریر کا معیار قدرے متاثر ہوتا ہے لیکن یہ ''سانحہ'' کبھی کبھار ہی ان کی نثر پر گزرتا ہے۔ وہ اپنی روایتی ثقاہت کو قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کے چند شوخ جملے نقل کیے جا رہے ہیں:

☆ علم و فضل کے اعتبار سے وہ (عبدالعزیز) ایسے قد آور ہیں کہ ان کی طرف دیکھنے والوں کی ٹوپی گر جاتی ہے اور ان کا علم و فضل اتنا وزنی ہے کہ اس کی زد میں آ کر ٹوپی کے ساتھ اس کا پہننے والا بھی گر جاتا ہے۔ (ص ۹)

☆ حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر جس مقام پر ہیں، وہاں کسی دوسرے شاعر کا پہنچنا تو کیا، وہاں سے واپس آنا ناممکن ہے۔ (ص ۱۸)

☆ (بشیر بدر) نے اپنے مجموعۂ کلام ''آمد'' پر ایسا فکر انگیز دیباچہ لکھا ہے کہ اس کے سامنے ان کا کلام ''آورد'' معلوم ہوتا ہے۔ (ص ۲۰)

☆ انیس ناگی کو چاہیے کہ وہ اکادمی (ادبیات) کو اس پر مبارک باد دیں کہ اس نے سچے ادیبوں کو ان کے حال پر چھوڑ رکھا ہے اور مشکوک ادیبوں کو اکادمی کے مال پر چھوڑ رکھا ہے۔ (ص ۸۷)

☆ ہمیں اس قسم کے نقادوں پر رحم آتا ہے کہ علم تو ان کے پاس بہت سا ہے اور قاری ایک بھی نہیں۔ (ص ۱۳۹)

☆ ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔ (ص ۱۴۸)

☆ ان (فرمان فتح پوری) کی کتابیں پڑھ کر قاری خودکشی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ بس ذرا مہد سے لحد تک کا وقفہ کم ہو جاتا ہے۔ (ص ۱۴۹)

☆ جب شعر و شاعری کے بغیر بھی آدمی ترقی پسند بن سکتا ہے تو پھر شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (ص ۲۴۷)

☆ پہلے وہ (الطاف حسن قریشی) اپنی خیر مناتے تھے، اب اردو ڈائجسٹ کی جوبلی مناتے پھر رہے ہیں۔ (ص ۲۷۹)

☆ ہمارا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ قمر جمیل کی نثری نظمیں معیاری نہیں ہوتیں بلکہ مراد یہ ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے قاری اپنے آپ کو غیر معیاری سمجھنے لگتا ہے۔ (ص ۹۳)

خامہ بگوش کے فن کی ایک خصوصیت ''قول محال'' کا استعمال ہے۔ ''قول محال'' جملے میں ''دروغ نما راستی'' کی پیشکش کا نام ہے۔ خامہ بگوش کے بعض ''اقوال محال'' ملاحظہ ہوں:

☆ یہ (کتاب) کسی پریس میں نہیں، بیوٹی پارلر میں چھپی ہے۔ (ص ۲۹۷)

☆ شہر کی بے شمار پان سگریٹ کی دکانوں کی آرائش کا کام آج کل اسی کے سرورق سے لیا جا رہا ہے۔ (ص ۳۰۶)

☆ وہ (جگن ناتھ آزاد) صرف شاعر نہیں، پڑھے لکھے آدمی بھی ہیں۔ (ص ۲۹۸)

خامہ بگوش کی تحریر میں بعض جملوں اور لفظوں کی تکرار بھی موجود ہے لیکن یہ تکرار قاری پر کچھ زیادہ گراں نہیں گزرتی کیوں کہ ان کے ہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ''مکرر جملہ'' ہر بار ایک نئے رنگ کے جامے میں ملبوس ہوتا ہے۔ شمیم حنفی کے بقول:

> ان کے کالموں میں بھی کہیں کہیں ذہن سے چپکے ہوئے فقروں کی تکرار ملتی ہے لیکن زیادہ تر فقرے اپنے واقعاتی پس منظر اور اپنی متعلقہ صورت حال سے خود بخود برآمد ہوتے ہیں۔

ذیل میں چند ایسے جملے درج کیے جا رہے ہیں جن کی صدا خامہ بگوش کے لبوں سے مکرر سنائی دیتی ہے:

☆ یہ دوسری بات ہے کہ عام لوگ جنھیں عیب سمجھتے ہیں اشک صاحب کے نزدیک وہ خوبیاں ہیں۔ (ص ۷۶) جنھیں وہ (انیس ناگی) اپنی خوبیاں سمجھتے ہیں، وہ دوسروں کے نزدیک خامیاں ہیں۔ (ص ۸۵)

☆ یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے انھیں اب انعامات ملتے ہیں۔ (ص ۱۹۱) جیسے یہ خاتون انعام کی نہیں جرمانے کی مستحق ہوں۔ (ص ۲۰۴)

☆ وہ (بشیر بدر) بہت وسیع المطالعہ ہیں کیوں کہ سارا سال مشاعرے پڑھتے رہتے ہیں۔ (ص ۱۴) سچی بات یہ ہے کہ نئی نسل کو سوائے مشاعرے پڑھنے کے کچھ اور پڑھنے کا شوق ہی نہیں۔ (ص ۱۸۲) عالی صاحب غیر ملکی مشاعرے پڑھنے میں اتنے مصروف رہیں گے کہ ملکی ادب پڑھنے کی انھیں فرصت نہیں ملے گی۔ (ص ۱۹۴)

ان کے علاوہ ''غلط نامہ'' خامہ بگوش کی پسندیدہ ترکیب ہے جس کا استعمال ان کے کالموں میں متعدد بار ہوا ہے۔

۱۵۔ زبان و بیان

خامہ بگوش کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب تحریر سادگی، سلاست اور روانی سے عبارت ہے۔ یہ اسلوب بظاہر سادہ دکھائی دیتا ہے مگر اس میں کمال درجے کی پرکاری بھی موجود ہے۔ خامہ بگوش سادہ اور آسان زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، الفاظ کے استعمال میں وہ مشکل پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کی تحریر میں تعریب یا تفریس نہیں پائی جاتی۔ وہ صحیح اور معیاری زبان لکھنے پر قادر ہیں اور اس معاملے میں وہ درست املا کا بھی خاص اہتمام کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی زبان خالص اردو کی ترجمان قرار دی جاسکتی ہے۔ ان کا اسلوب گنجلک اور پیچ دار بھی نہیں ہے، وضاحت اور ابلاغ ان کے انداز تحریر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ شمیم حنفی کے بقول:

> خامہ بگوش کے فقروں میں ہمیشہ وہ ارتکاز، بلاغت اور ایجاز پایا جاتا ہے جس کا تصور زبان و بیان کے اسالیب پر گرفت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ (۳۹)

اپنے کالموں میں خامہ بگوش زبان اور لغت کے ایک ماہر کی حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں زبان کو تخلیقی اور فنکارانہ مہارت سے برتنے کا رویہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کا خیال ہے:

> خامہ بگوش زبان کو اعلیٰ درجے کے فنکار کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایسی صناعی ہے جس کے رشتے تخلیقیت کے ساتھ ملتے ہیں۔ (۴۰)

ایک مزاح نگار کے لیے زبان کے علم سے آشنائی بنیادی سرط ہے۔ خامہ بگوش اس شرط پر کلی طور پر پورا اترتے ہیں لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ نرے کھرے مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ ان کی اولین حیثیت ایک سنجیدہ نقاد اور محقق کی ہے۔ اسلم انصاری کے مطابق: ''یہ سب کچھ وہ ادب کے سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے کرتے ہیں، محض طنز و مزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں۔''(۴۱)

اس خیال کی توثیق شمیم حنفی کی اس رائے سے بھی ہوتی ہے کہ ''یہ تحریریں طنز و مزاح کے طوفانی لمحوں میں بھی متین اور سنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔''(۴۲)

خود خامہ بگوش نے اپنے مخصوص ظریفانہ اسلوب میں دعویٰ کیا ہے:

......اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے

لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے۔ (ص ۵)

بات دراصل یہ ہے کہ خامہ بگوش کی ظرافت گہری سنجیدگی کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ وہ ظرافت برائے ظرافت کے قائل نہیں ہیں اور مزاح ان کے ہاں مقصود بالذات نہیں۔ وہ مزاح کو لطف کلام کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ جب کہ ان کا کلام سنجیدہ معنویت اور مقصدیت کا حامل ہوتا ہے۔ محبوب الرحمٰن فاروقی کے نزدیک:

> خامہ بگوش نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس کا مقصد ادیبوں اور شاعروں کی اصلاح کرنا ہے، اس اصلاح کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کا بس سہارا ابھر لیا ہے۔ (۴۳)

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خامہ بگوش ''مزاح برائے مزاح'' کے نہیں ''مزاح برائے اصلاح'' کے قائل ہیں۔ ان کی ظرافت کو مصلحانہ اور مقصدی ظرافت قرار دیا جاسکتا ہے، ایک ایسی ظرافت جس کے پس منظر میں علم، آگہی اور دانش مندی کی روایت موجود ہے۔

حوالے

۱۔ المنجد، دارالاشاعت، کراچی

۲۔ بہار، ملک الشعرا، سبک شناسی (تہران، س۔ن)

۳۔ J.A.Cuddon, the Penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theories, 1994.

۴۔ طارق سعید، ''اسلوب اور اسلوبیات'' (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۸ء)، ۳۷۲

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۷ء)، ۴۳ تا ۴۷

۶۔ ظفری، ظفر عالم، ''اردو صحافت میں طنز و مزاح'' (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۶ء)، ۲۸۴

۷۔ فاروقی، محبوب الرحمٰن، ''سخن در سخن''، کتاب نما، (جولائی ۱۹۹۵ء)، ۸۷

۸۔ فاروقی، ''سخن در سخن''، ۸۸

۹۔ خامہ بگوش، ''سخن در سخن''، تکبیر (کراچی، ۵ ستمبر ۱۹۹۶ء)، ۴۹

۱۰۔ وزیر آغا، ''اردو ادب میں طنز و مزاح''، ۴۷

۱۱۔ خامہ بگوش، ''سخن در سخن''، تکبیر (کراچی، ۲۲ جون ۱۹۹۵ء)، ۴۰

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو نثر کے آفاق'' (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۵ء)، ۹۴

۱۳۔ انور سدید، ''اردو نثر کے آفاق''، ۸۷

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ نامی انصاری، ''مزاحیہ کالم نگاری''، ماہنامہ ایوان اردو، (دہلی، جولائی ۱۹۹۶ء)، ۳۸

۱۶۔ شمیم حنفی، ''خامہ بگوش کے قلم سے''، کتاب نما (دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء)، ۵۹

۱۷۔ خامہ بگوش، ''سخن در سخن''، تکبیر (کراچی، ۶ جولائی ۱۹۹۵ء)، ۴۹

۱۸۔ تبصرہ نگار، ششماہی فکر و نظر، (علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء)، ۱۹۳

۱۹۔ انور سدید، ''اردو نثر کے آفاق''، ۱۸

۲۰۔ ششماہی فکر و نظر، ۱۹۲

۲۱۔ وزیر آغا، ''اردو ادب میں طنز و مزاح''، ۴۸

۲۲۔ انور سدید، ''اردو نثر کے آفاق''، ۸۴

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ششماہی فکر و نظر، ۱۹۳

۲۵۔ حفیظ صدیقی، مرتبہ ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء)، ۱۲۱

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ انور سدید، ''اردو نثر کے آفاق''، ۸۰

۲۸۔ طاہر مسعود، ''گاہے گاہے''، روزنامہ جسارت (کراچی، یکم جون ۱۹۹۷ء)

۲۹۔ انور ظہیر خان، ''مشفق خواجہ کی خامہ بگوشی''، کتاب نما (مارچ ۱۹۹۷ء)، ۵۱

۳۰۔ مظہر امام، ''کچھ خامہ بگوش کے بارے میں''، کتاب نما (جولائی ۱۹۹۵ء)، ۶۲، ۶۳

۳۱۔ شمیم حنفی، ''خامہ بگوش''، ۵۸

۳۲۔ مظہر امام، ''خامہ بگوش''، ۶۲، ۶۳

۳۳۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، ''خامہ بگوش کی ادبی کالم نگاری''، ادب دوست (لاہور، جون ۲۰۰۰ء)، ۳۹، ۴۰

۳۴۔ نامی انصاری، ''کالم نگاری''، ۳۸

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ اسلم انصاری، ''ادبی کالم نگاری''، ۳۹

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ انور سدید، ''اردو نثر کے آفاق''، ۹۱

۳۹۔ شمیم حنفی، ''خامہ بگوش''، ۵۹

۴۰۔ اسلم انصاری، ''ادبی کالم نگاری''، ۳۹

۴۱۔ اسلم انصاری، ''ادبی کالم نگاری''، ۳۸

۴۲۔ شمیم حنفی، ''خامہ بگوش''، ۶۰

۴۳۔ فاروقی، ''سخن در سخن''، ۸۵

WWW.KITAABISTAN.COM

ڈاکٹر عائشہ عثمان

فقیرانہ آئے

یہ کوئی طریقہ نہیں۔ بغیر بتائے، بغیر ملے کسی سے مشفق خواجہ صاحب ایک دنیا کو سوگوار چھوڑ کر بالکل اچانک ایک انجانے سفر پر نکل گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ بھلا ایسا ظلم بھی کوئی کرتا ہے۔ کچھ بیمار پڑتے۔ کچھ اپنے دوستوں کو تیمارداری کا موقع دیتے۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ ان کے اس جہان فانی سے کوچ کرنے سے قبل رات طبیعت بگڑنے سے کچھ گھنٹوں پہلے میں نے فون پر بات کی تو بالکل نارمل تھے۔ میں نے حسب معمول خیریت دریافت کی تو کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ تھوڑی دیر معمول کے مطابق گپ شپ کی اور پھر میں نے فون بند کر دیا۔ خواجہ صاحب کی عادت تھی اس وقت تک فون بند نہ کرتے تھے جب تک فون کرنے والا خود فون بند نہ کرے۔ ہاں کوئی مہمان بیٹھا ہو تو معذرت کر لیتے۔ مجھے خواجہ صاحب سے بے پناہ عقیدت تھی۔ میری ان سے دوستی بھی تھی۔ پتا نہیں دوستی زیادہ تھی یا عقیدت شاید دونوں ہی۔

خواجہ صاحب بہت پیارے انسان تھے۔ میں نے انھیں قریب سے جانا اور انھیں انتہائی مخلص دوست اور استاد پایا۔ ان کا وصال میرے لیے ایک ذاتی المیہ ہے جو میری زندگی کے آخری دنوں تک میرے ساتھ رہے گا۔ ان کی باتیں اور ان کی یادیں میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت کرتی چلوں کہ میں شاعر ہوں نہ ادیب بلکہ صرف ادب کی ایک ادنیٰ قاری ہوں۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ آپ ہمیں اس لیے عزیز ہیں کہ آپ لکھتی نہیں ہیں۔ میں آج خواجہ صاحب کے حوالے سے بہت سی خوبصورت یادوں میں سے کچھ یادیں لکھنا چاہتی ہوں کہ شاید دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ جیسا کہ میں نے کہا میں کوئی لکھاری نہیں ہوں اس لیے آپ پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ اس مضمون کو کسی بھی ادبی پیمانے پر نہ پرکھا جائے۔

خواجہ صاحب درویش صفت آدمی تھے۔ وہ اس عالم رنگ و بو کے تھے ہی نہیں۔ وہ اس ہنگامہ پرور عہد میں اجنبی تھے۔ وہ دنیا سے یکسر بے نیاز تھے۔ اسی لیے شاید دنیا ان کے پیچھے بھاگتی تھی۔ ان کے پرور عہد میں اجنبی تھے۔ وہ دنیا سے یکسر بے نیاز تھے۔ اسی لیے شاید دنیا ان کے پیچھے بھاگتی تھی۔ ان کے پاس کہاں کہاں سے فون آتے۔ وہ شاذ ہی کسی کو فون کرتے۔ ایک دنیا انھیں فون کرتی۔ میری ان سے روزانہ فون پر ملاقات رہتی۔ کسی روز مصروفیت کے باعث میں فون نہ کر سکتی تو وہ خود فون کرتے کہ آج کیا بات ہے آپ کا

فون نہیں آیا۔ میرے خیال میں بے شمار لوگوں کو خواجہ صاحب سے غائبانہ عقیدت تھی۔ خواجہ صاحب لوگوں سے کسی حد تک کتراتے تھے۔ تعلقات میں ان کا فلسفہ یوں تھا کہ وہ کہتے تھے کہ تعلقات میں وسعت نہیں گہرائی ہونی چاہیے۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ جب انھیں حکومت پاکستان نے ''حُسنِ کارکردگی'' دیا اور ان کے اعزاز میں یہاں کراچی میں ایک تقریب منعقد ہوئی تو خواجہ صاحب اس تقریب میں بھی شریک نہ ہوئے۔ اپنے بارے میں اکثر فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدل کا شعر پڑھتے اور کہتے کہ یہ شعر میری زندگی کا نمونہ ہے۔

دنیا اگر دہند نہ جُنبم زجای خویش
من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش

بیدل کے اس شعر کی شان نزول بہت دلچسپ ہے۔ جب ان کے شاگرد نظام الملک میر قمرالدین شاکر دکن پہنچ کر دہلی کی فقط ایک ہستی کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے پاس بلانے کا تقاضا بھیجتے ہیں تو مرزا بیدل اپنا قطعی جواب اس شعر کی صورت میں پہنچاتے ہیں۔ اگر عیش و آرام ذہنی کیفیت کا نام ہے تو بیدلؔ کے لیے اس کی دہلی میں کیا کمی تھی۔

خواجہ صاحب کی غزل کے بھی یہ چند شعر دیکھیے:

ایک ایسا شخص بھی دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے
فقیر گوشہ نشین اپنی ذات میں گم ہے
اب ایک اور ہی عالم نظر میں رہتا ہے

خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ میں نے اپنی شرائط پر زندگی گزاری ہے اور اس کے نقصانات بھی میں نے ہی اٹھائے ہیں۔ انھوں نے کبھی ملازمت نہیں کی۔ سالہا سال اخبار کے لیے کالم لکھتے رہے مگر کبھی اخبار کے دفتر کا منہ نہ دیکھا۔ کیا آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جس کے استغنا کا یہ عالم ہو۔ سارا دن کام میں مصروف رہنا ان کا معمول تھا۔ وہ صرف کھانے یا سونے کے اوقات میں توقف کرتے۔ بلا کا پرہیز کرتے۔ شوگر کے مریض تھے اور انھیں اپنے مرض ذیابطیس کے بارے میں حیرت ناک حد تک معلومات تھیں۔ ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کرتے ان کے بارے میں خواجہ صاحب مکمل تحقیق کرتے یا اپنے بھتیجے ڈاکٹر خسرو سے انٹرنیٹ پر کرواتے۔ کھانے پر تشریف لاتے (کراچی میں چند گنے چنے گھر ایسے تھے جنھیں خواجہ صاحب شرف میزبانی عطا کرتے اور مجھے فخر ہے کہ خواجہ صاحب مجھے یہ عزت دیتے تھے) تو صرف دال، مچھلی یا کوئی سبزی کھانا پسند کرتے۔ بدپرہیزی اگر کی تو صرف سگریٹ کے معاملے میں۔ ادھر

WWW.KITAABISTAN.COM

ایک سال قبل انھیں ہارٹ اٹیک ہوا، اس کے بعد سگریٹ سے تائب ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں انھیں سمجھاتی کہ خواجہ صاحب ڈاکٹر کے چھڑوانے سے پہلے آپ سگریٹ خود چھوڑ دیں لیکن وہ اس خطرناک اسیری سے رہائی نہ حاصل کر سکے۔ اور آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ ہی نہیں خوف بھی تھا۔ خواجہ صاحب ایک چلتی پھرتی معلوماتی کتاب تھے۔ انھیں ہر موضوع کے بارے میں معلومات تھیں۔ موضوع کوئی بھی ہو، ان سے رہنمائی مل جاتی تھی۔ وہ میرے اور نہ جانے کتنے لوگوں کے مشفق استاد تھے۔ ایکِ مکمل محقق۔ بے شمار الفاظ کا صحیح تلفظ میں نے ان سے سیکھا۔ تاریخ اور اردو تو ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ وہ پنجابی تھے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نیکراچی میں بسر کیا۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے ان سے کہا کہ خواجہ صاحب مجھے آپ کی گفتگو سے قطعی اندازہ نہ ہوا کہ آپ پنجابی ہیں۔ خواجہ صاحب نے جواباً کہا: ”کچھ دیر تشریف رکھیے آپ کو میری حرکتوں سے پتا چل جائے گا کہ میں پنجابی ہوں۔“ ان میں بہترین حسِ مزاح تھی اور انتہائی شائستہ مذاق کرتے۔ ان کے کالم اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ میں نے انھیں کبھی کوئی مہمل جملہ کہتے ہوئے نہیں سنا۔

خواجہ صاحب کے اندر ایک شاعر ہمیشہ چُھپا رہا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا اپنا شعری معیار اتنا بلند تھا کہ خود ان کی اپنی شاعری ان کے معیار پر پوری نہ اتر سکی۔ ورنہ بہت سے لوگوں سے بہت اچھے شعر خواجہ صاحب نے کہے ہیں یا پھر باقی کام ان کی شعری صلاحیتوں پر غالب آ گئے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ”ابیات“ کے نام سے چھپا جسے وہ کسی ایسی محبوبہ کی طرح چھپاتے تھے جسے یاد رکھنا چاہتے ہوں نہ بھلانا چاہتے ہوں۔

تو میرے دل میں مثالِ چمن مہکتا ہے
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے
یہ بخل کیا ہے خداوند آسمان و زمیں
ہر ایک سمت ہے تو اور میں کہیں بھی نہیں
شہر بستے ہیں خیالوں میں میرے
مجھے تنہائی نے سمجھا کیا ہے
ہر اک عذاب کو میں سہہ گیا، مگر نہ ملا
وہ ایک غم جو مرے حوصلے سے بڑھ کر تھا
ہزار بار خود اپنے مکاں پہ دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

تمام عمر کی تنہائیاں سمٹتی ہیں
یہی مرے درودیوار کا مقدر تھا

خواجہ صاحب نے تنہائیوں کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے گھر کی چار دیواری میں سمیٹا۔ علم وآگہی کے انمول موتی، ایسی عقیدتیں اور ایسی مخلص چاہتیں جو بہت سے دنیا پرست لوگوں کے حصے میں بھی کم کم آتی ہیں۔ ہاں لیکن ایک بات ہے۔ خواجہ صاحب انسانوں کے معاملے میں خاصے محتاط اور طباع تھے کسی سے ان کے دل کو تکلیف پہنچتی تو وہ اس شخص سے مکمل قطع تعلق کر لیتے بلکہ اپنا راستہ ہی بدل لیتے۔ بلا کے مردم شناس تھے۔ انسانوں کی ایسی پرکھ میں نے کم دیکھی ہے۔ دوسروں کی مدد کو ہر وقت تیار رہتے۔ کئی مرتبہ انھوں نے میری مدد کی۔ ایک بچی کینسر میں مبتلا تھی۔ علاج کے اخراجات ناکافی تھے۔ میں نے خواجہ صاحب سے ذکر کیا۔ فوراً امریکہ میں مقیم اپنے کسی نیاز مند (غالباً ان کا نام عبدالوہاب صاحب ہے) سے بیس ہزار روپے اس اپیل فنڈ میں منتقل کروا دیے۔ میں ملازمت کرتی تھی۔ خواجہ صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنی غیر سرکاری تنظیم بنایئے۔ میں نے پوچھا خواجہ صاحب کیا آپ اس غیر سرکاری تنظیم کا حصہ بنیں گے۔ کہنے لگے آپ بنایئے تو۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک غیر سرکاری تنظیم بنائی جس کے خواجہ صاحب بانیوں میں سے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیم کی تشکیل کے ہر مرحلے میں میری رہنمائی فرمائی۔ ادب کے حوالے سے میری تربیت کی۔ اچھے اور برے کی پرکھ سکھائی۔ اپنی قیمتی لائبریری سے مجھے میری حسب ضرورت کتابیں دیں۔ میری چھوٹی سی لائبریری دیکھنے آئے اور مجھ سے کہا کہ ایک گوشہ ان کتابوں کا بنایئے جو میں آپ کو دیتا ہوں۔

ایک مرتبہ ان کے عزیز دوست ڈاکٹر مشرف (جو کینسر کے مریض تھے اور بعد میں انتقال کر گئے) کی عیادت کو میں خواجہ صاحب کے ساتھ ہسپتال گئی۔ ہسپتال کے ساتھ ہی قبرستان ہے جہاں میرے والدین دفن ہیں۔ خواجہ صاحب کی خواہش پر ہم قبرستان گئے۔ وہاں انھوں نے مجھے بتایا کہ آج میری سالگرہ ہے۔ وہ دسمبر کی ۱۹ تاریخ تھی۔ خواجہ صاحب کو فوٹوگرافی کا انتہائی لگاؤ تھا۔ ان کے ذخیرۂ تصاویر میں ہزاروں یادگار تصویریں ہیں۔ انھیں کراچی میں ساحل سمندر کی سیر کو جانا بہت پسند تھا۔ یہاں ہمارا ایک چھوٹا سا گروپ ہے۔ خواجہ صاحب، یوسفی صاحب، احمد فراز صاحب اور زہرا نگار صاحبہ کی کمپنی بہت پسند کرتے تھے۔ انھیں بور قسم کے لوگوں سے ملنا پسند نہ تھا اس لیے کہ خود بہت دلچسپ آدمی تھے۔ پکنک پر ہم سب کی خوب خوب تصویریں بناتے۔ ایک مرتبہ ہاکس بے پر فراز صاحب کے اصرار پر اپنی چند غزلیں سنائیں۔

WWW.KITAABISTAN.COM

خواجہ صاحب اپنی گوشہ نشینی کے باوجود ایک گھر گرہستی والے تھے۔ وہ بہنوں کے بہت ہی پیارے بھائی تھے۔ ان کی بہنیں ان پر جان نچھاور کرتی تھیں۔ پہلی بار جب دل کا دورہ پڑا اور ہم سب انھیں ہسپتال لے گئے تو ان کی بہنوں نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رات دن ان کا خیال کرتیں۔ اپنے بھائیوں کا ذکر بھی ہمیشہ انتہائی محبت سے کرتے تھے۔ ناصر اور عرفان کو بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ یہ دونوں لڑکے ان کے ساتھ رہائش پزیر تھے۔

میری خواجہ صاحب سے ادب پر طویل بحثیں ہوتی تھیں۔ میں نے ان مباحثوں سے خوب استفادہ کیا۔ جب بحث طویل ہو جاتی اور کسی بات پر اختلاف ہوتا تو خواجہ صاحب از راہ شفقت آخر میں یہ کہہ دیتے کہ میں یہ دیکھنے کے لیے آپ کا امتحان لے رہا تھا کہ آپ اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے میں کون سے دلائل دیتی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان کے سامنے احمد فراز صاحب کا یہ شعر پڑھا:

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر، ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

تو بولے اجی آپ کو کیا پتا کہ ہجر کیا بلا ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کیونکہ ہم نے ہجر جھیلے ہیں۔ بھلا بغیر ہجر جھیلے ایسا شعر کوئی کہہ سکتا ہے:

کسے خبر ہے، کہاں، کس دیار میں گزری
وہ زندگی جو ترے انتظار میں گزری
یہی نہیں کہ وہ بے تاب و بے قرار گیا
مری رگوں میں بھی اک زہر سا اتار گیا
جو وصل و ہجر کا قصہ نہ درمیاں ہوتا
ہر ایک لمحہ محبت کا رائیگاں ہوتا
تقاضے دل کے اگر جسم سے جدا ہوتے
تو وصل و ہجر کے لمحے گریز پا ہوتے
زندگی اپنی کچھ اس طرح سے گزری ہے کہ تو
مل بھی جاتا تو ترا راستہ دیکھا کرتے
بجھتی رہیں شمعیں بھی ڈوبا کیے تارے بھی
لیکن غم جاناں ہم تجھ سے کبھی ہارے بھی

اتنے خوبصورت اشعار کہنے والا شخص یہ کیسے ممکن ہے کہ عشق جیسے عمیق اور گہرے تجربے سے نہ گزرا ہو اور بعد میں یوں بھی ہوا کہ:

شام فراق بھی گئی ، صبح وصال بھی نہیں
عشق وہاں ہے اب جہاں تیرا خیال بھی نہیں

خواجہ صاحب اپنی ذات میں انجمن تھے۔ کوئی ذرا سی دیر ان کی صحبت میں بیٹھ جاتا تو ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ اتوار کو باقاعدگی سے دربار لگاتے۔ صبح گیارہ بجے سے دوپہر تک لوگوں سے ملاقات کرتے۔ بہت سے شاعر، ادیب اور محقق حضرات ان کے گھر جمع ہوتے، انھیں اپنی کتابیں پیش کرتے یا ان سے اپنے کام کے بارے میں مدد لیتے۔ چائے اور بسکٹ سے تمام مہمانوں کی تواضع کی جاتی۔ خواجہ صاحب کو دنیا بھر سے ڈاک موصول ہوتی، کہاں کیا کام ہو رہا ہے، ان کے علم میں ہوتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے پاس تمام شاعروں اور ادیبوں کی ذاتی زندگی کی فائلیں موجود تھیں۔ میں ان سے مذاق سے پوچھتی کہ خواجہ صاحب آپ کی فائل کس کے پاس ہے۔ مسکرا کر ٹال دیتے۔

خواجہ صاحب فقیر آدمی تھے۔ ناظم آباد میں ان کی رہائش ایک تین منزلہ مکان میں تھی جس میں سے تقریبا تیرہ کمروں میں سے گیارہ کمرے ان کی کتابوں سے آراستہ اور دو کمرے ان کے قیمتی وجود سے پیراستہ تھے۔ ان کے گھر کے باہر بورڈ پر تحریر تھا "کاشانہ رحمت۔" مجھے کئی مرتبہ ان کے گھر جانے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے گھر کا زینہ بہت دشوار تھا، بالکل اوپر اٹھا ہوا۔ ایک مرتبہ میں احمد فراز صاحب کے ساتھ ان کے گھر گئی تو فراز صاحب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولے کہ یہاں تو کاشانہ زحمت لکھا ہونا چاہیے۔

خواجہ صاحب کی خواہش تھی اور وہ اکثر دعا بھی کرتے تھے کہ ان کے سارے ادھورے کام مکمل ہو جائیں۔ اپنے والد کا روزنامچہ مرتب کر رہے تھے جس کے مکمل ہونے کی انھیں بہت آرزو تھی۔ اس کے کچھ حصے وہ فون پر سنایا کرتے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی خاندانی نسبت علامہ اقبال سے تھی۔ ان کے والد کی ڈائری میں اقبال سے ملاقاتوں کا جابجا ذکر ملتا ہے۔

میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ خواجہ صاحب کی زندگی کے آخری لمحوں میں ان کے ساتھ رہی۔ ان کا جس دن وصال ہوا، میں صبح ساڑھے دس بجے کے قریب آغا خان ہسپتال پہنچی۔ خواجہ صاحب حالت اضطراب میں تھے۔ سانس کی ناہمواری انھیں چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ میں ان کے قریب گئی۔ میں نے انھیں پکارا خواجہ صاحب! مگر وہ جواب نہ دے پائے۔ ایک بار انھوں نے درمیان میں آنکھ

کھولی مگر کمرے میں موجود کسی کی طرف نہ دیکھا۔ ان کی نظریں کہیں اوپر کی طرف مرکوز تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ پرسکون ہو گئے۔

ڈاکٹروں نے انھیں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا مگر انھوں نے اپنے دل میں اور ہی ٹھانی تھی۔ جب ہم انھیں وارڈ سے شعبہ انتہائی نگہداشت تک لے جا رہے تھے لیکن بیچ راہداری میں ہی وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے اپنی اور ان کے رشتہ داروں کی تسلی کے لیے انھیں مصنوعی نظام تنفس مشین پر دو دن مزید رکھا مگر مجھے معلوم تھا کہ خواجہ صاحب ہمارے درمیان تھے ہی نہیں کہ واپس آتے۔ خواجہ صاحب اپنی بڑی بہن کے گھر سے بہت سے چاہنے والوں کی موجودگی میں رخصت ہوئے۔ وہ اس روز بھی لوگوں سے کترا رہے تھے۔ چادر اوڑھے لیٹے رہے، کسی سے بات نہ کی۔ ان کا چہرہ بہت پرسکون اور خوبصورت تھا جیسے میٹھی نیند سو رہے ہوں۔ میں نے چپکے سے ان کے کان میں فراز صاحب کا سلام پہنچایا، پتا نہیں انھوں نے جواب دیا یا نہ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ خواجہ صاحب جہاں بھی ہوں گے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور اپنے دوستوں ابن انشاء اور مظفر علی سید کے ساتھ علمی اور ادبی بحث میں مصروف ہوں گے۔

سوئے جواب کے تان کے چادر کو منہ پہ ہم
اے مصحفی کسی سے جگایا نہ جائے گا

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

مشفق خواجہ: نگینہ شخص رخصت ہوا

میں اس مضمون کا آغاز یہ کہہ کر کروں گا کہ مشفق خواجہ زندہ رہنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ ادب کے بڑے آدمی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

مشفق خواجہ جیسی نادر روزگار شخصیت کراچی میں ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء علم و ادب سے متعلق لاتعداد حضرات کو سوگوار کر کے رخصت ہوگئی۔ بہت کم ایسے ادیب، نقاد، محقق اور شاعر ہوتے ہیں جن کی جدائی کا غم صحیح معنوں میں محسوس کیا جاتا ہے۔

مشفق خواجہ علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے طالب علم باوجود اس کے کہ علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں خود نہ ادیب ہوتے ہیں اور نہ شاعر۔ یہ کسی بھی گھرانے کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اس کے یہاں دو نسلوں میں قابل ذکر عالم اور ادیب پیدا ہوں اور ان میدانوں میں اپنا نقش ثبت کریں۔

مشفق خواجہ نے اپنا سفر انجمن ترقی اردو سے شروع کیا۔ یہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انھیں مخطوطات کے شعبے کی ذمہ داری عطا کی جس کے نتیجے میں بہت سے مخطوطات اور تحقیقی مقالات نے کتابی صورت اختیار کی اور تشنگان علم، ادب و تحقیق کو سیراب کیا۔ مشفق خواجہ اچھے شاعر تھے۔ ''ابیات'' ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چونکہ وہ انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے اور قدرت نے انھیں زرخیز علمی و ادبی ذہن سے نوازا تھا اسی لیے انھوں نے اپنی کالم نگاری سے پوری ادبی دنیا کو متاثر کیا۔ یہ کالم نگاری بھی ادق موضوعات سے متعلق نہیں تھی بلکہ طنز و مزاح اور فکاہیہ تحریروں پر مبنی تھی۔ وہ ادیبوں کو ان کی تحریروں اور انٹرویو اور ارشادات کے حوالے سے مزاح اور طنز کا نشانہ اس طرح بناتے تھے کہ مضروب کو بھی ضرب سے لطف کا مزہ حاصل ہوتا تھا۔ ان کا اسلوب مزاح اور طنز ایک علیحدہ ہی طرز رکھتا تھا۔ جس زمانے میں وہ کراچی کے ایک اخبار میں یہ ہفتہ وار کالم تحریر کرتے تھے، اس زمانے میں ہر شخص جمعہ کے دن ''خامہ بگوش کے قلم سے'' والا کالم پڑھنے کے لیے بے چین ہوتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اب کس کی باری ہے؟ مشفق خواجہ جملے میں سے مزاحیہ جملہ تراشنے کا فن جانتے تھے۔ اس میں سے دو متضاد مزاحیہ و طنزیہ صورت ہائے احوال کے امتزاج سے ایک ایسا منظر نامہ وجود میں آتا تھا جس سے کوئی بھی قاری محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ پاتا تھا۔ ان کے کالم کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ معاندانہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ خامہ بگوش کے قلم سے ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' ناقابل فراموش ادبی سرمایہ ہے۔

تحقیق میں بھی انھوں نے اپنے لیے حسب معمول ایک نئی راہ نکالی تھی یعنی تحقیق کے ذریعے حقیقت کے دروازے کا کھولا جانا تاکہ دوسرے اس سے مستفید ہوں اور اس خاص موضوع پر تحقیق کے دوسرے چراغ بھی روشن ہوں۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ صرف اسی شخص کو تحقیق کا موضوع بنائیں جس کا سوفی صد حق ہو جیسے ”غالب اور صفیر بلگرامی“، ”خوش معرکہ زیبا (تذکرہ شعراٗ مصنفہ سعادت خان ناصر)“، ”پرانے شاعر نیا کلام“ ”اقبال از احمد دین (اقبال پر پہلی کتاب جوان کی زندگی میں شائع ہوئی تھی پھر جلادی گئی۔ اس پر خواجہ صاحب کا مقدمہ بھی ہے)“ ”جائزہ مخطوطات اردو“، ”تحقیق نامہ۔“ وہ انجمن ترقی اردو کے رسائل ”قومی زبان“ اور ”قاموس الکتب“ کے علاوہ ”سہ ماہی اردو“ سے متعلق بھی رہے۔ وہ ”سہ ماہی غالب“ کے بھی مدیر تھے لیکن ایک بھاری کام ”کلیات یگانہ“ ہے جس پر آنے والے دنوں میں صحیح معنوں میں جو تبصرے، تجزیے اور مضامین آئیں گے۔ وہ ان کی عظیم ادبی حیثیت اور مرتبے کا صحیح تعین کریں گے گو کہ اب بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی اردو زبان و ادب کی دیومالائی شخصیت کے زیر تربیت ہونے پر کسی بنا پر وہ خود بھی دیومالائی حیثیت اختیار کر چکے ہیں بلکہ میں تو بڑی ذمہ داری سے انھیں اپنے میدان کا مستند لیجنڈ قرار دوں گا۔

وہ عظیم المرتبت حیثیت کے مالک اس لیے بھی بنے کہ شہرت اور نام و نمود سے دور رہے۔ بہت سے لوگ شہرت سے دور رہتے ہیں اور بہت قابل ذکر کام کر جاتے ہیں مگر ان کی بھی محدودیت ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کی خوبی یہ تھی کہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود وہ پوری ادبی دنیا کے ہر ہر شہر اور قصبے میں جاری و ساری ادبی و علمی سرگرمیوں سے واقف تھے۔ ہر کام کی تحریر پڑھتے تھے۔ کتابیں خریدتے تھے۔ انھیں اپنی لائبریری کی سائنسی انداز سے زینت بناتے تھے یعنی ادھر آپ نے کسی کتاب کا نام لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ کتاب کے شیلف پر پہنچ گئے۔ انڈیا، پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے استفسارات کا وہ شافی جواب اسی وجہ سے دے پاتے تھے جس سے لوگ ان کے ممنون احسان رہتے تھے۔ افسوس کہ اب وہ دروازہ بند ہوگیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مشفق خواجہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں

افسوس کہ اب وہ دروازہ بند ہوگیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مشفق خواجہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی عہد میں ایک دوسرا عظیم شخص پیدا کر دیتا ہے۔ لیجنڈز اور کلاسیکل اہمیت کے حامل اشخاص صدیوں کے سفر میں اسی طرح ایک کے بعد ایک آتے رہتے ہیں۔

مشفق خواجہ عظیم انسانی خصوصیات کے حامل آدمی تھے۔ وہ لوگوں سے ملتے تو خوشگوار تاثر چھوڑتے اور کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کرتے کہ ملاقاتی اسے یاد رکھنے پر مجبور ہوتا۔ وہ تعریف کرنے میں کشادہ دل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک دوست کو، جو فکشن کے انداز میں ایک ڈائجسٹ میں معروف و

قابل ذکر شخصیات پر مضامین تحریر کر رہے تھے، ان سے پہلی ملاقات میں اس کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ ان کے پاس پوری سیریز موجود ہے۔ اسی طرح وہ جس ادیب و شاعر اور نقاد میں تخلیقی چنگاری دیکھتے اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ لوگوں کی ضروریات کا بڑا خیال رکھتے تھے اس سے قبل کہ کوئی مدد کا طالب ہو خود ہی خاموشی سے نواز دیا کرتے تھے۔ وہ بے روزگار ادیبوں کے لیے روزگار کا بندوبست بھی خاموشی سے کرتے۔ ایسا لگتا تھا گویا ادب کی دنیا میں موجود افتادان خاک کو اوپر اٹھانے کا انھوں نے ذمہ لیا ہوا تھا۔ وہ بدلہ لینے کے قائل نہ تھے۔ خاصے لوگ ان کے قریب آئے مگر تھوڑے دنوں بعد ان دوستوں کی کم ظرفی نے رنگ دکھایا اور پھر خواجہ صاحب سے دور ہو گئے اور خواجہ صاحب نے بھی انھیں بھلا دیا اس لیے کہ انھیں ''کام بہت مگر زندگی مختصر'' والے مقولے کے تحت اس قسم کے جھگڑے پالنے کا شوق نہ تھا۔ ان سے جو بھی اپنی ذاتی کمزوری کے تحت دور ہوا اس نے اپنا ہی نقصان کیا۔

خواجہ صاحب ہر ہفتے اپنی علمی و ادبی محفل سجاتے تھے جس میں اہم لوگ شریک ہوتے تھے۔ وہ مہمان نواز شخص تھے۔ بھارت اور دوسرے ممالک سے آنے والے ادیبوں شاعروں اور نقادوں کی دعوت کرنا ان پر فرض تھا۔ انھوں نے ''تخلیقی ادب'' کا اجرا کیا تو اس کی دھوم مچ گئی حالاں کہ ''نقوش''، ''سیپ'' اور ''فنون'' کی موجودگی میں ایک نئے رسالے کا نقش جمانا امر محال تھا مگر وہ جذبے سے بھرپور اولوالعزم شخص تھے۔ انھوں نے جس سے ادبی تحریر کے لیے رابطہ کیا اس نے اسے اپنے لیے اعزاز گردانا۔ انھوں نے بغیر طلب کیے تحریروں کا معاوضہ پیش کیا۔ انھوں نے میرے انگریزی ادب کے استاد اور معروف ناول نگار و نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی کی دونوں کتابوں ''ادبی تخلیق اور ناول'' اور ''فریب نظر'' کی بھرپور رائلٹی ادا کی جبکہ بڑے بڑے پبلشروں میں چند پبلشر کتابوں کا معاوضہ دینے میں پس و پیش کرتے ہیں اور کتابوں کی فروخت سے لاکھوں روپے کماتے ہیں مگر یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔

ان کی بذلہ سنجی پر ایک سے زیادہ کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ایک مضمون میں ان کی شخصیت کا احاطہ نہیں ہو سکتا ایک ہی شخص ان پر کئی مضامین تخلیق کر سکتا ہے۔ وہ نگینہ شخصیت تھے جس پر پاکستان، بھارت اور دوسرے ممالک میں موجود اردو زبان و ادب سے متعلق حلقے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ خدا انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مسافر ایسے گئے ہیں کہ لوٹتے ہی نہیں
کھلے ہوئے ہیں ابھی تک گھروں کے دروازے

ڈاکٹر انور محمود خالد

مشفق خواجہ: سرچشمۂ فیض

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے مختصر مضمون ''مشفق خواجہ: کتاب نہیں، چلتی پھرتی کتابیات'' (مطبوعہ ماہنامہ ''انگارے'' ملتان، تیسرا سال (۲۰۰۵ء)، دوسری کتاب) میں بعض دلچسپ ''انکشافات'' کیے ہیں، جو ہم جیسے مشفق خواجہ مرحوم کے نیاز مندوں کے لیے بالکل نئے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کی جناب مشفق خواجہ سے ملاقاتیں گنتی کی (یعنی چار) تھیں اور ان کی شخصی نیاز مندی کا سلسلہ بھی ہرگز دراز نہیں۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان کی مشفق خواجہ صاحب سے ایسی قربت نہیں تھی کہ وہ ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں پر تبصرہ کر سکیں۔ اسی مضمون میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مشفق خواجہ صاحب سے ان کی پہلی ملاقات ۲۰۰۲ء میں اسلام آباد میں ہوئی اور آخری ملاقات ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء کو کراچی میں ہوئی۔ یوں مشفق خواجہ صاحب سے ان کی ۳ برس کے عرصے میں کل چار ملاقاتیں ہوئیں اور وہ، بقول خود، ان کی خلوت تو کیا جلوت کے بارے میں بھی بہت کم جانتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اپنے اس مضمون میں انھوں نے دھڑلے سے بعض ایسی آراء کا اظہار کیا ہے، جو حقیقت سے میل نہیں کھاتیں۔ سب سے پہلے انھوں نے ارشاد فرمایا ہے: ''مشفق خواجہ کی عمومی شہرت، جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھنے والے کی تھی۔ وہ ''جسارت'' میں لکھتے تھے۔ ہفت روزہ 'تکبیر' کی مجلس ادارت یا مجلس مشاورت میں شامل تھے اور جماعت اسلامی کے مؤید اساتذہ کی تنظیم 'تنظیم اساتذہ' کے فعال ارکان کے علمی مددگار ہوتے تھے۔ انھیں کتب اور جرائد فراہم کرتے تھے۔ مخطوطات کی نقول عطا کرتے تھے اور یوں متعلقہ تحقیقی مواد تک رسائی کو ارزاں بناتے تھے۔''

ڈاکٹر انوار احمد کو شاید معلوم نہیں کہ روزنامہ ''جسارت'' کراچی اور بعد ازاں ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی کے مدیر جناب محمد صلاح الدین، مشفق خواجہ صاحب کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے اور انھی کے اصرار پر انھوں نے ''جسارت'' میں سیاسی اور ''تکبیر'' میں ادبی کالم لکھنے شروع کیے تھے۔ ''جسارت'' کے اجرا سے پہلے وہ کراچی کے بعض دیگر اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔ انجمن ترقی اردو، کراچی کی ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ فری لانس جرنلسٹ بن گئے اور ریڈیو کے لیے فیچرز اور اخبارات کے لیے کالم لکھ کر روزی کماتے رہے۔ یہ ان کا ذریعۂ روزگار بھی تھا اور علمی، ادبی اور سیاسی مشغلہ بھی۔ انھیں جماعت اسلامی سمیت کسی سیاسی جماعت سے نہ تو ہمدردی تھی اور نہ بیر۔ وہ معروف معنوں میں سیاسی آدمی تھے ہی نہیں۔ میں نے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

گزشتہ ۳۰ برس کے عرصے میں ان کی زبان سے نہ تو کسی سیاسی لیڈر کے حق میں کوئی بات سنی اور نہ کسی کے خلاف انہیں ناشائستہ لب کشائی کرتے دیکھا۔ یہی رویہ ان کا تمام سیاسی جماعتوں کے بارے میں تھا۔ البتہ جس بات سے انھیں اختلاف ہوتا تھا، وہ اس کا اظہار قلم سے بھی کرتے تھے اور زبان سے بھی۔ ''تکبیر'' کی مجلس مشاورت میں واقعی ان کا نام موجود تھا، لیکن یہ مجلس مشاورت محمد صلاح الدین (مدیر 'تکبیر' کراچی) کے ذاتی دوستوں پر مشتمل تھی۔ ان میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے برادر بزرگ جناب متین الرحمٰن مرتضٰی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، مشفق خواجہ، نصر اللہ خاں اور ابن الحسن کے نام شامل تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان معروف اہل علم کے اسمائے گرامی رسالے کی پیشانی پر جھومر کی طرح سجانے کے لیے تھے اور بس۔ جناب متین الرحمٰن مرتضٰی البتہ کبھی کبھار ''تکبیر'' کا اداریہ لکھ دیتے تھے، حالانکہ وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغ عامہ میں استاد تھے۔ جناب مشفق خواجہ کی جماعت اسلامی سے وابستہ شاعروں کے بارے میں کیا رائے تھی، اس کی ایک مثال جناب سید خالد جامعی مدیر ''جریدہ'' کراچی نے اپنے رسالے کے شمارہ نمبر ۳۱ میں یوں پیش کی ہے:

> ''ایک مرتبہ مشفق خواجہ نے راقم الحروف اور تحسین فراقی کو ''جسارت'' سے وابستگی کے دنوں کا عجیب واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ ''جسارت'' میں ''اندیشۂ شہر'' کا کالم شائع ہونے لگا تو جماعت اسلامی کے مخلص کارکنان اور ارکان وقتاً فوقتاً مجھ سے مشاورت کے لیے تشریف لانے لگے۔ ایک دن جماعت اسلامی کے ایک نہایت مخلص رکن نے ان سے دریافت کیا کہ خواجہ صاحب! پاکستان میں اسلامی نظام کب تک نافذ ہو جائے گا؟ تو میں نے انھیں جواب دیا کہ حضرت! جس دن جماعت اسلامی کا کوئی شاعر ایک عمدہ مصرع موزوں کر لے گا۔''

ڈاکٹر انوار احمد نے مشفق خواجہ کی طرف سے کتب و جرائد، مخطوطات اور تحقیقی مواد کی فراہمی کو جماعت اسلامی کے وابستگان تک محدود کر کے مرحوم کی روح سے انصاف نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب مشفق خواجہ، ہر سائل علم کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس میں اسلام پسند یا ترقی پسند، یمینی یا یساری، بڑے یا چھوٹے، اپنے یا پرائے، معروف یا غیر معروف، واقف یا ناواقف، دوست یا دشمن کی تخصیص نہیں تھی۔ راقم الحروف کی کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں مشفق خواجہ مرحوم سے 'لمبے وقفوں کے بعد' ہفتہ ہفتہ بھر ملاقاتیں رہیں۔ ان ملاقاتوں میں میں نے دیکھا کہ ہر مکتبۂ فکر کے لوگ ان سے ملنے کے لیے چلے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر کئی برس پہلے جب وہ ایک میٹنگ کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو اپنے ایک عزیز کے گھر چھاؤنی

WWW.KITABOSUNNAT.COM

میں ٹھہرے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں فیصل آباد سے لاہور گیا اور ڈاکٹر صدیق جاوید کو ہمراہ لے کر ان کی قیام گاہ پر پہنچا۔ وہاں پہلے سے ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جعفر بلوچ اور ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سہ پہر کے قریب وہاں پہنچے اور مغرب تک وہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ جب ملنے والوں کی ایک اور کھیپ چلی آئی تو ہم اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔

کراچی میں ناظم آباد میں ان کی رہائش گاہ پر ہر اتوار کو دن کے گیارہ بجے سے دو اڑھائی بجے بعد دوپہر تک نشستوں میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ وہاں بھی بڑے چھوٹے، ہر طرح کے تشنگان علم کا ہجوم دیکھا۔ کسی کو کسی کتاب کی ضرورت ہوتی۔ کسی کو کسی مخطوطے کی نقل کی۔ کسی کو کسی پرانے رسالے کا کوئی مضمون درکار ہوتا۔ کوئی ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے مواد کی تلاش میں ان کے در دولت پر پہنچا ہوتا۔ وہ حسب توفیق، ہر ضرورت مند کی مدد کرتے۔ خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے بھی بعض اصحاب علمی مدد کے خواہش مند ہوتے اور وہ انھیں ان کی مطلوبہ اشیاء اپنے پلے سے رقم خرچ کر کے ارسال کرتے۔ میری ایک شاگرد، زمرد کوثر، پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے غمگین دہلوی پر پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ مشفق خواجہ کے پاس غمگین دہلوی کا قلمی دیوان ہے۔ اس نے میرے حوالے سے مشفق خواجہ صاحب کو خط لکھا۔ ایک ہفتے کے بعد جناب مشفق خواجہ نے اپنی ذاتی لائبریری سے، انجمن ترقی اردو، کراچی کے کتب خانے سے حاصل کردہ مخطوطے کی فوٹو کاپی کی نقل اپنی گرہ سے کرا کر انھیں ارسال کر دی۔ محمد اکرام چغتائی، رفاقت علی شاہد اور ڈاکٹر طیب منیر سمیت بے شمار ریسرچ سکالر کراچی جا کر ان سے نہ صرف ملتے رہے بلکہ بعض افراد تو ہفتہ ہفتہ بھر ان کی لائبریری میں قیام کر کے، مطلوبہ مواد ڈھونڈ کر اور فوٹو سٹیٹ کروا کر شاد و کامران واپس گھر لوٹتے رہے۔ بقول سید خالد جامعی: ”خواجہ صاحب کی زندگی، مطالعہ، مشاہدہ اور خدمت کا حسین مرقع تھی۔ ان کی علمی، ادبی، تحقیقی خدمات سے سب لوگ بخوبی واقف ہیں لیکن خاندان کے لوگوں کی خدمت میں بھی وہ ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ قریبی لوگوں سے ایسی محبت اور ان کی ایسی خدمت، قحط الرجال کے موسم میں رنجیدہ طبائع کو حوصلے اور امنگ سے معمور کر دیتی ہے۔“

راشد شیخ بھی گواہی دیتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے اپنے قیمتی وقت اور صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر انوار احمد کو مشفق خواجہ سے صرف وہی چند لوگ استفادہ کرتے نظر آئے جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ ہزاروں لوگ نظر نہیں آئے، جن کی مشفق خواجہ، فی سبیل اللہ مدد کرتے تھے۔ مرحوم کی وفات پر اندرون و بیرون ملک جو تعزیتی کالم اور مضامین مسلسل اخبارات و رسائل

میں چھپ رہے ہیں، وہ بھی گواہی دے رہے ہیں کہ جناب مشفق خواجہ کا فیضان، خدائی نعمتوں، ہوا اور پانی کی طرح، ہر کہ و مہ کے لیے عام تھا۔ ایسے لوگ، عطیۂ خداوندی ہوتے ہیں اور ان کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں (مشفق خواجہ) نے اسلام آباد میں (اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین) افتخار عارف کے کمرے میں بیٹھے ہوئے یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کا ذکر چھیڑا اور ہماری یونیورسٹی (زکریا یونیورسٹی ملتان) کا ذکر بطرز تعریض کیا...... انھوں نے ادبی جرائد پر پی ایچ ڈی کے مقالات لکھوانے کی روش پر اعتراض کیا (ڈاکٹر شگفتہ حسین کا مقالہ بحوالہ ''ادب لطیف'' اور ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کا مقالہ بحوالہ ''ساقی'')۔ کاش ڈاکٹر انوار احمد، واضح الفاظ میں بتاتے کہ جناب مشفق خواجہ کے تعریفی الفاظ کیا تھے؟ پھر ان کی تائید یا تردید کی جا سکتی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے جو مقالے لکھوائے جا رہے ہیں، ان کا تحقیقی معیار کیا ہے؟ (اس بارے میں ہم، بطور ڈین فیکلٹی آف آرٹس نہیں، بلکہ بطور ایک صاحب علم ڈاکٹر انوار احمد کی دیانت دارانہ رائے جاننے کے منتظر ہیں) راقم الحروف کا ۳۳ برس کا ایم اے اردو کی تدریس اور متعدد یونیورسٹیوں کے لاتعداد مقالات کی نگرانی کا تجربہ ہے۔ لہٰذا وہ یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے نوے پچانویں فی صد تحقیقی مقالات غیر معیاری ہوتے ہیں۔ بے شمار یونیورسٹی مقالات تو اس قابل ہی نہیں سمجھے جاتے کہ انھیں اشاعت کی اجازت ہی دی جائے۔ شائع شدہ مقالات دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج کل ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کا معیار کیا ہے؟ عجیب بھیڑ چال ہے کہ کہیں ''فلاں بطور غالب شناس'' پر بیسیوں تحقیقی مقالے لکھوائے جا رہے ہیں اور کہیں ''فلاں بطور اقبال شناس پر پچاسوں مرتبہ تحقیق کروا کر اقبال کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ یہی حال ادبی رسائل پر پی ایچ ڈی کے مقالات کا ہے۔ پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم اے کی سطح پر متعدد ادبی رسائل پر مقالے لکھے جا چکے ہیں (''فنون''، ''اوراق''، ''سیپ'' اور ''نقوش''، وغیرہ پر مقالے میری نظر سے گزر چکے ہیں)۔ بعض لوگوں نے ایم فل کی سطح پر انھی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ بس پی ایچ ڈی کی ڈگری ان کی دست برد سے محفوظ تھی۔ اب اگر ملتان یونیورسٹی نے ادبی رسائل پر بھی پی ایچ ڈی کروانا شروع کر دی ہے تو سبحان اللہ! مشفق خواجہ صاحب نے اگر اس پر اعتراض کیا تھا تو بہت زیادتی کی تھی۔ انھیں اس بات کا احساس کرنا چاہیے تھا کہ اگر بیچارے محقق کو کوئی ڈھنگ کا موضوع نہ سوجھے تو وہ کیا کرے؟ ویسے ڈاکٹر انوار احمد ایمان داری سے بتائیں کہ کیا واقعی پی ایچ ڈی کے لیے اب کوئی اور موضوع نہیں بچا کہ وہ ادبی رسائل پر نہ صرف دھڑا دھڑ پی ایچ ڈی کروائے جا رہے ہیں بلکہ اپنی یونیورسٹی

کے اعلیٰ تحقیقی معیار کے دفاع میں بقول خود مشفق خواجہ صاحب کی عمر اور علمی مرتبے سے بے نیاز ہو کر ان سے الجھ بھی گئے؟ واہ ڈاکٹر انوار احمد! بہت خوب۔ اب اگر آپ یہ سب کچھ کر ہی گزرے تو اپنے اندازِ تکلم پر بعد میں ندامت میں کیسی؟ گستاخی پر شرمندگی کیسی؟ اس علمی خدمت پر آپ کو تو "پرائڈ آف پرفارمنس" ملنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر انوار احمد نے مشفق خواجہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ بلاشبہ عالم بے بدل تھے، بذلہ سنج تھے، محفل آرا تھے، کشادہ دل اور وضع دار تھے، مگر میرا گمان ہے کہ کچھ لوگوں سے علمی حساب کتاب چکانے کے بعض طلب گاروں کی مطلوب اور نا مطلوب علمی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح کی ایک مجلس تھی جس میں، میں نے قیاس کیا کہ کچھ لوگ بعض ایسی کتابوں کے سلسلے میں ان سے علمی امداد چاہتے ہیں جو موضوع بننے والی شخصیتوں کا علمی اعتبار تو گھٹاتی ہی ہیں مگر مصنفوں اور مرتبوں کی عزت میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ سو میں نے بڑے ادب سے مگر بآوازِ بلند ڈاکٹر معین الرحمٰن اور مرزا حامد بیگ کے دفاع میں نہیں، اردو کے بھی اساتذہ اور بھی مصنفوں کی بچی کھچی عزت کو قائم رکھنے کے حق میں بعض باتیں کیں جو محفل کے رنگ اور مزاج کے منافی تھیں۔ یہ ان کی عظمت ہے کہ انھوں نے نہ صرف سلیقے سے اس موضوع کو تبدیل کیا بلکہ اگلی ملاقات میں میری کہی ہوئی بعض باتوں کے سلسلے میں کچھ توضیح طلب سوالات بھی کیے۔"

ڈاکٹر انوار احمد بڑی ذہانت سے تعریف میں تعریض اور سچ میں جھوٹ ملا دیا ہے۔ میرا گمان ہے کہ وہ یا تو پوری صورت حال سے آگاہ نہیں ہیں یا محض ایک گروہ کے تلبیسی بیانات کو سچ سمجھ کر مشفق خواجہ اور ان کے بعض دوستوں کو نشانہ تنقید بنا رہے ہیں۔ یا پھر اگر وہ مذکورہ بالا دونوں "محققین" کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود یہ رائے رکھنے پر مصر ہیں تو پھر وہ انصاف کا خون کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد نے مذکورہ بالا اقتباس میں جان بوجھ کر ابہام رکھا ہے تاکہ جو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں اور جو نہیں جانتے، وہ اسی مغالطہ کا شکار رہیں کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ بے چارے تو معصوم ہیں، بس ان کے تحقیقی کارناموں پر انگلیاں اٹھانے والے گنہ گار ہیں۔

نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے لیکن میرے نزدیک مشفق خواجہ کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ ہزاروں آدمی انھیں جانتے تھے اور وہ ہزاروں آدمیوں کو جانتے تھے۔ مشفق خواجہ ہر اس شخص کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے جو انھیں حاجت روا سمجھتا تھا۔ اگر کسی شخص نے ان سے "دیوانِ غالب" (نسخۂ لاہور) جسے ڈاکٹر معین الرحمٰن "نسخۂ خواجہ" کے نام سے متعارف کرواتے ہیں، کی ابتدائی اصل مخطوطہ سے کرائی گئی فوٹوسٹیٹ کاپی مانگی، تو انھوں نے وہ مہیا کر دی کیونکہ وہ شخص "پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی لگی ہوئی ان مہروں

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کی تصدیق کرنا چاہتا تھا جو اصل مخطوطے پر تو موجود تھیں مگر جسے اپنی ملکیت ظاہر کرنے کے لیے ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے حصول کے بعد اپنے پاس موجود مخطوطے سے حذف کر دیا تھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے بے طلب بھی کسی کو کوئی چیز دی اور نہ کسی طلب گار کو کبھی مایوس کیا۔ اگر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بھی ان سے کوئی چیز مانگتے تو وہ انھیں بھی ان کی مطلوبہ شئے مہیا کر دیتے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے سلسلے میں مشفق خواجہ صاحب سے کوئی مواد کسی نے نہیں مانگا۔ ڈاکٹر صدیق جاوید نے ان کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے (ناطقہ سر بگریباں ۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی ’’تحقیق نگاری‘‘) اس کا سارا کریڈٹ ڈاکٹر صدیق جاوید کو جاتا ہے، جنھوں نے علالت کے باوجود، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحقیقی اغلاط کی نشاندہی کی اور ٹی ایس ایلیٹ اور عزیز احمد کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کیں۔ میرا گمان ہے کہ ڈاکٹر انوار احمد نے ’’ناطقہ سر بگریباں‘‘ یا تو پڑھی نہیں یا سرسری دیکھی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بارے میں ڈاکٹر صدیق جاوید کی کتاب ’’تحقیق کے چراغ تلے‘‘ جب شائع ہوگی اور ڈاکٹر انوار احمد اسے پڑھیں گے تو پھر ان سے پوچھیں گے کہ اس میں غلط بات کون سی ہے؟ ڈاکٹر صدیق جاوید کی دونوں کتابیں پڑھے بغیر ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر معین الرحمٰن اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی بچی کھچی عزت بچانے بیٹھ گئے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ اس طرح کی کتابیں، موضوع بننے والی شخصیتوں کا علمی اعتبار گھٹاتی ہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والوں کی عزت میں بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ کیا ڈاکٹر انوار احمد یہ چاہتے ہیں کہ یہ نام نہاد محققین، دوسروں کی محنت کو اپنے کھاتے میں ڈالتے رہیں، دوسروں کی خون پسینے کی کمائی پر اپنا حق ملکیت جتاتے رہیں، دوسروں کی تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور تدوینی کاوشوں کو اپنی تحقیق، تنقید، تخلیق اور تدوین ظاہر کریں اور باقی لوگ صرف اس لیے چپ بیٹھے رہیں کہ ان جعلی محققوں کو اپنی کتابوں کی اشاعت کی ہر سہولت میسر ہے؟ ڈاکٹر انوار احمد کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ، اپنے علمی حریفوں سے حساب کتاب چکا رہے تھے، وہ کچھ ایسے بے وسیلہ بھی نہ تھے۔ ان کی اپنی ذاتی لائبریریاں ہیں۔ بزرگ علمی شخصیات سے ان کے اپنے مراسم ہیں۔ ان کے اپنے ذرائع معلومات ہیں۔ ان کی اپنی منفرد ذہانتیں ہیں۔ ان کا اپنا علمی مقام و مرتبہ ہے اور وہ بھی ادبی دنیا میں اسی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں، جس طرح وہ اصحاب، جن کی ڈاکٹر انوار احمد ڈھال بن کر مشفق خواجہ اور ان کے بعض دوستوں کو مطعون کر رہے ہیں۔ نامور اساتذہ اور مشہور مصنفین کی عزت کا دفاع، اپنی جگہ قابل قدر جذبہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر انوار احمد کو چاہیے کہ اپنے ان ممدوحین کو بھی سمجھائیں کہ وہ ایسے کام نہ کیا کریں جن سے ان کی عزت پر بٹا لگنے کا خطرہ ہو۔ شیشے کے محلوں میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر برسانے والوں کو اتنا تو علم ہونا چاہیے کہ جوابی کارروائی میں ان کے شیش محل بھی چکنا چور ہو سکتے ہیں۔

مضمون کے آخر میں ڈاکٹر انوار احمد نے جناب مشفق خواجہ سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ”ان سے میری آخری ملاقات ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء کو کراچی میں ہوئی تھی جہاں میں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر ظفر عالم ظفری ”یادگارِ نگار و نیاز“ کی تقریب میں مقالات پڑھنے گئے تھے۔ مشفق خواجہ اس محفل میں تو موجود نہیں تھے البتہ کراچی کے ایک خدا ترس شخص نے تمام مہمانوں کو عشائیے کے لیے اپنے گھر اس طرح مدعو کیا تھا کہ وہاں ایک شاندار شامیانہ لگا تھا اور موسیقی کے لیے سٹیج بھی بنایا گیا تھا، مگر ہم سب ایسے خستہ حال اور بدذوق تھے کہ موسیقی پر کھانے کو اور نیند کو ترجیح دینے پر مجبور تھے۔ یہیں مشفق خواجہ صاحب موجود تھے اور جب ہم سب کھانا کھا کر میزبان کے سینے پر مونگ دلتے ہوئے موسیقی سنے بغیر اس گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو خواجہ صاحب ہم سب کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہاں بیٹھے تھے اور اس حوصلے کے ساتھ کہ وہ نصف شب گزرنے کے بعد بھی وہاں بیٹھے رہ سکتے ہیں۔“

اتفاق سے اس وقت میرے سامنے مشفق خواجہ صاحب کا ۲۹ دسمبر ۲۰۰۴ء کا میرے نام لکھا ہوا خط پڑا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء والی اس تقریب کا بھی ذکر ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر انوار احمد نے اوپر دیا ہے۔ پورا خط پڑھیے اور لطف اٹھایئے۔

۳۔ ڈی۔ ۹/۲۶، ناظم آباد
کراچی۔ ۷۴۶۰۸

برادرِ عزیز و مکرم! سلام مسنون۔

یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کے چار خطوں کے جواب میں، میں بھی چار خط لکھوں کیونکہ خطوں میں لکھے جانے والے اکثر معاملات ٹیلی فون پر طے ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اب کتاب میں تاخیر بالکل نہیں ہونی چاہیے۔ کل ڈاکٹر سلیم اختر صاحب میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ وہ ہر سال نگار کے جلسے میں کراچی آتے ہیں تو ایک دن میرے ساتھ گزارتے ہیں۔ پہلے تو ہم سمندر کے کنارے جا بیٹھتے تھے اور ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے مگر اب جب کہ آتش بوڑھا ہو چکا ہے، اس لیے ہم نے کل کا دن گھر میں بیٹھ کر باتیں کرنے میں گزارہ۔ اس دوران میں ڈاکٹر صدیق جاوید صاحب کی کتاب کا ذکر بھی آیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے کہا کہ لاہور میں اس کا شدید انتظار ہے۔

انیس ناگی کی تازہ ترین کتاب ”پاکستانی اردو ادب کی تاریخ“ کل ہی موصول ہوئی ہے۔ اسے اگر کتاب اللطائف کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے۔ اس میں دو تین صفحے ”تحقیق“ پر بھی ضائع کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ یہ دلچسپ جملہ ملتا ہے:

”پاکستان کے کتب خانوں سے قلمی نسخے چوری کر کے ان پر اپنا نام مرتب لکھ کر شائع
کرنا پاکستانی محققوں کا شیوہ رہا ہے“۔ (ص ۲۶۵)

انیس ناگی کا بھی جواب نہیں، ایک کا کام سارے محققوں کی جھولی میں ڈال دیا۔

آج کل کراچی میں سردی اور مہمانوں کی لہر آئی ہوئی ہے۔ ہندوستان سے ڈاکٹر انور معظم، جیلانی بانو اور ڈاکٹر خلیق انجم آئے ہوئے ہیں۔ لاہور سے ڈاکٹر سلیم اختر۔ ایک ریوڑ ملتان سے بھی آیا تھا نگار کے جلسے کے لیے۔ وہ لوگ دوسرے دن ہی چلے گئے، جیسے نگار کے جلسے میں شرکت کے بعد وہ منہ دکھانے کے لائق نہ رہے ہوں۔ تینوں ہندوستانی ادیب اس وقت اسلام آباد میں ہیں۔ آج شام اکادمی ادبیات ان کے اعزاز میں ایک جلسہ کر رہی ہے۔ کاش آپ ان سے ملتے۔ مجھے تو ان تینوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔

ساقی کے نام کا خط آپ کو بھیجنا بھول گیا تھا۔ اب بھیجتا ہوں۔ اس دوران میں اسے ایک اور خط لکھا۔ اس کی نقل بھی ارسال خدمت ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں خط بصیغۂ راز ہیں۔

پرویز پروازی کی کتاب میرے لیے ضرور حاصل کیجیے۔ بے حد کرم ہوگا۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن نے گوئٹے کے دیوان شرق و غرب کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔ آپ کی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس میں ”ساقی نامہ“ بھی ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ (دستخط)
۲۹-۱۲-۲۰۰۴ء

بخدمت گرامی انور محمود خالد صاحب
فیصل آباد۔

WWW.KITABSTAN.COM

ڈاکٹر انور محمود خالد

مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں

ماہنامہ ''الحمرا'' شمارہ مارچ ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے ''مشفق خواجہ کے سانحۂ رحلت پر چند حرف'' کے عنوان سے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان میں سے بعض سے مشفق خواجہ مرحوم کے جاننے والوں کو اختلاف ہوگا۔ ڈاکٹر معین صاحب نے ارشاد فرمایا ہے: ''میرے ان کے مراسم ۱۹۵۹ء سے تھے۔ لاہور کی حد تک کم عمروں میں میرے علاوہ ان کا اتنا پرانا جاننے والا، شاید ہی کوئی اور ہو۔'' یہ کم عمری کی شرط بھی خوب ہے۔ معین صاحب اب ۶۲ کے پیٹے میں ہیں۔ ان کے نزدیک کم عمری کی حد کون سی ہے؟ دراصل وہ ڈاکٹر وحید قریشی کو ''بائی پاس'' کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب عمر میں ان سے کہیں بڑے ہیں اور ان کے مشفق خواجہ مرحوم کے ساتھ مراسم بھی ڈاکٹر معین صاحب سے زیادہ دیرینہ ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے مشفق خواجہ مرحوم سے اپنے ۴۵ سالہ مراسم کا دعویٰ کیا ہے لیکن اتنے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے مراسم کے باوجود انھوں نے مرحوم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اسے ''ہجوِ ملیح'' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''ان کے ذخیرۂ کتب کی بڑی شہرت رہی۔ قدیم اور جدید مآخذ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس حوالے سے ان کا جو کام سامنے آیا، وہ بہت اچھا، بے حد معیاری لیکن بہت کم ہے۔ بابائے اردو پر ان کے ذخیرے میں بڑا قیمتی مالی مسالہ موجود تھا لیکن وہ اس موضوع پر سوچتے بہت رہے، کر کچھ نہ پائے۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ، ان کے گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر ہوا۔ وہ بڑے بامروّت آدمی تھے اور بہت زیادہ بہتر اور بہت یادگار علمی کارناموں کے سرانجام دینے کے اہل تھے۔''

مشفق خواجہ مرحوم سے راقم الحروف کے مراسم ۴۵ سالہ تو نہیں البتہ ۳۰ سالہ ضرور تھے۔ میری مرحوم سے نہ صرف باقاعدہ خط کتابت رہی بلکہ تین مواقع پر ایک ایک ہفتہ ان کو قریب سے دیکھنے، ان کے علمی کاموں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے اور ان کے صرفِ اوقات کے مشاہدے کا موقع ملا۔ یہ ملاقاتیں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہوئیں۔ ڈاکٹر معین صاحب نے فرمایا ہے: ''ان کے ذخیرۂ کتب کی بڑی شہرت رہی۔'' کیا معین صاحب کو اتنی طویل دوستی کے باوجود ایک بار بھی ان کے ذاتی کتب خانہ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا؟ بہرحال راقم الحروف کو تو تین برس، پہلے کراچی کے ایک ہفتہ کے قیام کے دوران، ان کے ذخیرۂ کتب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے جناب خالد اسحاق، اے۔ کے بروہی اور ڈاکٹر معین

الدین عقیل کے ذاتی کتب خانے تو نہیں دیکھے، حالانکہ ان کے ذخیرۂ کتب کی بڑی شہرت سنی تھی، لیکن لاہور، راولپنڈی / اسلام آباد، کراچی، ملتان، پشاور اور فیصل آباد وغیرہ میں اپنے بعض احباب کے ذاتی کتب خانے دیکھنے کی پرمسرت سعادت ضرور نصیب ہوئی۔ ان میں خود معین صاحب اور لطیف الزمان خان صاحب (ملتان) کے عمدہ ذاتی کتب خانے شامل ہیں لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ نادر کتب و رسائل، مخطوطات، مسکوکات نیز خطوط اور اخباری تراشوں کا جو انبار بے پایاں مرحوم مشفق خواجہ کے ہاں دیکھنے میں آیا، وہ کہیں اور نظر نہیں آیا۔ ناظم آباد، کراچی، کے ایک چھوٹے سے مکان میں جو تین منزلہ تھا، دس کمروں میں جس سلیقے اور ترتیب کے ساتھ یہ سارا ذخیرہ محفوظ اور 'ریڈی ہینڈ' رکھا گیا تھا، اس کی کوئی اور مثال کم از کم مجھے اپنی مختصر زندگی میں نہیں ملی۔

ڈاکٹر معین صاحب نے جدید و قدیم مآخذ کے حوالے سے مشفق خواجہ کے کام کی تعریف کی ہے۔ اسے 'بہت اچھا' اور 'بے حد معیاری' قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی ''بہت کم'' کی پخ بھی لگا دی ہے۔ گویا وہ مشفق خواجہ مرحوم کے تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کام کے معیار سے تو مطمئن ہیں لیکن مقدار سے نہیں۔ کسی بھی شخص کے علمی مقام و مرتبہ کا تعین اس کے کام کے معیار سے لگایا جاتا ہے، مقدار سے نہیں۔ مشفق خواجہ مرحوم آئس برگ کی طرح تھے۔ ان کے کام کا بہت تھوڑا حصہ ہمارے سامنے ہے اور بقیہ بڑا حصہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں (i) ''خوش معرکۂ زیبا'' (تذکرہ از سعادت خاں ناصر)، (ii) اقبال (از احمد دین)، (iii) جائزۂ مخطوطاتِ اردو'' (جلد اول)، (iv) ''غالب اور صفیر بلگرامی''، (v) ''تحقیق نامہ''، (vi) ''ابیات''، (vii) خامہ بگوش کے قلم سے، (viii) سخن در سخن، (ix) سخن ہائے ناگفتنی اور کلیات یگانہ (از مرزا یاس یگانہ چنگیزی) کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ''ابیات'' ان کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ ''تحقیق نامہ'' ان کے منتخب تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' ان کے طنزیہ و مزاحیہ ادبی کالموں کے مجموعے ہیں۔ ان کی مذکورہ بالا باقی کتابیں ان کی تدوین کے شاہکار ہیں۔ یہ کام ''بہت کم'' بالکل نہیں ہے۔

یہ بھی سب جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ مرحوم نے ''تخلیقی ادب'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں ایک جریدی سلسلہ شروع کیا تھا جس کے پانچ ضخیم حصے، جو اعلیٰ پائے کے عصری ادب پر مشتمل تھے، شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ''پرانے شاعر، نیا کلام'' کے عنوان سے سہ ماہی ''غالب'' کراچی میں ایک سلسلۂ مضامین شائع کرنا شروع کیا تھا۔ یہ اردو کے بعض کلاسیکی شعرا مثلاً خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ، جسونت سنگھ پروانہؔ، فضل علی

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ممتازؔ اور ولی اللہ محبؔ وغیرہ کا محققانہ سلسلۂ تعارف تھا جس میں نہ صرف ان قدیم شعرا کے مفصل سوانح حیات لکھے ہیں بلکہ ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔ یہ دراصل ایک پوری کتاب ہے، جو سہ ماہی ''غالبؔ'' میں بالاقساط شائع ہوئی اور مشفق خواجہ صاحب نے اپنی بے نیازی کی وجہ سے اسے کتابی شکل میں لانے کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ ان کے پیشِ نظر کئی مزید اہم علمی منصوبے تھے، جن پر وہ کام کر رہے تھے۔

۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو مشفق خواجہ صاحب کا انتقال ہوا۔ اپنی وفات سے دس روز پہلے (۱۰ فروری کو) انھوں نے راقم الحروف کو بذریعہ ڈاک پارسل ''جریدہ'' کا شمارہ نمبر ۲۹ اور بشیر احمد قریشی ہاپوڑی کی کتاب ''بابائے اردو کی کہانی ان کے معتمد کی زبانی'' کے علاوہ ''ثاقب لکھنوی کی بیاضوں میں غیر مطبوعہ کلام اور اصلاحیں'' کے عنوان سے لکھا ہوا ۱۸۴ صفحات پر مشتمل اپنی مضمون بھیجا جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مجلّہ ''تحقیق'' میں ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔ مشفق خواجہ مرحوم نے اسے جلد کروا کر مجھے کتابی شکل میں ارسال کیا اور اوپر لکھا: ''یہ ایک پرانا مضمون رکھا تھا۔ یہاں نہیں تو آپ ہی کے ہاں پڑا رہے۔'' ایسے نہ جانے کتنے مضمون، ان کے لکھے ہوئے، ان کی لائبریری کے کونوں کھدروں میں پڑے ہوں گے۔ میں نے بارہا خطوں میں اور ٹیلی فون پر ان سے اصرار کیا کہ اپنی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحقیقی، تنقیدی، تدوینی، تالیفی اور تخلیقی تحریروں کو کتابی شکل میں محفوظ کریں لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتے تھے اور کہتے تھے کہ جو نئے کام شروع کر رکھے ہیں، پہلے انھیں تو مکمل کرلوں۔

مجھے یاد ہے کہ دو سال پہلے اپنے پہلے ہارٹ اٹیک کے بعد جب انھیں ڈاکٹروں کی طرف سے پڑھنے لکھنے کی اجازت ملی تو انھوں نے اپنے والد گرامی خواجہ عبدالوحید کے لکھے ہوئے روزنامچوں کو ایڈٹ کرنا شروع کر دیا اور ان کے مجمل حواشی بھی لکھے۔ اس کتاب پر ان کا پورا ایک برس صرف ہوا۔ اپنی زندگی میں ہی وہ اس کی پروف خوانی سے فارغ ہو چکے تھے۔ مبین مرزا کے ادارے، اکادمی بازیافت کراچی سے یہ روزنامچے دو جلدوں میں شائع ہونے والے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے علامہ اقبال کے بارے میں بہت سا نادر مواد پہلی بار سامنے آئے گا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی کے تحقیقی مجلّہ ''جریدہ'' کے شمارہ نمبر ۳۰ میں خواجہ عبدالوحید کی یہ ڈائری ''یادِ ایام'' کے نام سے چھپ رہی ہے۔

مشفق خواجہ مرحوم کی کتاب ''جائزہ مخطوطاتِ اردو'' کی صرف پہلی جلد ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہوئی تھی جو ۱۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے پاس عرصۂ دراز سے اشاعت کے لیے پڑی ہے۔ مشفق خواجہ مرحوم نے یہ کام دس جلدوں میں مکمل کرنے کا

WWW.KITAABISTAN.COM

ذکر کیا تھا اور اسے غالباً مقتدرہ قومی زبان کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ کتاب عوام کی نہیں، خواص کی دلچسپی کی چیز ہے اس لیے اس کی اشاعت معرضِ التوا میں پڑی ہوئی ہے جب یہ کتاب شائع ہوگی تو معلوم ہوگا کہ مشفق خواجہ مرحوم نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔

ان کا آخری مطبوعہ شاہکار ''کلیات یگانہ'' ہے جو ترتیب و تدوین کا بے مثال نمونہ ہے۔ یہ کتاب جنوری ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی اور ۹۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں یگانہ کا سارا کلام نہ صرف جمع کیا گیا ہے بلکہ مرتب کے طویل دیباچے کے علاوہ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ضمائم، فرہنگ اور حواشی تحریر کرنے پر جو محنت کی گئی ہے اس کی توفیق بہت کم محققین کو نصیب ہوتی ہے۔ مشفق خواجہ نے لگ بھگ اٹھارہ برس ''کلیات یگانہ'' کی تدوین میں صرف کیے۔

ڈاکٹر معین صاحب نے بابائے اردو مولوی عبدالحق پر، مشفق خواجہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں بڑا قیمتی مال مسالہ موجود ہونے کی اطلاع دی ہے۔ یہ بات درست ہے لیکن ان کا یہ کہنا محلِ نظر ہے کہ وہ اس موضوع پر سوچتے بہت رہے، کر کچھ نہ پائے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مشفق خواجہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو کتب و رسائل میں پہلے سے شائع شدہ مضامین کو ادھر ادھر سے اٹھا کر نصف درجن نئی کتابیں تیار کر لیتے ہیں اور پھر ان پر بطور مرتب، مؤلف یا مصنف اپنا نام درج کر کے دل خوش کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ ہمیشہ باقاعدہ تحقیقی منصوبہ بندی کر کے اپنا کام کرتے تھے اور پھر تکمیل کر کے دم لیتے تھے۔ مشفق خواجہ کی بیگم آمنہ صدیقی نے شادی سے پہلے ''افکارِ عبدالحق'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی تھی۔ وہ اردو اور اسلامی تاریخ میں ایم اے کر کے ایک مقامی کالج میں اردو کی لیکچرار بن گئیں۔ وہ چاہتیں تو بابائے اردو مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کرنا ان کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔ بقول معین صاحب بڑا قیمتی مال مسالہ گھر میں موجود تھا۔ مگر انھوں نے داغ پر پی ایچ ڈی کرنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ ان کا ارادہ سرسید اور مولوی عبدالحق پر بھی کام کرنے کا تھا لیکن داغ پر معیاری کام کے فقدان کی وجہ سے ان کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔

خود مشفق خواجہ صاحب نے اردو میں ایم اے کیا تھا اور ان کا ایم اے کا تحقیقی مقالہ ''اردو میں آپ [illegible]'' کے موضوع پر تھا۔ یہ مقالہ بھی تاہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ میرے بار بار اصرار کے باوجود وہ اس کی اشاعت سے گریزاں رہے کیونکہ وہ ان کے اپنے مقرر کردہ تحقیقی معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ چاہتے تو وہ خود بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق پر تحقیقی کام کر سکتے تھے کیونکہ جتنا وہ مولوی عبدالحق کے قریب رہے، اتنا اور کون رہا [illegible]؟ لیکن ان کی دلچسپی کے موضوعات دوسرے تھے اور انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات کو ہی تحقیق کے

لیے منتخب کیا اور ان پر اعلیٰ پائے کا کام کیا۔ معین صاحب بتائیں کہ ان سمیت، مولوی عبدالحق پر اور کون کون بہت سوچ رہا ہے اور کون اس موضوع پر وقیع تحقیقی کام کر پایا ہے؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان (مشفق خواجہ) کے وقت کا بیشتر حصہ، ان کے گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر ہوا۔" امر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے نہایت سختی سے اپنا ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا اور وہ اس کے مطابق کام بھی کرتے تھے اور تفریح کی خاطر گپ شپ بھی۔ اس معاملے پر میری بارہا ان سے ٹیلی فون پر بھی گفتگو ہوئی، خطوں میں بھی اس کا ذکر ہوا۔ تین برس پہلے جب میں کراچی گیا اور مشفق خواجہ کے در دولت پر تین دن مسلسل (وقت طے کر کے) حاضر ہوتا رہا تو معلوم ہوا کہ وہ عموماً صبح دیر سے اٹھتے تھے لیکن دس ساڑھے دس بجے تک ناشتہ کر کے اپنے کام میں جت جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ ایک گھنٹہ قیلولہ کرتے اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے تحقیقی کام میں کھو جاتے۔ رات دس ساڑھے دس بجے وہ رات کا کھانا کھاتے اور پھر نیند آنے تک تازہ آمدہ کتب و رسائل اور خطوط کا مطالعہ کرتے۔ عموماً ایک دو بجے کے قریب وہ سوتے۔ اتوار کو دن کے گیارہ بجے ان کے دوست احباب ان کے ناظم آباد والے گھر میں جمع ہوتے جو بیک وقت ان کی رہائش گاہ، کتب خانہ اور دارالمطالعہ تھا۔ یہ مجلسِ یاراں دو اڑھائی بجے تک جاری رہتی۔ مجھے بھی اس مجلس میں شرکت کا موقع ملا۔ مقامی اور غیر مقامی، خواتین و حضرات، سکالرز اور ان کے مداح سب یہاں جمع ہوتے تھے اور ادبی گپ شپ ہوتی تھی۔ اڑھائی بجے بعد دوپہر یہ مجلس برخواست ہو جاتی تھی اور اگر کوئی باہر کا مہمان مشفق خواجہ صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوتا تو وہ اسے روک لیتے اور تین چار اور دوستوں کو بھی۔ پھر اپنی پرانی سفید رنگ کی سوزوکی مہران گاڑی میں انھیں سوار کر کے کسی قریبی ریستوران میں لے جاتے اور پرتکلف کھانا کھلاتے۔ وہ خود بہت کم بلکہ پرہیزی کھانا کھاتے لیکن کھانے کا نفیس ہونا شرط تھی۔ میں نے جب بھی ان کے معمولات زندگی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہی میرا عام چلن ہے۔ ہفتے میں چھ دن ڈٹ کر کام کرتا ہوں اور اتوار کا دن تفریح کے لیے وقف ہے۔ اس دن شام کو وہ عموماً کلفٹن چلے جاتے اور مشتاق احمد یوسفی اور چند دیگر بے تکلف دوستوں کے ساتھ رات گئے، ساحلِ سمندر پر ہلا گلا کرتے۔ ہاں اگر بھارت سے یا کسی یورپی ملک سے کوئی سکالر یا پرانا بے تکلف دوست ان سے ملنے کے لیے آ جاتا تو وہ اپنے معمولات میں تبدیلی بھی کر لیتے تھے۔ لیکن عموماً وہ اپنے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ اپنے علمی کاموں میں صرف کرتے۔ سوائے مخصوص اوقات کے، وہ ٹیلی فون بھی خود نہیں سنتے تھے بلکہ ان کے دو قریبی عزیز مثلاً ناصر جاوید اور عمران جو انہی کے پاس رہتے تھے، ان میں سے کوئی فون سنتا اور اگر مشفق خواجہ صاحب مخاطب سے بات

WWW.KITAABISTAN.COM

کرنا پسند کرتے تو بات کرتے۔ انھوں نے ان لڑکوں کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ سوائے چند مخصوص احباب کے، باقی فون کرنے والوں کو ساڑھے دس بجے رات کے بعد فون کرنے کے لیے کہیں۔ یوں میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ مشفق خواجہ صاحب کے وقت کا بیشتر حصہ گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ کام کے وقت صرف اپنے کام کو ترجیح دیتے تھے۔ یوں بھی اگر وہ اپنا وقت بے کار قسم کی مجلس آرائی میں برباد کرتے رہتے تو جس نوعیت کا تحقیقی کام کرنے کے عادی تھے اس کو وہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

ڈاکٹر معین صاحب نے اس تعزیت نامے میں ایک اور سخن گسترانہ بات کہی ہے۔ مرحوم مشفق خواجہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ’’وہ واقعی انسان تھے، فرشتہ نہیں تھے۔ انسان، جو بیک وقت کمزوریوں اور خوبیوں کے حامل ہوتا ہے۔ انھیں بہتوں سے شکائتیں تھیں، بہتوں کو ان سے رہتی ہوں گی۔ لیکن سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ کہ وہ اپنے کرم فرماؤں سے ’’دوبدو‘‘ نہیں ہوتے تھے۔ یہ کام ان کے چشم و ابرو ہلائے بغیر، ان کے نیاز مند انجام دے لیتے تھے۔ وہ انھیں روکتے رہ جاتے تھے اور بعض صورتوں میں اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔‘‘

مشفق خواجہ مرحوم واقعی انسان تھے لیکن ایسے انسان کہ بقول خواجہ میر درد:

ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

مجھے گزشتہ ۳۰ برسوں میں بے شمار لوگوں سے مشفق خواجہ کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا اور میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ واحد آدمی ہیں جن کی تعریف میں ہر شخص رطب اللسان تھا۔ میں نے کسی صاحب علم سے ان کی برائی نہیں سنی، سوائے جناب ناصر بغدادی مدیر ’’بادبان‘‘ کراچی کے، جو اپنے رسالے میں ان کے بارے میں زہر اگلتے رہتے تھے۔ صرف انہی کے بارے میں نہیں بلکہ ان کے دوست احباب (مثلاً جمیل الدین عالی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ) کے بارے میں بھی۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ان میں کمزوریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انھیں کسی سے کوئی شکایت تھی نہ کوئی ان کے رویے کا شاکی تھا۔ اپنے ادبی کالموں میں البتہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کر لیا کرتے تھے (مثلاً نظیر صدیقی، راغب مرادآبادی، ساقی فاروقی وغیرہ) لیکن جن پر وہ چوٹ کرتے تھے، وہ بھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مشفق خواجہ کی سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دل آزاری سے کوسوں دور تھے۔ وہ ان کا ذکر بھی کبھی تحقیر آمیز پیرائے میں نہیں کرتے تھے جو لوگ انھیں پسند نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی گروپ اور وزیر آغا گروپ، دونوں کے ساتھ ان کے یکساں دوستانہ مراسم تھے اور وہ بھی ان کی اسی طرح تعریف کرتے تھے۔ کاش ڈاکٹر معین صاحب بہتوں کا نہ سہی، صرف ایک دو آدمیوں کا ہی نام لے دیتے جن سے ان کو اور ان سے جن کو شکائتیں تھیں۔ اسی

WWW.KITAABISTAN.COM

طرح وہ دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانے کے کبھی عادی تھے نہ وہ کسی کو چشم وابرو کا اشارہ کر کے کسی دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا ہشکارا دیتے تھے۔ ان کے اپنے ہاتھ میں قلم تھا۔ وہ بات کہنے کا ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ وہ کسی کام میں کسی کے محتاج نہ تھے بلکہ دوسرے، ان سے مدد کے ہمیشہ طلب گار رہتے تھے۔ وہ جن باتوں کو غلط سمجھتے تھے، ان کا اظہار بذریعہ زبان اور بذریعہ قلم کرنے میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔ معین صاحب کا اشارہ آخر مشفق خواجہ کے کن نیاز مندوں کی طرف ہے، جو ان کا کام (؟) ان کے چشم وابرو ہلائے بغیر انجام دے لیتے تھے؟ کیا ڈاکٹر تحسین فراقی؟ کیا پروفیسر جعفر بلوچ؟ کیا ڈاکٹر عارف ثاقب؟ کیا رفاقت علی شاہد؟ کیا سید قدرت نقوی؟ یا کوئی اور بزرگ شخصیت؟

مشفق خواجہ مرحوم کو اپنے ''کرم فرماؤں'' سے ''دوبدو'' ہونے کی ضرورت تھی نہ ان کی کبھی یہ خواہش رہی کہ ان کے نیاز مند، ان کے چشم وابرو ہلائے بغیر ان کا کام سرنجام دیں۔ بلکہ خود ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب جیسے ''کرم فرما''، مشفق خواجہ صاحب کی چشم التفات کے منتظر رہتے تھے کہ وہ انھیں ان کے مخالفوں کے حملوں سے بچائیں۔ میرے سامنے اس وقت مشفق خواجہ کے نام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کا ۳ مارچ ۲۰۰۱ء کا خط پڑا ہے، جس کی نقل (فوٹو سٹیٹ کاپی) مجھے جناب مشفق خواجہ نے ہی عطا فرمائی۔ یہ خط درج ذیل ہے:

برادر مکرم مشفق خواجہ صاحب! سلام واحترام۔

'ہند تا سند' ☆ جو گرد اڑائی جا رہی ہے، آپ اس سے بے خبر نہیں۔ یہ میرے لیے نا قابل برداشت ہے۔ میں پہلے بھی اس جانب آپ کی توجہ مبذول کرا چکا۔ آپ ہی اسے روکنے پر قادر ہیں۔

میں کمزور آدمی ہوں، مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں گی لیکن سازش یا سیاست میرے خمیر ہی میں نہیں۔

بہر طور میں کسی حجاب یا تذبذب کے بغیر معذرت اور معافی کا طالب اور عفو و درگزر کا امیدوار ہوں۔

طبی وجوہ سے شکر مجھ پر حرام ہے اور جو مہم چلائی جا رہی ہے، وہ میرے لیے شدید فشارِ خون کا باعث ہے جس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ احساس لے کر نہ جاؤں اور یہ تلخ یاد اور یقیناً میرے مختصر سے گھرانے کا اثاثہ نہ بنے کہ آپ ''بچاؤ'' کی صورت پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ آپ کی توجہ اور شفقت سے محروم رہا بلکہ آپ کے اغماض کا شکار ہوا۔

اپنے یہ محسوسات برادر گرامی ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے توسط آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں تا کہ لازماً اور جلد تر آپ تک پہنچ جائیں۔

☆ سند سے مراد سندھ ہے۔

توجہ کا طالب

(دستخط)

معین الرحمٰن

نقل برائے مخلصانہ توجہ بخدمت:

۱۔ خواہر گرامی ادا جعفری صاحبہ، کراچی

۲۔ حسین مجروح صاحب، لاہور

۳۔ رشید حسن خاں صاحب، شاہجہان پور

۴۔ کالی داس گپتا رضا، ممبئی ☆

☆ ممبئی (بھارت) کا پرانا نام ہے۔

شیخ محمد علی

میرے مشفق خواجہ

ان معاشروں کے علمی وتہذیبی اعتبار سے ترقی یافتہ وبالغ نظر ہونے میں کوئی شک ہی نہیں جہاں عالموں کی کثرت ہو اور جو اکتساب وجستجو کے عمل سے خود کو بھی فیضیاب کرتے ہوں اور دوسروں کو بھی۔ ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اول تو ہمارے ہاں حقیقی معنی میں عالموں کا کال ہے اگر تھوڑے بہت ہیں بھی تو مزاجاً انھوں نے اپنے آپ کو عالم ودانش ور سمجھ چھوڑا ہے اور اکتساب وجستجو کے عمل سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے خود کو ان سے دور رکھا ہے جنھیں ان کی اصل ضرورت تھی اور ہے۔

لفظوں کے استعمال اور فصاحت وبلاغت کا دریا بہا کر غالباً مذکورہ بالا لوگ دوسروں پر تو یہ تاثر قائم کر لیتے ہوں کہ وہ کیسے بلند پایہ عالم ودانش ور ہیں لیکن جس فصل کو ان سے سیراب ہو کر سرسبز وبالیدہ ہونا تھا وہ سوکھتی چلی جارہی ہے۔ امام غزالیؒ نے کہیں یہ بیان کیا تھا کہ ہر نئی کتاب، نئی تحریر، نیا خیال اور نیا ادراک مجھ پر اپنے علم کی کمی اور جہل کی فراوانی کو واضح کرتا ہے لیکن ہمارے عالم، دانشور اور محقق امام صاحبؒ کی اس سچائی سے متفق نہیں۔ محض چند ڈگریاں حاصل کر کے، کچھ کتابیں لکھ کر اور کچھ شہرت بٹور کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم ودانش کا پیالہ انھوں نے بھر لیا ہے اور اب وہ ماہ کامل بن چکے ہیں۔

خود فریبی وکج فہمی کے اس رویے نے انھیں عام سے ''خاص'' بنا ڈالا ہے اور اسی خاص ہونے کے یقین نے ان کی طبیعتوں میں اکھڑ پن، تلخی اور کڑواہٹ بھر دی ہے۔ ان کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل، لہجے میں خشکی، بختی ودرشتگی اور جسم میں خاص وضع قطع کا تناؤ ان کے خود پسند ومغرور ہونے کی واضح علامت بن کر رہ گیا ہے۔ یہ نمایاں طور پر اس قدر بلند مقام پر چڑھے بیٹھے ہیں کہ کسی عام کی رسائی ان تک آسان نہیں۔ اس ماورائے بشر مزاج نے انھیں ماورائے بشر مخلوق بھی بنا چھوڑا ہے اور یہ سب کچھ بدقسمتی سے علم وشہرت کے نام پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔

جہاں علم کی کاری گری اور شہرت کا مزاج یہ ہو وہاں قحط الرجال کا جنم لینا عین فطری ہے۔ مجھے ہمیشہ حیرت رہی ہے کہ قحط الرجال کے اس بدترین دور میں مشفق خواجہ مرحوم جیسے لوگ بھی اپنا وجود رکھتے تھے اور سراپا امام غزالیؒ کے اسی قول کا احاطہ کرتے تھے جسے میں نے اپنے لفظوں میں اوپر نقل کیا ہے۔ اگر وہ واقعی علم وشہرت کے موجودہ سحر کا شکار ہوتے تو ان کی ذات بھی اسی خود پسندی، بڑائی، نخوت، انا اور رعونت کا پرتو ہوتی جس کا

آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان کی ذات میں تو حافظ و سعدی اور رومی دکھائی دیتے تھے۔ عجز و انکسار، شفقت محبت اور اخلاق و مروت تو جیسے ان پر ختم تھی۔

خواجہ صاحب مرحوم نے اپنے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی تکمیل کے لیے بلاشبہ گوشہ نشینی اختیار کی ہوئی تھی لیکن وہ مردم بیزار، قنوطی اور تنہائی پسند قطعاً نہ تھے۔ ان کی ذات سے تعلق و محبت کی ایک ایسی خوشبو پھوٹتی تھی کہ ہر کس سحر زدہ ان کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ وہ جو قلم کے کھلاڑی تھے اور جو محض ادب کے قاری و دل دادہ تھے وہ بھی۔ اردو زبان سے آگہی رکھنے والا ہر شخص بالعموم اور تنقید و ادب سے وابستہ ہر فرد بالخصوص ان کا نام جس محبت و سرشاری سے لیتا تھا اس کا مشاہدہ کسی دوسری ذات کے حوالے سے میں نے نہیں کیا۔ یاد رکھیے محبت کروائی نہیں جاتی ہو جاتی ہے اور جن سے یہ ہوتی ہے ان کی صفات، ان کے رویے اور ان کا مزاج کسی کے اندر اس کی جوت جگاتا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے خواجہ صاحب مرحوم سے محبت کی ہے اور آج تک کر رہے ہیں انھیں ان کی اعلیٰ ظرفی، منکسر المزاجی، عجز و انکسار اور کسی کے لیے کچھ کر گزرنے کے وصف کے باعث محبت تھی یہی وہ وصف ہے جو آج ناپید ہے بالخصوص اس طبقہ میں جسے ہم اہل علم و دانش کہہ رہے ہیں۔

خواجہ صاحب مرحوم کس پائے کے محقق، دانشور، ادیب، شاعر اور نقاد تھے اس پر میرے لیے کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ بہرحال یہ بات اصولی طور پر طے ہے کہ جس میدان کے وہ آدمی تھے اس میدان میں ان جیسی صفات اور قابلیت رکھنے والا شخص دور دور کوئی نہیں۔ ان کے ہاں سجنے والی محفلوں میں جا کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ حقیقی بڑائی اور بلندی کے معیار کیا ہیں اور اخلاق و رواداری اور شفقت و محبت کیا۔ ان کے لیے ہر عام آدمی خاص ہوا کرتا تھا اور اسے وہ یوں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے جیسے وہ کوئی خاص اور اہم شخص ہو۔ خود میری مثال لے لیجیے شہرت و مقبولیت اور علم و فکر کے حوالے سے میں کسی ایسے درجے اور منصب پر فائز نہیں جس سے ملنے کی کوئی تمنا کر سکے اور مل کر اپنی عزت و بڑائی اور تفاخر کے احساس کو جگا سکے لیکن ہمیشہ انھوں نے مجھ جیسے گمنام، غیر معروف اور علمی و فکری اعتبار سے صفر شخص پر اپنی محبتوں اور شفقتوں کی بارش برسائی۔ یہی ان کی بڑائی اور معرفت کی نشانی ہے۔

میرے اور خواجہ صاحب کے درمیان محبتوں اور شفقتوں کے رشتے جوڑنے میں میری تحقیقی و باحجم تصنیف ''نظریات و افکارِ اقبال'' نے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ورنہ اس سے قبل میرا وجود مرحوم کے لیے خارج کی حیثیت رکھتا تھا۔ بھلا کہاں مجھ جیسا گمنام و غیر معروف لکھنے والا اور کہاں خواجہ صاحب جیسا دیو قامت و ہیرا صفت انسان۔ کئی سال قبل نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب کو صدارتی

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ایوارڈ کے لیے داخل دفتر کیا گیا اور جن ماہرین کے سامنے سفارش و رائے کی خاطر پیش کیا گیا ان میں مرحوم سرفہرست تھے۔ بقول ان کے انھوں نے دوسری کتابوں کے مقابلے میں اس کے لیے ایوارڈ کی سفارش کی اور اس پر اپنی مضبوط و پختہ رائے بھی متعلقہ کمیٹی کو ارسال کر دی۔ ایوارڈ کا نتیجہ تو وہ نہ تھا جو مرحوم چاہتے تھے۔ مگر سرکاری اعلان کے کچھ عرصے بعد پہلی دفعہ انھوں نے مجھے فون کیا اور نہایت شستہ و خوبصورت آواز کے ساتھ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔

بلاشبہ وہ پہلا فون اور ان کی وہ آواز میں کبھی فراموش نہ کر پاؤں گا۔ وہ شخص جسے زبان و کلام کے تناظر میں دنیا ایک بڑے ادیب، دانشور، محقق، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے جانتی تھی وہ مجھ سے ہم کلام تھا اور نیازمند بھی۔ خواجہ صاحب سے میرا تعلق کیا تھا؟ انھوں نے میری کتاب پر ایوارڈ دینے کی سفارش کیوں کی تھی؟ وہ مجھے خود فون کیوں کر رہے تھے ذرا ان سب باتوں کا تجزیہ فرمایئے اور پھر اندازہ کیجیے کہ حقیقی اہل علم و دانش کون ہوتے ہیں اور قحط الرجال کے اس دور میں ان کا مقام و منصب کیا ہوتا ہے۔ میرے لیے تو یہی سب سے بڑا اعزاز تھا کہ مجھے نہ جانتے ہوئے بھی انھوں نے اس کتاب پر اپنی مثبت و اعلیٰ رائے دی اور اس سیاق و سباق میں مجھ جیسے گمنام کو فون کر ڈالا۔

علم و دانش کے کسی پیکر کا یہ روپ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات پہلی دفعہ مجھ پر منکشف ہوئی تھی۔ مجھے تو اہل علم کے رویوں اور ان کی نخوتوں نے ''عالم بیزار'' بنا چھوڑا تھا۔ اب اندازہ یہ ہوا کہ واقعی ذی علم لوگ کون ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں۔ عمر میں ان سے میں بہت چھوٹا تھا اور وہ مجھے اس کتاب کے تناظر میں کوئی عمر رسیدہ شخص سمجھے بیٹھے تھے لیکن باوجود اس کے ان کا رویہ، ان کا مزاج اور طبیعت انتہا درجے کی مشفقانہ رہی۔ وہ میری کتاب پر رطب اللسان رہے، میری محنت و کوشش کو سراہتے رہے اور اس کی نت نئی جہتوں پر سے پردے اٹھاتے رہے۔

کوئی اور اگر کتاب کے موضوع اور اس کے حجم کو دیکھ کر بلا بھی بیٹھتا تو عمر کا اندازہ کر کے سخت و خشک اور کھردرا ہو رہتا کیونکہ مجھے ایسا تجربہ بھی رہا ہے لیکن وہ نام کے ہی مشفق نہ رہے مجسم مشفق بنے رہے، یہی ان کی عظمت و بڑائی تھی۔ اس نشست میں انھوں نے ان ذمہ داریوں کا انکشاف بھی کیا جو جاہ و دنیا پرستی کے باعث اس کتاب پر ایوارڈ کی راہ میں آڑے آئیں اور ایک نامور ہستی کے حق میں اپنی رائے کا استعمال کر بیٹھے۔

خواجہ صاحب مرحوم کا یہ قرب، یہ لطف و کرم، یہ محبت اور یہ شفقت میرے لیے ہر ایوارڈ سے بڑھ کر تھی۔ مجھے اس وقت کسی صدارتی ایوارڈ کی تمنا تھی نہ اس دل پذیر ملاقات کے بعد کوئی تمنا رہی۔ ذرا تصور فرمایئے مشفق خواجہ جیسی دیو قامت شخصیت کسی تحقیق یا تخلیق کو یوں عزت بخش دے تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی اعزاز ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں! میں ساری زندگی لفظوں کی اس مٹھاس اور چاشنی کو محسوس کرتا رہوں گا جو وقت کے ایک حقیقی عالم، دانشور اور محقق نے میری محنت، تخلیق اور تحقیق پر ادا کیے ہیں۔ یہی سب کچھ میرا سرمایہ اور میری دولت رہے گا، اس کے سوا کچھ نہیں۔ ذرا غور فرمایئے ایک گمنام، غیر معروف اور گوشہ نشین جیسے لکھنے والے کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز اور کیا ہو سکتا تھا اور ہو سکتا ہے۔

یہ ملاقات پہلی اور آخری نہ رہی بلکہ اس کے بعد خود خواجہ صاحب نے وہ عزت و حوصلہ عطا فرمایا کہ ملاقاتوں کے در کھلتے چلے گئے۔ پندرہ بیس سال بیرون ملک آمد و رفت رہی لیکن اس آمد و رفت میں بھی ان کی شفقتوں سے محروم نہ رہا۔ کبھی میں فون کرتا تو ''فرمایئے'' جیسا سحر انگیز لفظ میرے وجود کو جکڑ لیا کرتا اور کبھی ان کا فون ملاقات کی سبیل پیدا کر دیا کرتا۔

ہمیشہ ایک بڑے بھائی کی طرح میرے مسائل سے آگہی کی کوشش کرتے رہے۔ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور لفظوں سے اندر کی کیفیات کا ادراک کرتے رہے اور نہایت مربیانہ و مشفقانہ انداز میں رہنمائی و معاونت فرماتے رہے۔ حیران ہوتا ہوں کہ اس دنیا میں جہاں لوگ حقدار سے حق چھن کر اپنوں اور اپنے چاہنے والوں کے حوالے کرتے ہیں وہاں خواجہ صاحب جیسے لوگ بھی بسا کرتے تھے جو ڈھونڈ ڈھونڈ کر حق دار کا حق اس تک پہنچایا کرتے ہوں۔ یہ بات کم لکھے کو زیادہ سمجھنے والی ہے اور اپنے تناظر میں اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کے سیاق و سباق میں دیکھی جانے والی ہے۔

پبلک ریلیشنگ (Public Relationing) جسے عرف عام میں پی آر کہا جاتا ہے کہ اس دور میں جہاں لوگ ۱۱۰ گرام کاغذ پر بمشکل تمام دس گرام وزنی کوئی بات لکھ پاتے ہیں اور اسی پر شہرت، عزت اور تمغے حاصل کرتے ہیں، وہاں اصل کو تلاش کر کے آنکھوں پر بٹھانا صرف خواجہ صاحب مرحوم کا ہی کام تھا۔ حق کہنا، حق لکھنا اور حق دار کو حق دلانے کے لیے کچھ کر گزرنا شاید اب یہ کام کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

جب بھی میں اپنی کوئی کتاب ان کی خدمت میں پیش کرتا تو فوراً کھول کر پہلے اس پر دستخط ثبت کرا لیتے۔ شرمندگی و ندامت سے انکار بھی کرتا اور یہ احساس دلانے کی کوشش بھی کہ بہت کم علم و بے حیثیت ہوں نہ مانتے، عزت افزائی اور پذیرائی کے بول بول کر دستخط کروا ہی چھوڑتے۔ آج سوچتا ہوں گمنامی اور اندھیرے میں پڑے ہوئے مجھ جیسے شخص کے لیے جسے لکھنے پڑھنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا ان کی ذات کس قدر اہم تھی۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

بات لکھنے پڑھنے کی، تحریر و تحقیق کی یا پھر کسی مشکل، پریشانی اور اذیت کی اس کا ہر پہلو خواجہ صاحب کو کچھ کر گزرنے پر مائل کیا کرتا تھا۔ میرے ہر مسئلے، ہر پریشانی اور ہر مشکل کو انھوں نے بھانپا، بات کو اندر سے نکلوا کر اس کے درست اور بہتر حل کی طرف رہنمائی کی اور میرے حوصلے کو اپنی شفقتوں اور محبتوں سے کمک پہنچاتے رہے۔ کرنل محمد خاں مرحوم کی کتاب ''بجنگ آمد'' کے حقوق اشاعت دس سال کے لیے جب میرے ادارے نے حاصل کیے تو پنجاب میں اس کے پرانے پبلشر کو جیسے جلال آ گیا اور اس نے دھڑلے و ہٹ دھرمی کے ساتھ دبا کر اس کی پائریسی شروع کر دی اور وہ کتاب جو مارکیٹ سے تقریباً ناپید تھی دیکھتے ہی دیکھتے ہر جانب دکھائی دینے لگی۔ قانونی موشگافیوں نے جنم لیا، مختلف پیچیدگیاں اور مسائل نمودار ہوئے، مقدمات کی تیاریاں زور پکڑ گئیں اور کرنل صاحب (اللہ مغفرت فرمائے) از خود مختلف دباؤ میں عضو معطل بن بیٹھے۔

ان کے عضو معطل بن جانے سے بعض غیر متعلق افراد کو بھی تقویت ملی اور وہ بھی پھڈے میں ٹانگ اڑانے لگے۔ ''بجنگ آمد'' کی اس جنگ نے جو ناشر و مصنف کے درمیان قلمی تھی یا بہت سے بہت قانونی اس وقت ایک نیا رخ اختیار کر لیا جب اس میں کراچی کے ایک عالم دین بھی آ کودے اور سخت لب و لہجہ کے ساتھ کچھ کر گزرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ مارکیٹ میں کمیابی کے باعث اس کتاب کی بڑی تعداد میں اشاعت اور پھر مارکیٹنگ سے پہلے ہی اس کی بڑے پیمانے پر پائریسی اور بعدہ ہویدا ہونے والے ان بدترین حالات نے مجھ پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہ کیے۔ ایسے دل گرفتہ، مایوس کن اور نازک وقت میں، اللہ مغفرت فرمائے، خواجہ صاحب ہی نے آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالا اور کچھ اہم فیصلے کر کے مجھے ایک مستقل جنجال سے بچالیا۔

زندگی کے ذاتی مسائل ہوں یا اشاعتی دھندے کی پریشانیاں ہر مرحلے پر مجھے ان کی مشفقانہ و برادرانہ مشاورت و معاونت میسر رہی ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے، علمی اعتبار سے بھی اور دیگر حوالوں سے بھی۔ مشہور بھی تھے اور بہت مصروف بھی لیکن انھوں نے کبھی کوئی ایسا تاثر مجھ پر نہیں چھوڑا کہ میرا وجود، میرے فون اور میری ملاقاتیں انھیں ناگوار گزر رہی ہوں۔ وہ جب بھی ملے نہایت محبت سے اور نہایت شفقت سے۔ سوچتا ہوں اگر یہ خصوصیات علم کے ساتھ مختص ہیں تو دوسرے صاحبان علم و دانش کیوں اس سے محروم ہیں اور کیوں عامۃ الناس کو اپنے سے جدا اور الگ رکھے ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب اپنی ذاتی حیثیت اور استعداد میں جس کے ساتھ جو کچھ ممکن ہوتا کر گزرتے تھے۔ لگتا ہے کہ خدا نے بعض گھرانوں اور افراد کے لیے انھیں فرشتہ بنا چھوڑا تھا۔ سوچتا ہوں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو جن گھرانوں کا ذکر میں کر رہا ہوں یہ دنیا ان کے لیے قیامت سے کم نہ ہوتی۔ آج مجھے ان گھرانوں کی عزت نفس

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کا پاس ہے ورنہ میں ضرور عرض کرتا کہ اہل علم و دانش کے علمی کارنامے کتابوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اور کیا کچھ کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ حق مغفرت کرے اپنی ذات میں وہ کیا تھے اس حقیقت کو آشکارہ کرنا کم از کم میرے قلم کے بس کی بات نہیں۔

خواجہ صاحب جس بلند مقام پر فائز تھے اور تحقیق و ادب کے حوالے سے جو کچھ بھی کارہائے نمایاں ان کی ذات سے وابستہ ہیں، اس پر قلم اٹھانا میری طاقت اور استعداد سے بڑھ کر ہے۔ وقت کا دھارا ان کی تحقیقات اور کارناموں کی حقیقت کھولتا رہے گا اور زمانہ بالخصوص اردو زبان سیراب ہوتی رہے گی۔ سچ صرف یہ ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں علمی کشف، درک اور تخلیق کے ذریعے اگر کسی ذات نے اس عہد، دور اور وقت کو کچھ دیا ہے تو وہ یقیناً مشفق خواجہ مرحوم کی ذات تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کی رحلت سے خلا پیدا ہو گیا ہے جو شاید کبھی پر نہ ہو سکے، یقیناً مرنے والا اپنے پیچھے کسی نہ کسی کے لیے خلا چھوڑتا ہی ہو گا، انفرادی حیثیت میں کسی کی موت کسی کے لیے قیامت ہونے والے خلا سے کم نہ ہوتی ہو گی لیکن نہ پر ہونے والے خلا سے متعلق جو جملے عموماً اجتماعیت کے تناظر میں استعمال ہوتے ہیں وہ سوائے لفظوں کی ہیرا پھیری کے کچھ نہیں۔ ہاں جن عالموں کی موت کو عالم کی موت کہا جاتا ہے بلاشبہ خواجہ صاحب کی موت عالم اردو کے لیے ایسی ہی ہے۔ ان کے مرنے سے اس عالم میں جو خلا پیدا ہوا ہے یا قیامت برپا ہوئی ہے شاید صدیاں اس سے متاثر ہوتی رہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے بعد شاید ان جیسے کم ہی پیدا ہوں اور بڑھتے ہوئے قحط الرجال کا عذاب یہ قوم بھگتتی رہے گی۔

یہ قحط الرجال ہی تو ہے کہ اتنا بڑا شخص درمیان سے اٹھ گیا محض مختصر سی خبروں کے سوا کہیں کوئی نمایاں خبر دکھائی نہ دی۔ انتہا یہ کہ سرکاری ٹیلی ویژن سمیت کسی چینل کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنی خبروں میں اس اہم سانحہ کی خبر لگا دیتے اور کوئی تعزیتی پروگرام پیش کر دیتے۔ گلیمر اور شوبز کی دیوانی اس دنیا میں سرکاری ٹی وی سے لے کر پرائیویٹ چینلوں تک کیا کچھ خرافات پیش نہیں کی جا رہی ہیں۔ یہ سب کے سامنے ہے۔ ناچ، گانے پر مبنی فواحشات پروگرام، لغو و بے معنی مباحثے گھنٹوں چلتے رہتے ہیں۔ ہر قسم کے ملکی و غیر ملکی گویوں، میراثیوں، اداکاروں اور اداکاراؤں کی خبریں تزک کے ساتھ لگائی جاتی ہیں۔ وزراء سفراء کی مصروفیات پر لایعنی گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ شوبز کے کسی فرد کو چھینک بھی آ جائے تو مسلسل خبریں چلتی رہتی ہیں۔ پاکستانی اداکارائیں بھارت میں کیا گل کھلا رہی ہیں، اس پر نیوز ریلیں لگتی ہیں لیکن جن کے دم سے دنیا کا حقیقی رنگ آباد ہے، جو تہذیب و شائستگی اور علم کے جلوے سے معاشرتوں کی تطہیر اور تعمیر و ترقی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، وہ جہاں سے گزر بھی جاتے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ہیں تو یہ ادارے چونک کر نہیں دیتے۔ یہ ادارے اور ان کے کرتا دھرتا سب حق ناشناس اور احسان فروش ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کس کا حق کیا ہے اور قرض کیا ہے اور یہی اس ملک کا المیہ ہے۔

یہ دنیا تو یقیناً فانی ہے۔ وہ کون ہے جو آیا ہے جائے گا نہیں۔ انبیاء و رسل بھی اپنا اپنا کام کر کے اس دار فانی سے رخصت ہوئے ہیں۔ بس یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ مر کے بھی مرتے نہیں ہیں میرے مشفق خواجہؒ ان ہی لوگوں میں سے ایک ہیں جو ہمیشہ اپنے کام اور اپنے کردار کے حوالے سے زندہ رہیں گے، ہمیشہ ہمیش ان شاءاللہ۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے، آمین۔

WWW.KITAABISTAN.COM

ڈاکٹر آغا سہیل

خواجہ اور خامہ

مشفق خواجہ سے مجھے قرابت قریبہ تو کجا واجبی سی رسم و راہ بھی نہیں تھی بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں تھا۔ طرفین میں سے کسی جانب سے تبادلۂ خیالات کی کبھی خواہش پیدا ہوئی نہ تشویش۔ غالباً اس کی وجہ مزاجوں کے مابین بُعد مشرقین حائل تھا۔ ہر بڑے ادیب اور انشاء پرداز سے یک طرفہ تعلق (قاری کی حیثیت سے) ضرور قائم تھا اور چونکہ میری سہل انگاری اور آرام طلبی محققین اور مدققین (کا بس احترام ملحوظ رکھتی ہے) للہٰذا کبھی کسی موضوع پر گفتگو کرنے، تبادلہ خیالات یا مکالمہ کا شوق بھی پیدا نہیں ہوا۔ اجتناب کی ایک وجہ وہ احترام بھی تھا جو مرحوم سے بابائے اردو کی نسبت سے ملحوظ تھا۔ تاہم ان کے مبلغ علم میں تعمیر فکر کی جہد مسلسل میں جو توانائی تھی وہ سچے دانش جُو کا احساس پیدا کرتی تھی۔

ایک ہمارا مشترکہ آنجہانی دوست کرن موہن تلخ جب بھی (دہلی یا لکھنؤ) میں ملتا تو مرحوم کا ذکر خیر ضرور کرتا۔ دراصل ہمارے مرحوم استاد پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ایک زمانے میں خوش معرکۂ زیبا پر کام مجھ سے لینے کے لیے سعی بلیغ فرمائی۔ انھیں خاکسار کے بارے میں یہ حسنِ ظن تھا کہ تحقیق و تدقیق کی تشویق دلانے سے میں اس تذکرے پر کام کرلوں گا لیکن میں نے مرحوم کو بھی مایوس کیا اور تحقیق و تدقیق کو بھاری پتھر سمجھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد شمیم انہونوی (ابن نعیم انہونوی)، جو غالباً اب مرحوم ہاشمی صاحب کے خویش ہیں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا پر کام کرنے پر آمادہ ہوگئے (غالباً اسی موضوع پر موصوف نے ڈاکٹریٹ بھی کرلی)۔ تاہم میرے علم میں خواجہ (مشفق) صاحب کا مزاج اور مذاق تشعلیق، مذاقِ تفکر و تعقل آیا تو مجھے یک گونہ تسلی اور طمانیت حاصل ہوئی کہ اب یہ بیل صحیح معنی میں منڈھے چڑھے گی۔ ظاہر ہے اس کی ایک وجہ تو بابائے اردو سے مرحوم کی دیرینہ قرابت، تعلق اور تربیت و تہذیب تھی۔ دوسرے موصوف کا جوہر ذاتی کماحقہ اس کام کے لیے موزوں تھا نیز یہ کہ مبلغ علم میں جو قوت نو مسلسل ارتقا پذیر تھی وہ اس کی ضمانت فراہم کرتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تحقیق و تدقیق میں (فی زمانہ) تنقید اور تخلیق کے مذاق سلیم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے کلاسیکی اور آفاقی لغات (معرب، مفرس، مہند) پر مکمل دسترس حاصل ہو (جواب نادر ہے)۔ خواجہ مرحوم محض متبع اور پیروکار نہیں تھے کہ مولوی صاحب کے مذاق کی حرف بہ حرف پیروی کر کے وہ چار نمونے کے مقالات لکھ کر معاملہ صاف کر دیتے یا تدوین میں چند نسخوں کی ترتیب و تہذیب کر کے مقدمہ لکھ کر اور حواشی رقم

کر کے سمجھ لیتے کہ ان کی تکلیف شرعی ختم ہو گئی یا بہت سے بہت مخلی بالطبع ہو کر (جیسے مولوی صاحب اکثر احباب سے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اردو زبان سے تاہل اختیار کر لیا ہے اور خاموش ہو جاتے۔)

مرحوم خواجہ نے ایک طرف تو تحقیق و تدقیق کی ثقاہت کے پیڈسٹل سے نیچے اتر کر مروجہ اردو صحافت (کی بدمذاقی) سے سمجھوتہ کیا نہ اس کی زبان و بیان سے اور نہ تکلف تعمیم (یعنی عامیانہ پن) بلکہ تخصیص میں جو مزمن ہونا چاہیے اسے باقی رکھا تاہم خواجہ کا خامہ (تابہ کے) بگوش معتکف رہتا کہ شعر و ادب کی تخلیق کے نام پر صحافت کی رکاکت روز بروز نت نئے گل کھلا رہی تھی۔ ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں، مخلی بالطبع ہونے کے بالآخر خامہ بگوش کب تک تاب سخن رکھتا، قرطاس پر بسم اللہ کہہ کر رواں ہوا۔ ماضی و حال کے تمام محاسبے اور محاکمہ کرنے پر کمربستہ ہو گیا۔ خواجہ کو اس سے ضرور طمانیت میسر آئی ہو گی لیکن وطن عزیز کے بے لگام اور خودسر (شپرہ چشم اور خودنگر مبتدی صحافیوں) کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس کی شدید ضرورت بھی تھی۔ صحافت (زرد) ہی صرف معاشرے کے منظم، منضبط معاشرے کے قوام نہیں بگاڑ رہی تھی بلکہ نام نہاد جرنلزم (جو بے سمت اور خودسر ہے اور جس سنوبری میں مبتلا ہے) معاشرے کی خیر خواہ ہے نہ ملک عزیز کی۔ اسے ادب قرار دینا بجائے خود بددیانتی اور بدعت ہے۔ خامہ بگوش اس بدعت کو ادبی تخلیق قرار نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اس کا قلم حرکت میں رہتا اور لوگ منغض یا چراغ پا ہوتے تھے تو ہوا کرتے جس کو علم و ادب کی حرمت کا اور صحت کا خیال ہو گا وہ ہرگز اسے برداشت نہیں کرے گا۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے کہ ہوا اور خلاء میں خیالی گھوڑے دوڑائے جاتے رہتے ہیں اور اس یاوہ گوئی (جذبے، خیال اور وجدان کے رومان) کو ادب اور تخلیق ادب قرار دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کس رخ اور کس سمت سے اسے ادب کہا جائے کہ آئی ٹی (انفارمیشن ٹیکنالوجی) کے ترقی یافتہ دور میں ادب تو بڑی چیز ہے یہ صحافت کی تعریف پر بھی صورت حال پوری نہیں اترتی۔ جب سے صحافت (بالخصوص برصغیر کی صحافت) میں صنعت کار دخیل ہوا ہے زبان کا، صحافت کا، اردو کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ صحافت صحافت رہی اور نہ ادب ادب رہا کہ ادب کی کوئی بھی صنف ہو جب تک اس میں تخلیق کی آنچ نہ ہو اور فکر و عقل کی قوت نمو نہ ہو اس کی شناخت ممکن نہیں ہوتی۔ خواجہ اس صورت حال کا صحیح تجزیہ (معروضی طور پر) کرتے رہے ہیں۔ شعر و ادب کی تخلیق کو صحافت کا سیاسی کینسر متاثر کرتا رہا اور خواجہ کو روحانی اور قلبی تکلیف پہنچتی رہی۔ جب تک معاشرے کے جملہ اقدار کے منہاج کا صحیح تعین نہ ہو سکے اور یہ پتا نہ چلے کہ یہ صحافت قوم کو کس طرف لے جا رہی ہے اور اگر ادب کے نام پر بدعت روا رکھی جا رہی ہے تو یہ ادب کدھر جا رہا ہے (خلاء میں تخلیق ہوئی ہے تو ادب برائے زندگی کی تعریف

میں نہیں آتا)۔ اس عمل کو بعض برخود غلط عناصر ترقی پسندی سے معنون کرتے ہیں جو غلط ہے کہ ترقی پسندی کا نظریہ اور فلسفہ مادی جدلیت کے ارتقاء سے عبارت ہوتا ہے اور آج کا صحافی (اور صنعت کار) دونوں سرمایہ دارانہ نظام میں گروہی اور طبقاتی مفادات کے تحفظ سے اپنے مفادات کے تحفظ کو وابستہ کیے ہوئے ہیں (جو ادب اور صحافت دونوں کے لیے اور وطن عزیز کے معاشرے کے لیے بھی مہلک ہے)۔ برصغیر کے کسی دور میں یہ صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی لہٰذا ایک طرف زبان اور ادب کے خسارے کا خیال تو دوسری طرف معاشرے کی اخلاقی اقدار کا زیاں، اس صورت حال سے خواجہ اور خامہ دونوں مشوش رہتے تھے تو خامہ حرکت میں آتا۔ ظاہر ہے کہ مخلّی بالطبع ہونے میں فکاہات کی جو صورت سامنے آتی وہ ملک کے ہر طبقے کو پسند نہیں آتی تھی (بالخصوص جس کا مقصد درپردہ اصلاح ہوتا ہے اور وہ کڑوا ہوتا ہے۔ قاری کو پسند خاطر نہیں ہوتا تھا)۔

انگریزی زبان کی صحافت بھی ہمارے معاشرے میں مریضانہ ہے کہ بیشتر صحافی انگریزی زبان (ادب سے بالکل واقف نہیں) سے بھی واقف ہوتے ہوئے، اپنے خیالات اور نظریات کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنی مادری، علاقائی زبان میں سوچ کر انگریزی میں (غلط) ترجمہ کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چونکہ برصغیر کے عموماً اور پاکستان میں خصوصاً تمام جمہوری ادارے غیر جمہوری منہاج پر استوار ہیں لہٰذا قومی زبان (بشمول عدلیہ مقننہ اور انتظامیہ) کوئی صحت مند تشخص نہیں رکھتی لہٰذا قومی زبان کی جگہ انگریزی کا مصنوعی رعب و دبدبہ (کوڑے کی جگہ استعمال ہو رہا ہے) کہ عوام الناس کو رعایا اور حکمرانوں کو ظل اللہ اور ان کے احکام کو صحائف آسمانی تعبیر کیا جا رہا ہے۔ بابائے اردو اور خواجہ کا خامہ اس صورت حال پر ہمیشہ ملول اور متفکر رہے جو بہرحال قومی شعار ہے۔ بابائے اردو جس طرح کی اردو زبان اور ادب کے لیے ہر طرح کی عصبیتوں اور تنگ دلی سے پاک اور مبرا اپنے قلب میں سمندر کی سی گہرائی اور اطراف و اکناف عالم کی سی وسعت و پہنائی اور کشادگی رکھتے تھے، وہی خواجہ کو ورثے میں ملی تھی۔ اگر کوئی اردو زبان میں اردو کو گالیوں اور دشنام طرازیوں کا ہدف بناتا تو بھی اردو کے بہی خواہ اسے خوش آمدید کہتے اور خوش ہوتے کہ دیکھو زبان کی وسعت اور پہنائی یہاں تک پہنچی تو ہے۔ لیکن اردو زبان کے سکہ بند شعراء ادیب اگر انگریزی زبان کو (اردو کی موجودگی میں) ترسیل خیال اور ابلاغ خیال کا ذریعہ بناتے تو ہر محسن زبان کی طرح خواجہ کو بھی تکلیف ہوتی اور یوں لگتا کہ اردو زبان کا یہ مستند ادیب اور شاعر جھوٹ بول رہا ہے اور خود کو جھٹلا رہا ہے۔

انگریزی کی بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے افادیت سے انکار نہیں ہے بلکہ کل ۲۶ حروف پر مشتمل زبان جس کا کل مال مانگے تانگے کے لغات کے منت پذیر ہے اور جس اردو کے مقابلے میں تہی مایہ

ہے وہ اگر بین الاقوامی زبان بنی بیٹھی ہے تو یہ بھی اردو والوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ لسانی نقطہ نظر سے اردو زبان پرمایہ ہے صرف استعمار پسندوں نے ساری دنیا کے لغات اپنی زبان میں لے لیے ہیں جن کو ذرا کھرچو تو ان کی اصل آشکار ہو جاتی ہے۔ اردو ایک تخیلی زبان ہے اور اس میں جذب وانجذاب کی کیفیت بوجوہ انگریزی کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن پاکستانی بیوروکریسی کی سہل انگاری نے بوجوہ اس کی افادیت سے انکار کر دیا ہے۔ اس صورتحال کا خواجہ کو بخوبی ادراک تھا۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض سیاسی حلقوں نے بھی اردو زبان کو متنازعہ قرار دیا تھا اور اردو کی طرف دار ایک مذہبی گروہ سے اختلاف کی وجہ سے اردو کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے میں اردو خواہ مخواہ مطعون ہو گئی تھی جس کا خواجہ کو احساس تھا مگر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ خواجہ کو اسی گروپ میں لے لیا گیا اور انھیں رجعت پسند قرار دیا جانے لگا تھا۔ یہ بجائے خود افترا تھا۔ اگر بفرض محال خواجہ کی ہمدردیاں کسی مذہبی گروہ سے تھیں تو اس کا اردو زبان سے محبت اور نفرت سے کیا تعلق تھا۔ لسانی صوبائی سیاست کو تنگ نظر نہیں ہونا چاہیے اور قومی ترقی سے گروہی اور محدود مفادات کو الگ رکھنا چاہیے۔

ابھی حال ہی میں روس کی ڈاکٹر لڈمیلا وسیلوا نے لاہور اور کراچی دونوں مقامات پر فیض احمد فیض کے حوالے سے یہ انکشاف کیا کہ سوویت یونین کے سقوط کا فیض صاحب نے بہت پہلے سے خدشہ ظاہر کر دیا تھا (ظاہر ہے فیض صاحب کوئی ولی اللہ تو تھے نہیں صرف مادی جدلیاتی تناظر میں معروضی تجزیہ نگار تھے اور تاریخ کے مادی جدلیاتی تناظر میں معروضی تجزیہ کر کے جس نتیجے پر پہنچے تھے اس کا اظہار کر رہے تھے)۔ اگر خواجہ اپنی خامے کو مہمیز کر کے اس موضوع پر لگاتے تو ان کا استنباط بھی یہی ہوتا اس لیے ایک محبِّ وطن کو اس تناظر میں بھی غور کرنا چاہیے کہ سقوط سوویت یونین کے موقع پر کسی ایک فرد واحد کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی جبکہ سقوط ڈھاکہ کا المیہ جب رونما ہوا تو برصغیر میں کہرام مچ گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالمی تناظر میں معیشت کے سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام میں سے عوام الناس کے مفاد میں کون سا نظام بہتر اور افضل ہے اور جس نظام میں جمہوری اقدار کے تحفظ کی ضمانت موجود ہے وہ کیا ہے۔ اگر خواجہ اور خامہ دونوں اس موضوع پر حرکت میں آتے تو قول فیصل کس کے حق میں صادر ہوتا۔

مولانا حسرت موہانی جیسا متقی، پرہیزگار اور راسخ العقیدہ (سنت والجماعت باعمل مسلمان) جب علی الاعلان خود کو کمیونسٹ کہتا تھا تو اسے مرتد اور بے دین کہنے والا کوئی فتویٰ باز اور فتویٰ ساز اولی الامر کہاں تھا؟ مولانا عبدالماجد دریابادی نے صدق جدید میں میرزا یاس یگانہ چنگیزی کی مسلمہ شاعرانہ حیثیت کو خاطر میں لائے بغیر (کہ وہ بہت مشکک ثابت ہوتا تھا منکر نہیں تھا) اہل لکھنؤ کے ایک گروہ نے اس کا حشر ونشر کیا اور

اسی یاس یگانہ چنگیزی کے دیوان کے کلام بلاغت نظام کی تدوین وتہذیب کر کے خواجہ نے جو اہل علم کے سامنے پیش کیا تو اسے کس مقام پر رکھا جائے گا؟ اہل علم کے وہ ثقہ اور متدین معاصرین یگانہ سے اس وقت بھی یگانہ روزگار اور شعراء میں فرد فرید مانتے تھے اور منقولات کے علی الرغم معقولات کی رو سے تعمیر فکر اور تامل و تعقل کا معقولات سے مملو مفکر شاعر تھا جو غالب شکن اور خرافات عزیز کے باوصف ایک اپنا ایک نظریۂ فن رکھتا تھا اور استقامت سے اس پر ڈٹا رہا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ اور خواجہ کا خامہ اس بدعتی کے حق میں زیادہ تھا یا اردو زبان وادب کے ایک مسلم الثبوت استاد کے حق میں تھا اور اس سے خود خواجہ کے اعتقادات اور نظریات کی صحت میں کیا فرق پیدا ہوا۔

میرے عرض کرنے کا مؤقف یہ ہے کہ خواجہ اور خواجہ کا خامہ علمائے سوء سے کبھی خائف نہیں ہوا۔ علمائے حق کہ (وہ معقولات کے معروضے تدبر و تفکر اور دانش جوئی سے لیس ہوتی ہیں) ہمیشہ خواجہ کے حاشیہ خیال میں موجود رہے۔ جب لکھنؤ میں یگانہ پر یہ افتاد پڑی (لکھنؤ پر کیا ٹیکہ ہے جذباتی اور خود سر جہلا کا یہ گروہ کسی مقام پر بھی اشتعال میں آ سکتا ہے) تو چند مدبرین اور مفکرین یگانہ کی تلافی قلب کے لیے، کچھ پوشیدہ اور کچھ اعلانیہ، ان سے ملنے گئے۔ اُن میں پروفیسر احتشام حسین بھی تھے۔ احتشام صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے کہا یگانہ صاحب! آپ اب (ان نامساعد حالات اور اپنے ماحول میں یہ باتیں نہ کہا کیجیے تو جواب میں اس کلام کے برجستہ انھوں نے کہا احتشام صاحب! میں اب بھی یہ باتیں نہیں کروں گا تو پھر کب کروں گا یعنی وہ مشکک تھے۔ اس کا ان کو احساس اور اعتراف تھا مگر ماحول نامساعد تھا۔ حال بہ ایں جا رسید کہ ہمارے نام نہاد دانشور آج تک اپنی خود ساختہ انا کے خول کے دائرے میں پوری کائنات کو اپنے دام خیال کا اسیر اور حلقہ بگوش سمجھتے ہیں اور اس کے باہر رہنے والے کو مخلوق خدا بھی نہیں گردانتے۔ آج یگانہ جیسے کافر اور زندیق کو نام نہاد دانش ور گھاس نہیں ڈالتے جبکہ یگانہ کی بصیرت اور مبلغ علم (اور معلومات کا خزانہ) بہر حال افضل ہے اور چونکہ کٹھ ملاؤں کی پہنچ سے باہر ہے لہٰذا وہ لائق اعتنا نہیں رہا۔ خواجہ نے (اور بیک وقت خواجہ کے قلم نے بھی) یگانہ کی اسی بصیرت اور دانش کو نمایاں کرنے کے لیے یگانہ کے دیوان کی ازسر نو تدوین کی اور تحقیق و تدقیق کا موضوع بنایا۔ گو یگانہ کی متخیلہ کی تعمیر میں جو شوخی اور شوخ چشمی کا زاویہ متعین ہوتا ہے، وہ ان کے متقدمین اور معاصر شعراء سے ذرا مختلف ہے لیکن خود یگانہ کے مزاج اور مذاق (سخن) کے اختلاف (مختلف) سے ان کی بصیرت اور مبلغ علم پر حرف نہیں آتا۔ چنانچہ خواجہ نے اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے یگانہ کے کلام کی تدوین تن دہی سے کر ڈالی۔

WWW.KITAABISTAN.COM

جب احتشام حسین نے لکھنؤ میں یگانہ کے ساتھ ناروا سلوک پر ان سے براہ راست یہ کہا کہ اب آپ ایسی باتیں نہ کیا کیجیے جن سے ایسے واقعات رونما ہونے کا احتمال ہو تو انھوں نے برجستہ کہا احتشام صاحب! میں اب بھی یہ باتیں نہیں کروں گا تو پھر کب کروں گا یعنی ان کو اپنی عمر طبعی کا بھی احساس تھا اور اپنی تکلیف شرعی کا بھی نیز لکھنؤ کے اس ناہموار معاشرے کے قوام کا بھی۔ آج بھی (بزعم خویش) ایسے افراد ہمارے ترقی یافتہ معاشرے میں موجود ہیں جو اگر اپنی بصیرت پر خود غور کریں اور اس کا محاسبہ محاکمہ کریں تو (یگانہ کی متخیلہ کی بصیرت کے علی الرغم) خود ان کی سوجھ بوجھ، بصیرت اور مبلغ علم یگانہ کے کلام کی تفہیم میں بالغ نظری آئے گی؛ مثلاً میر اور غالب اور یگانہ جس مرتبہ اللہ تعالی کے حضور میں شوخی اور شوخ چشمی سے کام لیتے ہیں وہ سوئے ادب نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اسی بدعت حسنہ سے کام لیا ہے:

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

شاعر کا مافی الضمیر وہ نہیں ہے جو بادی النظر میں سامنے آتا ہے یعنی یگانہ خدا نہیں بنے تھے بلکہ خدا اپنی ذات میں تنہا تھا اور اس کی ذات کا عارف کوئی نہیں تھا۔ جب انسان پیدا کیا تو اس کی ذات کا عرفان قائم ہوا۔ شوخی اور شوخ چشمی یہ ہے کہ ہمارے بغیر (انسان کے بغیر) ناسمجھوں کو اپنی فہم کا قصور نظر نہیں آتا، یگانہ کا نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر خواجہ نے تحقیق و تدقیق کے دوائر میں رہ کر یگانہ کے کلام کی تدوین کی۔ اب ایک مسئلہ خواجہ کے مذاق تحقیق کے سلسلے میں یہ ہے کہ اگر وہ خود کو تحقیق کے اسی دائرے میں محدود رکھتے اور اسی روش پر گامزن رہتے تو زیادہ سے زیادہ وہ اس میدان میں قاضی عبدالودود بن سکتے تھے جو سوشل سائنسز کو اور ترقی پسندی (یعنی مادی جدلیات) سے کما حقہ فیض حاصل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کی روش صرف فرسودہ اور از کار رفتہ مذاق تحقیق تک محدود تھی۔ خواجہ نے خود کو محدود کیا نہ اپنے مزاج اور مذاق کو مسدود رکھا بلکہ صحافت کے خارزار میں اپنے پیڈسٹل سے اتر کر ادب کے اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے بڑے بڑے کج کلاہوں کا محاکمہ اور محاسبہ کر ڈالا جس کی ضرورت تھی اور یہ کام خواجہ نہیں بلکہ خامہ بگوش ہی انجام دے سکتا تھا۔

اس معاملے میں ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں دونوں کو خامہ بگوش سے ناجائز شکایتیں ہیں۔ خامہ بگوش کو کسی سے ذاتی پرخاش نہیں تھی بلکہ اخلاقیات کے دوائر سے غور کیجیے تو یہ بھی ایک ادارہ ہے جس کے اخلاقی اقدار (ترقی یافتہ اور ترقی پذیر) معاشروں میں کارفرما ہیں۔ چاروں چولوں سے چوکس معاشروں تک میں ذرا سا بھی رخنہ پڑ جاتا ہے تو مستقبل میں بڑا بھاری خلاء ظاہر ہوتا ہے۔ دانشوری اور دیدہ وری کا یہ تقاضا ہوتا

ے کہ بروقت اس سے آگاہی رکھی جائے۔ سو قوم خفتہ میں اگر کوئی فرد بشر بھی بیدار ہو تو اس کا نوٹس لیا جائے سو خولجہ اور خامہ بگوش دونوں بیدار اور بیدار مغز ثابت ہوئے۔ خولجہ اور خامہ بگوش دونوں متوازن فکر اور بصیرت کے حامل ثابت ہوئے اور افراط و تفریط، جو ہمارے قومی مزاج کا طرۂ امتیاز ہے، سے اپنے قاری کو دور رکھا۔

خولجہ نے تحقیق کے اردو مزاج کو فرسودہ روایت کے از کار رفتہ امور سے دور رکھا اور جدید (مغرب کے ترقی یافتہ مزاج سے) آشنا کیا یعنی قاری کی علمی تشنگی کی جستجو کو سیراب کرنے کی سعی جاری رکھی۔ تحقیق و تدقیق میں تنقید، تجزیہ اور تحلیل کو رہبر بنایا اور جزئیات کے مراکز، سرچشموں اور منابع کو منتشر نہیں ہونے دیا۔ اس مقصد کے لیے حواشی اور شذرات کی تفسیر اور تصریح سے کام لیا اور خامہ بگوش کی حیثیت سے جس تنوع کو فکاہات میں باقی رکھا اسے ادبی استقامت بخشی اور صحافت کے سطحی اور سطحی بدمذاقی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ یہ بجائے خود اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ خولجہ اور خامہ کا علمی اور ادبی حلقوں میں احترام اور وقار قائم ہوا جو اردو تحقیق و تدوین میں بھی باوقار رہے گی اور فکاہات میں بھی وقیع مقام کی مستحق سمجھی جائے گی۔

(بشکریہ روشنی کراچی)

WWW.KITAABISTAN.COM

محمد عالم مختار حق

مشفق خواجہ سے ایک یادگار ملاقات

اردو زبان وادب کے نامور محقق مشفق خواجہ اب ہم میں نہیں رہے لیکن جب تک اردو زبان وادب زندہ رہیں گے، مشفق خواجہ بھی زندہ رہیں گے اور ان کی وفات اس دن ہوگی جب اردو زبان اور تحقیق کا جنازہ اٹھ رہا ہوگا۔

مشفق خواجہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ وہ دوستی کے تو قائل تھے لیکن ان کی اولین ترجیح تحقیق کی دنیا تھی۔ اپنا کام انھیں دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھا اسی لیے وہ عمر بھر تقریباً گوشہ نشین رہے اور ناظم آباد کراچی میں ریلوے لائن کے ساتھ ایک چھوٹی سی گلی میں واقع مکان میں عمر گزار دی۔

ملاقات کے متمنی لوگوں کے لیے گھر کی چوکھٹ پر ایک چٹ لگا رکھی تھی۔ اس پر یہ لکھا ہوا تھا:

''ملاقات سے قبل پیشگی اجازت حاصل فرمائیں۔''

ان سے ملاقات کا طریقہ دراصل یہ ہوتا کہ پہلے آپ انھیں فون کیجیے۔ اگر وہ آپ سے ملنا پسند فرمائیں گے تو اپنی مصروفیات کے شیڈول میں جگہ بنا کر آپ کو ایک خاص تاریخ اور خاص وقت دے دیں گے، ورنہ چھٹی کے دن انتظار کیجیے۔ دوسری صورت نہایت صبر آزما تھی۔ سہ منزلہ مکان کی سیڑھیاں طے کیجیے، منہ چڑاتی چٹ پڑھیے اور دروازے پر دستک دے کر مشفق خواجہ کا انتظار کیجیے۔ جب وہ تشریف لے آئیں اور کہیں ''فرمایئے'' تو آپ ان سے کہیے کہ مشفق خواجہ صاحب! کیا میں دو چار روز میں حاضر ہو سکتا ہوں؟ اگر آپ کی خوش قسمتی عروج پر ہوگی تو وہ دو چار دنوں میں سے کوئی دن دے دیں گے، ورنہ کہہ دیں گے، دو چار دن بعد حاضر ہو کر پھر معلوم کیجیے۔

یہ مشفق خواجہ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے جب راقم کا جی چاہا کہ ان سے ملا جائے۔ میں نے انھیں فون کیا اور انٹرویو دینے کے لیے درخواست کی۔ میں دراصل نامور ادیبوں کے انٹرویوز پر مبنی ایک کتاب ترتیب دینا چاہتا تھا۔ انھوں نے یہ شرط عائد کی کہ پہلے تو میں ان کے پاس آ کر یہ بتاؤں کہ آخر میں ان سے کیوں انٹرویو کرنا چاہتا ہوں، جب کہ شہر میں بہت سے اہم اور بڑے لوگ موجود ہیں اور پھر انھوں نے ایک خاص تاریخ اور وقت مرحمت فرما دیا۔ اپنا انٹرویو دینے سے قبل مشفق خواجہ نے تقریباً نصف گھنٹے تو راقم کا ہی انٹرویو لیا۔ بہر کیف رفتہ رفتہ ان سے باقاعدہ گفتگو ہونے لگی اور وہ سوالات کے جوابات دینے لگے۔

س: آپ کی سب سے اہم مصروفیت بہر حال تحقیق ہے لیکن، ظاہر ہے، تحقیق کے اس کام سے زندگی تو بسر نہیں کی جا سکتی۔ کیا آپ مالی طور پر ایک مستحکم شخص ہیں یا زمینیں وغیرہ ہیں؟

ج: یہ تو ظاہری بات ہے کہ میں اگر خدانخواستہ مالی مسائل میں مبتلا ہوتا اور مالی طور پر مستحکم نہ ہوتا تو یوں دنیا ترک کر کے نہ بیٹھا ہوتا۔ یہ جو تحقیق کا کام ہوتا ہے، اس کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو آدمی کے پاس وقت ہونا چاہیے اور بہت ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس میں خرچ بہت ہوتا ہے تو پیسہ ہونا چاہیے۔ یہ مکان جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ تین منزلہ ہے، اس میں گیارہ کمرے ہیں۔ ان میں دس کمروں میں میری لائبریری ہے۔ اب جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، یہ میرا اور کتاب پور ہے اور اس میں تیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے ہیں۔ میری ضرورت کی ہر کتاب یہاں موجود ہے اور مجھے کہیں دوسری جگہ نہیں جانا پڑتا، اس طرح میرے وقت کی بچت ہوتی ہے۔

س: یہ جو آپ کو مالی آسودگی حاصل ہے، کیا یہ سب کچھ اسی تحقیق کا نتیجہ ہے پھر تو یہ بڑے کام کی چیز ہے؟

ج: نہیں نہیں...... اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تحقیق کے کام میں بھلا مالی منفعت کہاں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ مجھے مالی استحکام کے مواقع نصیب ہوئے اور مجھے روزگار کی فکر نہیں، کوئی بڑی پریشانی نہیں ہوئی اور میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں۔

س: ہمارے ہاں زندگی کے ہر سنجیدہ کام میں مزاح یا تمسخر کا پہلو نکال لیا جاتا ہے، تحقیق جیسے انتہائی سنجیدہ بلکہ خشک کام کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی ایک کتاب سے کوئی مواد لے لیا جائے تو یہ چربہ ہے لیکن اگر بہت ساری کتابوں سے لے لیا جائے تو وہ تحقیق ہے؟

ج: نہیں، یہ تو دراصل وہ لوگ کہتے ہیں جنھیں پتا ہی نہیں کہ تحقیق کیا ہے۔ تحقیق تو بازیافت کا نام ہے اور بازیافت کسی فرد کی ہو سکتی ہے، کسی کتاب کی بھی اور کسی عہد کی بھی۔ میں نے خود اپنے کالموں میں تحقیق کے بارے میں اتنی باتیں لکھی ہیں اور اتنا مذاق اڑایا ہے کہ کم لوگوں نے اڑایا ہوگا اور اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب بن سکتی ہے۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ کوئی تحقیق کو پڑھتا نہیں اور تحقیق ہی کیا، یہاں کون سی چیز پڑھی جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ تحقیق بہت سی کتابوں سے لے کر کی جاتی ہے، احمقانہ بات ہے کیونکہ بہت سے ایسے موضوعات پر بھی تحقیق کی جاتی ہے جن پر کتابیں ہی نہیں ملتیں تو اسے آپ کیا کہیے گا؟

س: تحقیق کا کام بذات خود کیا ہے، کیا اسے ہم ادب کہیں یا جزو ادب، آپ بتائیے؟

ج: جی نہیں، تحقیق کا ادب سے کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں ہے اور تحقیق کسی بھی حوالے سے ادب کی کوئی صنف نہیں ہے کیونکہ ادب تو تخلیق ہوتا ہے یعنی شاعری ادب ہے، افسانہ ادب ہے، ناول اور ڈرامہ ادب ہے، یعنی انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار جس فن میں ہے، اسے ادب کہیں گے۔ چنانچہ تحقیق میں تو کچھ ایسا نہیں ہوتا اور یوں تحقیق بذات خود تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار نہیں ہے۔ تحقیق تو دراصل ادب کے بارے میں ایک علم ہے، ادب سے آشنائی کا، ادب سے واقفیت کا، ادبی تاریخ سے آگاہی اور معلومات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے، یہ بذات خود ادب نہیں ہے۔

س: آپ بیک وقت بہت سے کام کرتے ہیں۔ شاعری، کالم نگاری، مختلف پرچوں کی ادارت کے فرائض، لاتعداد ادیبوں سے خط و کتابت جس میں ظاہر ہے وقت صرف ہوتا ہے اور مغز لگتا ہے۔ تو کیا یہ بہتر بات نہ ہوتی کہ آپ صرف اور صرف ایک کام ''تحقیق'' ہی کرتے۔ مشہور ہے کہ کئی چیزیں، کئی چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

ج: نہیں، میرے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ آدمی بہت سے کام ایسے کرتا ہے جو محض تفریح طبع کے لیے ہوتے ہیں۔ مثلاً مجھے فوٹوگرافی سے بے حد دلچسپی ہے۔ اب اگر میں فوٹوگرافی چھوڑ دوں اور کوئی یہ سمجھے کہ اس طرح میری تحقیق کا معیار بلند ہو جائے گا تو ایسی بات نہیں ہے۔ اس طرح میں نے جن ادبی پرچوں کی ایڈیٹری کی، وہ بھی عصری ادب سے واقفیت کے حصول کے لیے کی تھی مگر بعد میں وقت ضائع ہونے کے سبب یہ کام چھوڑ دیا۔

س: مشفق خواجہ صاحب! ابھی آپ نے فرمایا کہ تحقیق بذات خود ادب نہیں ہے۔ دوسری جانب یہ واقعہ ہے کہ آپ کی شناخت تو تحقیق ہے مگر آپ معروف بہرحال ایک ادیب کے طور پر ہیں اور سوائے ادیبوں کے آپ کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آپ خود کو کہاں محسوس کرتے ہیں؟

ج: بات یہ ہے کہ ادیب تو بہرحال تخلیق کرنے والے ہی کو کہتے ہیں۔ ''رائٹر'' کا لفظ انگریزی زبان میں ہر اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کچھ لکھے (یعنی کچھ بھی لکھے) لیکن ادیب تو وہی ہوتا ہے جو ادب تخلیق کرے۔ اب رہا میرا معاملہ تو میں ایک ادیب سے زیادہ خود کو محقق کہلانا پسند کروں گا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ میں نے کچھ دوسرے کام بھی کیے ہیں۔ تھوڑا بہت طنز و مزاح لکھا ہے،

شاعری بھی کی ہے۔ چنانچہ اگر اس طرح کوئی مجھے اردو ادب میں شامل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

س: جو لوگ تحقیق سے کسی بھی حوالے سے نسبت رکھتے ہیں، وہ آپ سے محبت کرتے ہیں مگر خود آپ کو اپنا تحقیقی کام کیسا معلوم ہوتا ہے، کیا آپ خود اطمینان محسوس کرتے ہیں؟

ج: اجی کہاں، اطمینان تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ بھلا کام سے اطمینان کہاں ہوتا ہے۔ البتہ خود کام کرنا باعث اطمینان ہوتا ہے۔ میں تحقیق کے میدان کا بس ایک طالب علم ہوں لیکن جب میں دوسروں کو کام کرتے دیکھتا ہوں تو اپنے کام پر شرم آتی ہے۔

س: ایسے کون سے لوگ ہیں جن کا کام آپ کو شرمسار کر دیتا ہے، یہ تو بڑی بات ہے؟

ج: بہت ہیں بھئی، کوئی ایک، دو تھوڑا ہی ہیں۔ ایک طویل قطار ہے ایسے لوگوں کی۔ قاضی عبدالودود ہیں، حافظ محمود شیرانی، مالک رام، امتیاز علی عرشی کئی لوگ ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کا کام دیکھنے کے بعد شرم آتی ہے کہ ہم نے بھلا کیا کام کیا ہے۔ سچی بات ہے بڑی شرم آتی ہے۔

س: لیکن شہرت آپ کی سب سے زیادہ ہے؟

ج: بس شہرت ہے مگر شہرت سے کیا ہوتا ہے، شہرت کچھ نہیں ہوتی۔

س: جو بھی ہو، کم از کم کام کے حوالے سے بھی آپ کا ایک کام بے پناہ سراہا جاتا ہے، بلکہ بعض تو اسے تخلیقی کارنامہ بھی قرار دیتے ہیں۔ میری مراد "جائزہ مخطوطات اردو" سے ہے۔

ج: (مسکراتے ہوئے) ہاں، اسے لوگوں نے پسند کیا کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا الگ ہی کام ہے۔ اس پر میری حوصلہ افزائی کی گئی ہے لیکن یہ بھی کوئی ایسا کام نہیں ہے، کوئی بھی محنت کر سکتا تھا۔

س: خواجہ صاحب آپ کسی ادبی تقریب میں نظر آتے ہیں نہ کسی مشاعرے میں جاتے ہیں اور نہ ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام میں شریک ہوتے ہیں۔

ج: اجی چھوڑیے، کیا رکھا ہے ان تقریبات میں، میرے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا کیونکہ آدمی کہیں جاتا ہے تو آنے جانے میں وقت لگتا ہے، پھر وہاں بیٹھنا پڑتا ہے تو دن ضائع ہو گیا اور میں اپنا دن کیوں ضائع کروں لیکن میں شادیوں اور جنازوں میں چلا جاتا ہوں۔ جن تقریبات میں مجھے جانا ہوتا ہے، وہاں بہر حال جاتا ہوں۔

س: آپ کا کوئی حلقہ احباب ہوگا؟

ج: حلقہ میرا بہت وسیع ہے۔ ایک زمانے میں تو میں ہندوستان بھی جایا کرتا تھا، جب کہ پاکستان میں

خاص کر لاہور جاتا ہوں لیکن اب تو وہاں بہت سے لوگ ہی نہیں رہے، چن چن کر بزرگوں سے ملتا تھا۔ کراچی میں مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری سے ضرور ملتا تھا۔ ملنا ملانا بہت رہا ہے۔ ہاں، تعداد کم ہے...... یہ اور بات ہے۔

س: سلیم احمد اور ابن انشاء سے بھی ملاقاتیں رہیں؟

ج: ابن انشاء سے تو بہت گہری دوستی رہی۔ ہم نو سال تک آمنے سامنے رہے۔ بعد میں ہم ہر روز ٹیلی فون پر بات کرتے تھے، ہاں ان سترہ برسوں میں ملاقاتیں البتہ سترہ بھی نہیں ہوئیں۔ سلیم احمد سے البتہ میل جول نہیں رہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملتا تھا، جس کے ہاں مجمع لگا رہتا ہو۔ ہاں، ٹیلی فون پر اکثر بات چیت رہتی تھی۔ عام زندگی میں تین چار بار ہی ملاقات ہوئی ہوگی۔

س: جمیل الدین عالی سے؟

ج: عالی صاحب سے زیادہ تر ملاقاتیں دعوتوں میں ہوتی ہیں، اگر ان کے ہاں دعوت ہو تو میں چلا جاتا ہوں، میرے ہاں ہو تو وہ میرے ہاں آجاتے ہیں۔

س: خواجہ صاحب، آپ نے مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی کام کیا ہے، وہ اپنی ذات میں کیسے شخص تھے۔ میں لاہور گیا تو وہاں ایک صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب اردو زبان کے حوالے سے جتنے بھی قد آور ہوں مگر وہ پنجابی زبان اور پنجابیوں کے لیے نہایت تعصب رکھتے تھے بلکہ انھیں ڈھور ڈنگر کہا کرتے تھے..... آپ کا کیا مشاہدہ رہا ہے؟

ج: یہ بات جس نے بھی کہی، جھوٹ اور لغو ہے۔ مولوی صاحب جیسے شخص تھے ان کے ہاں تو اس قسم کی باتوں کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ان کے تو بہترین دوست ہی پنجابی تھے۔ مثلاً ڈاکٹر مظفر الدین قریشی، عبدالقادر، علامہ اقبال وغیرہ۔

س: کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ کی بے پناہ شہرت کی وجہ آپ کی کالم نگاری ہے جب کہ بہ حیثیت محقق آپ کو اتنے ہی لوگ جانتے ہیں جس قدر تحقیق سے وابستہ حلقہ ہے اور وہ کس قدر ہے، اس کا اندازہ آپ کو بھی ہے۔ یہ بتایئے کہ آپ نے کالم نگاری کا آغاز کن محرکات کے تحت کیا؟

ج: کالم نگاری کا قصہ کچھ یوں ہے کہ میں بہت سی کتابیں پڑھتا تھا تو مجھے افسوس ہوتا تھا کہ ان میں فلاں بات نہیں ہے یا بہت سے علمی، ادبی مسائل ہوتے تھے، جن پر اظہار خیال کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اب بہرحال اس کے دو ذریعے تھے کہ یا تو میں سنجیدہ نوع کے کالم لکھنا شروع کر دوں یا پھر یہ

انداز (طنز و مزاح) اختیار کروں۔ مجھے یہ انداز پسند آیا کہ اس میں بات بھی کہہ دی جاتی ہے اور سننے والے کو ناگوار بھی نہیں گزرتی۔ میں نے بعض بہت ہی خراب کتابوں پر بھی کالم لکھے اور انہی پہلوؤں کو نمایاں کیا تو میرے یہ کالم ایک طرح سے تنقیدی کالم بھی ثابت ہوئے۔

س: بہر حال آپ کے کالموں سے تنازعات تو جنم لیتے تھے اور پھر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا؟

ج: میں نے کبھی کسی کے بارے میں غلط بات نہیں لکھی یعنی جو بات لکھی ہے، دلائل کے ساتھ لکھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی کو ستانے کے لیے کوئی بات لکھی ہو، چھیڑ چھاڑ البتہ ہو سکتی ہے۔ میرے ہاں بہر حال آپ کو کسی تضحیک کا پہلو نہیں ملے گا بلکہ شاید آپ کو تعجب ہوگا کہ لوگ مجھ سے براہ راست رابطہ کرتے اور کہتے کہ خواجہ صاحب آپ خواہ خلاف لکھیے مگر لکھیے ضرور۔ بعض لوگ تو اس پر ناراض بھی ہو گئے کہ میں نے ان پر نہیں لکھا میرے ایک دوست ہیں نذیر صدیقی، میں نے کوئی بیس کالم ان کے خلاف لکھے مگر وہ ناراض نہیں ہوئے، میں لفظ خلاف استعمال کر رہا ہوں۔

س: کبھی کسی نے برا بھی مانا کیونکہ آپ کے کالم کی دھار تو بے حد نوکیلی ہوا کرتی تھی، لوگ تلملاتے تو ضرور ہوں گے؟

ج: زیادہ نہیں، ہاں دو مثالیں ہیں اور جب انھوں نے برا مانا تو پھر میں نے کبھی ان پر دوبارہ نہیں لکھا، کیونکہ میں کسی کو ناراض کرنے یا آزار پہنچانے کے لیے تو لکھتا ہی نہیں۔

س: کالم "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے لکھنے کی کوئی خاص وجہ؟

ج: خامہ بگوش کے نام سے کالم نگاری کی وجہ یہ تھی کہ میں کالم نویسی کو تفریح سمجھتا ہوں۔

س: تفریح سمجھتے ہیں یا اسے نسبتاً چھوٹا کام سمجھتے ہیں؟

ج: نہیں نہیں...... محض تفریح۔ بس اللہ خیر سلاّ، پھر جناب نام میں رکھا کیا ہے۔

س: طنز و مزاح تو آپ کا خاصہ ہے، کبھی آپ نے ادبی سطح پر کوئی سنجیدہ کالم بھی لکھا؟

ج: یہ واقعہ صرف ایک بار پیش آیا جب سلیم احمد انتقال کر گئے تو میں نے ان پر کالم لکھا تھا اور یہ سنجیدہ کالم تھا۔

س: یہ بتائیے، زندگی میں کبھی پچھتاوا بھی ہوا؟

ج: نہیں کبھی نہیں، مجھے اپنے کسی عمل پر پچھتاوا نہیں ہوا اور میں سمجھتا ہوں، میں نے کبھی کوئی کام بغیر سوچے کیا ہی نہیں ہے اور بغیر سوچے سمجھے جو کام ہوتے ہیں، آدمی ان پر ہی پچھتاتا ہے۔

س: کوئی شخص جسے آپ دومنٹ بھی برداشت نہ کرسکیں؟

ج: نام لوں؟.......... بہت لوگ ہیں۔ مشاعرے کے شاعر جب شعر سناتے ہیں، میں برداشت نہیں کرتا۔ دومنٹ تو بہت زیادہ ہوتے ہیں، میں تو دو سیکنڈ برداشت نہیں کرتا۔

س: آپ نے زندگی کے کسی حصے میں محبت کی؟

ج: آپ جو بھی معنی لے لیں میں نے ویسے ہر معنوں میں محبت کی۔

س: عورت سے، کسی لڑکی سے؟

ج: یہ کوئی عیب تھوڑا ہے، کوئی غیر لڑکی یا عورت جس سے محبت بلکہ عشق فسق وفجور میں مبتلا نہ کرے اور معاملات پاکیزہ ہوں تو کیا مضائقہ ہے۔ مجھے تو اس میں عیب کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

س: آپ کی شاعری کے بارے میں اگرچہ جید شعراء کی رائے یہ ہے کہ اگر آپ تحقیق اور ادبی کالم نگاری سے غیر متعلق بھی ہوتے تو شاعری ہی وجہ شہرت بن جاتی اور آپ کا شمار عصر حاضر کے اہم ترین شعراء میں ہوتا؟

ج: میری رائے میں میری شاعری قابل ذکر ہی نہیں ہے اور اس کے بارے میں میری کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ تاہم میرے اندر کا جو شاعر ہے، وہ مرا نہیں ہے، زندہ ہے۔ لیکن میری مصروفیات کے سبب اسے اظہار کا راستہ نہیں ملتا۔ میرا جو ایک مجموعہ شائع ہوا ہے تو اعلیٰ شاعری کے معیار کے حوالے سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ وہ میرے کچھ ذاتی تجربات ہیں اور محسوسات ہیں تو بس ان کے حوالے سے وہ مجھے پسند ہے۔

س: کوئی خاص کام جو آپ کرنا چاہتے ہوں؟

ج: کام تو بہت ہیں اور صورت یہ ہے کہ یہ جو کاغذات کا پلندہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ دراصل موصول ہونے والے خطوط ہیں، جن کے جوابات دینے ہیں۔ پھر کئی کتابیں ہیں جو دیکھنی ابھی باقی ہیں یعنی ایڈٹ کرنی ہیں۔ کئی اشاعت باقی ہیں، ڈھیروں فائلیں بند رکھی ہیں، پرانے شعراء پر کام کرنا ہے، بس میری یہ خواہش ہے کہ کسی طرح یہ سب کام اور دیگر سب کام ہو جائیں۔

دوسرا حصہ

مشفق نامے

WWW.KITAABISTAN.COM

WWW.KITAABISTAN.COM

(بنام جناب رشید حسن خاں)

(۱)

میرے محترم خان صاحب! سلام مسنون

یہ خط اس لیے تاخیر سے لکھ رہا ہوں کہ آپ نے اطلاع دی تھی کہ ۱۲ مئی تک آپ بمبئی میں رہیں گے ورنہ کئی بار جی چاہا کہ خط لکھ کر آپ کی خیریت معلوم کروں۔ آپ نے اپنی صحت کا جو حال لکھا ہے، اس سے تشویش ہے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمنہ بھی آپ کے لیے دست بدعا ہیں۔

کالی داس گپتا رضا کی وفات ان سب لوگوں کے لیے دلی رنج کا باعث ہے جو ان سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ بہت اہم علمی کام انجام دے رہے تھے، شخصی طور پر بھی بے مثال تھے۔ میں نے کبھی کسی کی زبان سے ان کے خلاف کوئی بات نہیں سنی، جس نے بھی ان کا ذکر کیا، اچھے لفظوں میں کیا۔ ۱۹۸۵ء میں جب میں بمبئی گیا تھا تو ان سے تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان ملاقاتوں کی خوشگوار یادیں ذہن میں ابھی تک تازہ ہیں۔ معلوم نہیں ان کی لائبریری کا کیا ہوگا۔ اسے ان کی یادگار کے طور پر علی گڑھ جیسے کسی مرکزی مقام پر محفوظ ہونا چاہیے۔ پاکستانی اخبارات میں رضا صاحب کے انتقال کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ کئی مضامین بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر ابوسلمان صاحب والا کام ان شاء اللہ جلد ہوگا۔

اس سے بہتر کیا ہوگا کہ 'املائے غالب' کو ادارۂ یادگار غالب سے شائع کر دیا جائے۔ آپ اس کا مقدمہ دوبارہ لکھ کر عنایت فرمایئے۔ فوری طور پر اس کی طباعت کا کام شروع کر دیا جائے گا۔

آپ کے دوست اسلم محمود صاحب آئے تھے مگر وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک دن وہ غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا کہ خاص کلام تھوڑا سا میرے پاس ہے، نکال رکھوں گا، آپ لے لیجیے گا۔ انھوں نے لکھنؤ سے متعلق تصاویر دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ وہ ان کے سامنے رکھ دیں۔ چار تصویریں ان کے کام کی نکلیں۔ کہنے لگے میں ان کے عکس بنوا کر واپس کر دوں گا۔ میں نے کہا عکس بنوانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چاروں آپ کی نذر ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس مکرر کتابیں خاصی تعداد میں ہیں۔ آپ انھیں دیکھ لیں، جو کتابیں آپ کے کام کی ہوں گی پیش کر دوں گا۔ انھوں نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا، پھر ایک دن ان کا فون آیا کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔ انھوں نے تو خدمت کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔

مقالات صدیقی کے لیے میں نے شاہد علی خاں صاحب کو خط لکھا تھا مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب دوبارہ لکھوں گا۔ 'معربات رشیدی' سے متعلق تمام کاغذات میں نے مظہر محمود شیرانی صاحب کو دے دیے ہیں۔ وہ ان شاء اللہ بہت جلد ان کاغذات کو مرتب کر دیں گے اور اصل متن کا اردو ترجمہ بھی کر دیں گے۔

کلیات یگانہ کی فرہنگ میں نے تیار کر لی ہے۔ یہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اسے بنظر اصلاح دیکھ لیجیے۔ بعض لفظوں یا محاورات کے معنی میں متعین نہیں کر سکا۔ ان کو بطور خاص ملاحظہ فرمائیے، ان پر سرخ نشان لگا دیا ہے۔ فرہنگ کی ترتیب لغت کے مطابق نہیں ہے۔ یہ میں بعد میں درست کر لوں گا۔ الفاظ میں نے بہت کم کر دیے ہیں لیکن اب بھی اگر بعض الفاظ خارج کرنے کے لائق ہوں تو خارج کر دیجیے۔ آپ کی نظر سے گزرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ یہ فرہنگ اشاعت کے لائق ہے۔

آمنہ سلام لکھوا رہی ہیں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۵۔۵۔۲۰۰۱ء

بخدمت گرامی:
محترم رشید حسن خاں صاحب، شاہجہانپور۔

WWW.KITAABISTAN.COM

(۲)

محترمی و مکرمی! سلام مسنون۔

میں اس انتظار میں تھا کہ آپ کی کتاب پریس سے آ جائے تو خط لکھوں مگر افسوس کہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی۔ وجہ یہ ہے کہ بازار میں کاغذ نہیں مل رہا۔ اب امید بندھی ہے کہ صورت حال بہتر ہوگی اور اگلے مہینے کاغذ مل جائے گا۔ اس تاخیر کا مجھے بہت افسوس ہے۔ امید ہے آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔ امید ہے مولانا ابوسلمان سے متعلق کام اب تک ہو گیا ہوگا۔ اس میں مولانا کا کوئی قصور نہیں، ساری کوتاہی اس شخص کی ہے جس نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی۔ مولانا نے اور میں نے بھی اس شخص کی اچھی طرح مزاج پرسی کی۔ مولانا نے تو یہ کام اپنے سارے کام چھوڑ کر نہایت مستعدی سے انجام دیا تھا مگر اس...... نے بلا وجہ تاخیر کی۔

یگانہ کی فرہنگ کے سلسلے میں آپ کے ارشادات میری رہنمائی کریں گے۔ نہایت ضروری الفاظ ہی کو اس فہرست میں شامل کروں گا۔

‘یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک روز ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پوتے سہیل صدیق نے از خود مجھ سے رابطہ کیا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے کچھ کاغذات بھجوا دیے جو زیادہ تر ”المعربات“ سے متعلق تھے۔ میں نے انھیں دیکھا معلوم ہوا، متن مکمل ہے، دیباچے کے لیے صدیقی صاحب نے کچھ یادداشتیں جمع کر رکھی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ فرہنگِ رشیدی کا جو ایڈیشن تہران سے شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں ’المعربات‘ کو بطور ضمیمہ شامل کیا گیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کسی ایرانی عالم کے پاس تھا۔ صدیقی صاحب کے پیش نظر دو نسخے تھے، ایک ان کا اپنا اور دوسرا رام پور کا۔ صدیقی صاحب کے مرتبہ متن کا ایرانی متن سے مقابلہ کیا تو خاصا فرق نظر آیا۔ چند روز بعد مظہر محمود شیرانی (حافظ محمود شیرانی کے پوتے اختر شیرانی کے بیٹے) کراچی آئے تو مجھ سے ملے۔ میں نے انھیں آمادہ کر لیا کہ وہ ’المعربات‘ پر کام کریں۔ اس طرح صدیقی صاحب کا یہ کام ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔

صدیقی صاحب کے مضامین کی پہلی جلد تو آپ کی توجہ سے چھپ گئی تھی، دوسری جلد کہاں ہے؟ کیا یہ ابھی تک اتر پردیش اکیڈمی کے پاس ہے؟ اگر وہ نہ چھاپ رہے ہوں تو دونوں جلدوں کی اشاعت کا انتظام میں کر سکتا ہوں۔ مسلم صاحب صدیقی صاحب کے خطوط بھی جمع کر رہے تھے۔ خدا جانے اب یہ خطوط کہاں ہیں؟ صدیقی صاحب سے میری خط و کتابت رہی ہے۔ پندرہ بیس خط تو میرے نام کے نکل ہی آئیں گے۔ مولوی عبدالحق کے نام کے کچھ خط بھی میرے پاس ہیں۔ کچھ اور خط بھی مل جائیں گے۔ اس طرح خطوط کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

شعائر اللہ خاں صاحب نے آپ کے توجہ دلانے پر دیوانِ غالب کے مطلوبہ صفحات کے عکس بھیج دیے۔ یہ اتنے مدہم تھے کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بہرحال کمپیوٹر کے ذریعے حروف کو واضح کر دیا گیا تو کچھ بات بنی۔ ان کو شکریے کا خط لکھ رہا ہوں۔ آپ اگر انھیں خط لکھیں تو شکریہ ادا کر دیجیے گا۔ میرا ٹیلی فون نمبر ۶۶۱۰۶۴۸ ہے۔

دیوانِ غالب نسخۂ مسروقہ کے بارے میں سید قدرت نقوی نے بھی ایک کتابچہ لکھا ہے۔ یہ آپ کے ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔

عبدالقوی دسنوی صاحب کو میرا خط مل گیا تھا۔

آمنہ سلام لکھوا رہی ہیں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۱۳-۱۰-۲۰۰۰ء

بخدمت گرامی:
محترم رشید حسن خاں صاحب،
شاہجہاں پور۔

WWW.KITAABISTAN.COM

(بنام ڈاکٹر خلیق انجم)

(۱)

برادر مکرم! سلام مسنون۔

آپ کی ارسال کردہ کتابیں مل گئیں۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ امید ہے آپ اب تک مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے ہوں گے اور حسب معمول زندگی کے ہنگاموں میں پوری طرح شریک ہوں گے۔ آپ کی صحت دراصل اردو ادب اور اردو زبان کی صحت ہے لہٰذا اپنے لیے نہیں تو زبان و ادب کی خاطر اپنی صحت کا خیال رکھیے اور آپ کے پاس جو موٹر سائیکل ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طلاق دے دیجیے یا اپنی محبت کی نشانی کے طور پر میرے پاس بھجوا دیجیے۔

محترم انور عنایت اللہ صاحب سے آپ واقف ہوں گے۔ ہمارے ہاں کے ممتاز افسانہ نگار، صحافی اور نقاد ہیں۔ یہ چند روز کے لیے کسی سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے موصوف سے عرض کیا ہے کہ پہلی فرصت میں آپ سے رابطہ قائم کریں۔ اگر آپ انھیں خاص اہل قلم سے ملوا دیں تو بہت اچھا ہو۔

بھابھی کی خدمت میں ہم دونوں کا آداب۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۳-۹-۸۹ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، دہلی۔

پس نوشت: ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔ ان کی کتاب 'ظفر' چھپ گئی تھی۔ اس کے چند نسخے ناشر نے بذریعۂ ڈاک روانہ کیے تھے۔ پرویز صاحب نے ان کی وصولی کی اطلاع نہیں دی۔ ان سے کہیے گا میرے لیے 'عصری ادب' جمع کرتے رہیں۔

(۲)

محترمی و مکرمی! سلام مسنون!

اگست کے وسط میں، میں نے رجسٹری سے ایک لفافہ بھیجا تھا۔ امید ہے مل چکا ہوگا۔ رضیہ فصیح احمد آج دہلی روانہ ہو رہی ہیں۔ امید ہے آپ سے ملاقات ہو چکی ہوگی۔

حسبِ معمول ایک زحمت دے رہا ہوں۔ میں نے کلیاتِ یگانہ مرتب کی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے 'آیاتِ وجدانی' مطبوعہ دہلی ۱۹۳۴ء کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب (لکھنؤ) کے پاس ہے۔ میں نے انھیں خط لکھا ہے کہ وہ اس کا عکس آپ کو بھجوا دیں۔ آپ یہ عکس رضیہ فصیح احمد صاحبہ کو دے دیجیے گا۔ مجھے اس کی شدید ضرورت ہے اور اسی کی وجہ سے کام رکا ہوا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو ڈاکٹر نیر مسعود کو فون کر کے عکس منگوا لیجیے۔ ان کا نمبر یہ ہے ۲۱۵۸۱۔

آج غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی سے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے غالب سیمینار کا دعوت نامہ بھجوایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ آپ ہی کا درپردہ کرم ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ دعوت نامہ دیکھ کر سیمینار میں شرکت کا تو نہیں، دہلی کی سیر کا خیال آ گیا۔ اگر زندگی رہی تو اگلے سال زحمت دینے کے لیے آؤں گا۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ہندوستان کی سیر کا پکا ارادہ ہے۔

بھابھی صاحب کی خدمت میں ہم دونوں کا آداب۔ بچوں کو پیار۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
تاریخ؟؟؟؟؟

بخدمت گرامی
ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، دہلی۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

(بنام محمد حمزہ فاروقی)

(۱)

برادرم مکرم و محترم حمزہ صاحب! سلام مسنون۔

یکے بعد دیگرے آپ کے دو خط ملے۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اتنی دور رہ کر بھی آپ نے مجھے یاد رکھا۔ یہ میری خوش بختی اور آپ کی خوش صفاتی ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں، میں اپنے گھر کی سیڑھیوں سے نیچے نہیں اترا۔ باہر کی دنیا سے میرا تعلق آپ کے ذریعے تھا۔ یہ تعلق گو عارضی طور پر ختم ہو گیا ہے لیکن میں گزرے ہوئے اچھے دنوں کی یاد میں، آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کروں گا، جب آپ دوبارہ یہاں تشریف لائیں گے۔ آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے یہ بن باس گوارا کیا ہے، اس کے پیش نظر میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔

مکان کے سلسلے میں آپ کی پریشانیوں کی تفصیل پڑھ کر تشویش ہوئی۔ میری دعا ہے کہ اب تک آپ کو مکان مل چکا ہو۔ میں اس قسم کی مشکلات کے پیش نظر آپ کو مشورہ دیتا تھا کہ وقت مقررہ سے کم از کم ایک مہینہ پہلے آپ کو لندن پہنچ جانا چاہیے۔

اب آپ پچھلی باتوں کو ذہن سے نکال دیجیے۔ آپ کے ساتھ جس نے بھی برا سلوک کیا ہے، اسے معاف کر دیجیے۔ ماضی کی تلخ یادوں کو اپنے ذہن و قلب سے دور رکھیے۔ آئندہ کی فکر کیجیے۔ علمی ترقی ہر قسم کی ذہنی پریشانی سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لندن میں اپنا وقت بالکل ضائع نہیں کریں گے۔ یاد رکھیے ہر گزرا ہوا لمحہ ہی انسان کا اصل نامۂ اعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ لمحہ بے کار گزرا ہے تو نامۂ اعمال پر ایک سیاہ نقطے کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں ایک اور معاملے میں بھی آپ کو مشورہ دوں گا۔ دوست بنانے کے سلسلے میں آپ قدرے غیر محتاط ہیں۔ دوستی کی بنیاد ہمیشہ فکری و ذہنی ہونی چاہیے۔ محض وقت گزاری کے لیے دوستی کے دامن کو وسیع کرنا زندگی کے دامن کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اب تک آپ ہر اس شخص کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے ہیں جو آپ کے ساتھ چند لمحے گزار سکے، اسی لیے آپ کو ایسے لوگ ملتے رہے جو مخلص نہیں تھے۔ لندن میں آپ اس روش کو ترک کر دیجیے گا۔ کسی کو دوست بنانے یا سمجھنے سے پہلے یہ دیکھ لیجیے گا کہ وہ ذہنی سطح پر دوستی نبھا سکتا ہے یا نہیں۔ معاف کیجیے گا کہ میں اکثر ناصح مشفق بن جاتا ہوں لیکن کیا کروں، میں آپ کا بہی خواہ

WWW.KITAABGHAR.COM

ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ آپ زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیں اور اس طرح زندگی نہ گزاریں جس طرح عام لوگ گزارتے ہیں۔

کالم نویسی کا شغل جاری ہے لیکن اب میں اس سے گھبرا گیا ہوں کیونکہ اس میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ اب تک کے کالم آپ کو بھجوانے کی کوشش کروں گا(۱)۔

سفرنامے کی کاپیاں جوڑی جاری ہیں۔ یہ کام انشاءاللہ اس مہینے کے آخر تک مکمل ہو جائے گا۔ پھر طباعت و جلد سازی کا مرحلہ ہے جو بہت جلد طے ہوگا۔ اس سلسلے میں جو تاخیر ہوئی، مجھے اس کا افسوس ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ تاخیر ناگزیر تھی (۲)۔

مولانا مہر کے سلسلے میں کام جاری رکھیے، جس قدر جلد ممکن ہو مسودہ بھیج دیجیے تاکہ میں اس کام کو آگے بڑھا سکوں۔

انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں جانے کا اتفاق ہوا یا نہیں؟ آپ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہر ہفتے پابندی سے خط لکھتے رہیے۔ اپنے تجربات و مشاہدات کو تفصیل سے قلم بند کیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب روزنامہ ''جسارت'' میں سیاسی اور ادبی کالم لکھتے تھے۔

۲۔ ''زمان و مکاں اور بھی ہیں'' مارچ ۱۹۷۸ء میں ''عصری مطبوعات'' کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

(۲)

برادر مکرم و محترم! سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۶، نومبر ابھی ابھی ملا ہے۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ میں نے ۳۰، اکتوبر کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، امید ہے وہ اب تک مل چکا ہوگا(۱)۔

آپ نے اپنے گرامی نامے میں شکایت کی ہے کہ میں خط کا جواب نہیں دیتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو خط لکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں ان خوش گوار لمحوں کو یاد کرتا ہوں، بلکہ ان میں پھر کھو جاتا ہوں جو آپ کے ساتھ گزرے تھے۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری ڈاک پر ہے۔ ادھر سے میں خط لکھتا ہوں، وہ ابھی آپ تک پہنچتا نہیں ہے کہ آپ مجھے خط لکھ دیتے ہیں۔ اس خرابی کا حل میں نے یہ تلاش کیا ہے کہ آئندہ میں آپ کو ہر مہینہ کی ۵/ ۱۵ اور ۲۵ کو خط لکھا کروں گا۔ یہ سوچے بغیر کہ آپ کے خط کا جواب واجب ہے یا نہیں۔ ان تین تاریخوں میں لازماً خط لکھوں گا لیکن آپ پابند نہیں ہوں گے۔ آپ زیادہ سے زیادہ اور طویل سے طویل خط لکھتے رہیے۔ اب تک جو خط آپ نے لکھے ہیں وہ نہایت مختصر ہیں، نیز ان میں دل چسپ باتیں نہیں ہیں جو میں سننے کا متمنی ہوں۔

پچھلے تین دن آپ کی کتابوں کی صفائی میں صرف (۲)۔ ایک آدمی بھی بلا لیا تھا۔ افسوس کہ بیشتر کتابوں کو کیڑا لگا ہوا ہے اور بعض کو تو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ ان کی وجہ سے میری کتابیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ آپ کی متعدد کتابوں کی جلدیں الگ کرنی پڑی ہیں۔ ان کتابوں کا یہ حال ہے کہ ان کی حالت کیا ہوگی جو آپ کے گھر پر ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے گھر والوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ کتابوں کی صفائی باقاعدگی سے کرتے رہیں۔ کراچی کی ہوا کتابوں کے لیے بہت ناسازگار ہے۔ اگر کتابیں بغیر استعمال کے یا بغیر صفائی کے پڑی رہیں تو کیڑوں کی غذا بن جاتی ہیں۔ بہر حال مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے، کر رہا ہوں۔

آپ کی کتاب کی کاپیاں جوڑی جا چکی ہیں۔ اب چند روز ان کی چیکنگ میں صرف ہوں گے۔ اس کے بعد یہ پریس بھیج دی جائیں گی۔ میں اس سلسلے میں حتی الامکان عجلت سے کام لے رہا ہوں لیکن کام اتنا زیادہ ہے کہ وقت صرف ہو رہا ہے۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں۔ دیر آید درست آید والا معاملہ ہے۔

میں آپ کے ارشاد کے مطابق ”سفرنامہ اقبال“(۳) کے چند نسخے بحری ڈاک سے بھیج چکا ہوں۔ آپ کو ملیں تو اطلاع دیجیے گا۔ میرے پچھلے خط میں بہت سی باتیں جواب طلب تھیں۔ توجہ فرمائیے۔

کالم ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، مگر اب اس میں دل نہیں لگ رہا کیونکہ میرے دوسرے کام متاثر ہوئے ہیں۔ سوچا ہے کہ دسمبر کے آخر تک لکھوں گا، پھر معذرت کر لوں گا۔

یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کو لازماً مل جائے۔ باقی باتیں پھر کروں گا۔ ورنہ ڈاک کا وقت نکل جائے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
١٥ نومبر ١٩٧٧ء

WWW.KITAABISTAN.COM

١۔ یہ خط ڈاک میں ضائع ہو گیا۔

٢۔ انگلستان آنے سے پیشتر میں نے اپنی اہم کتابیں خواجہ صاحب کے ہاں رکھوا دی تھیں۔

٣۔ ''سفرنامہ اقبال'' اشاعت اول ١٩٧٣ء، مکتبہ معیار، کراچی۔

(۳)

برادرِ عزیز و مکرم و محترم! سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کی علمی مصروفیات کا احوال پڑھ کر دلی مسرت ہوئی ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ اب کے خط لکھنے میں مجھے تاخیر ہوگئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک آپ کا سفرنامہ پریس نہ چلا جائے میں خط نہیں لکھوں گا۔ لہٰذا میں نے دن رات ایک کر کے سارا کام مکمل کرلیا، اب یہ پریس میں ہے اور انشاءاللہ چندروز میں چھپ جائے گا۔ طباعت کے بعد ڈمی بنوا کر ٹائٹل کا ڈیزائن بنواؤں گا کیونکہ پہلے جو ڈیزائن بنوایا وہ دوسرے سائز کا تھا۔ کچھ دن جلد سازی میں لگیں گے۔

یہ سفرنامہ ۳۲۸ صفحات میں مکمل ہوا ہے۔ انتساب میں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نام کیا ہے تاکہ ان کو یاد کرنے کی صورت نکل آئے۔ دیباچہ میں نے بہت مختصر کر دیا ہے، خصوصاً آخری حصہ قطع و برید فرنگ سے متعلق حذف کر دیا ہے۔ اس کے باوجود یہ دس صفحات میں آیا ہے۔ وہ تمام صفحات دوبارہ لکھوا دیے جن کی کتابت آپ کو پسند نہیں آئی تھی۔ چھپنے پر ایک کاپی فوراً ہوائی ڈاک سے بھیج دوں گا اور باقی بحری جہاز سے۔ مطلع فرمائیے کہ آپ کو کتنی کاپیوں کی ضرورت ہوگی؟

یہاں پچھلے دنوں علامہ اقبال کے صد سالہ یومِ پیدائش کی بڑی دھوم رہی۔ اہلِ علم و ادب کا ہجوم لاہور میں تھا۔ کچھ لوگ کراچی بھی آئے، مثلاً علی سردار جعفری، آل احمد سرور، صباح الدین عبدالرحمٰن۔ والد صاحب (۱) قبلہ اکثر آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اقبال کانگریس کے سلسلے میں لاہور گئے تھے اور وہاں انھوں نے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔

آپ کے ڈاکٹر چچا جان (۲) کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

آپ نے اب تک کن پاکستانیوں سے ملاقات کی؟ کیا کبھی ابن انشا سے ملاقات ہوئی؟

آج دسمبر کی ۲۷ تاریخ ہے۔ سردی آنے کا نام ہی نہیں لیتی اور دوپہر کو تو پنکھا چلائے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا۔ میں حسبِ معمول اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء

۱۔ خواجہ عبدالوحید صاحب۔ ۲۔ ڈاکٹر نذیر محمد فاروقی مرحوم۔

(۴)

یار مہربان! تسلیمات۔

ڈاک کا نظام اتنا خراب ہے کہ میرے خط آپ کو دیر سے ملتے ہیں یا ملتے ہی نہیں اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں خط نہیں لکھتا، حالانکہ سب کام چھوڑ کر آپ کو خط لکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ احتیاطاً آپ کو رجسٹری سے خط لکھا وہ آپ کو ڈیڑھ مہینے بعد ملا۔ ڈاک کے نظام میں جو معشوقانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کی وضاحت کے لیے ایک دستاویزی ثبوت بھیج رہا ہوں۔ اس خط کے ساتھ آپ ایک تراشا ملاحظہ کریں گے۔ یہ آپ کے ایک لفافے کا ہے۔ آپ نے ۱۶، اکتوبر ۷۷ء کو جو خط لکھا تھا وہ مجھے جنوری کے مہینے میں ملا ہے۔ اس تراشے پر دو مہریں ہیں۔ ایک لندن کی ۱۷، اکتوبر ۷۷ء کی اور دوسری کراچی ۱۰ جنوری ۷۸ء کی۔ کراچی کی مہر پر ۱۰/۱ اور ۷۸ء واضح ہیں۔ جنوری کا لفظ نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنوری کے بعد کا مہینہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ثبوت اس لیے پیش کیا ہے تاکہ آپ کو یقین آ سکے کہ ڈاک کے نظام میں ہمارے سیاسی نظام سے زیادہ گڑبڑ ہے۔ آپ یہ خیال کبھی دل میں نہ لائیں کہ میں آپ کے معاملے میں کوتاہی قلم سے کام لوں گا۔ جب میں آپ کے ساتھ گھنٹوں باتوں میں مصروف رہ سکتا ہوں تو کیا خط لکھنے کے لیے چند منٹ نہیں نکال سکتا اور پھر یہ تو میرا اخلاقی فرض بھی ہے۔ ایک دوست جو ہزاروں میل دور خود عائد کردہ قید تنہائی کاٹ رہا ہو، اس کے مزاج پرسی میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔

سفرنامے کا قصہ یہ ہے کہ خدا خدا کر کے چھپ گیا ہے۔ آج کل نصابی کتابوں کی طباعت کا زور ہے۔ اول تو کوئی پریس کتاب لینے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ ایک راضی ہوا اور پندرہ دن کے وعدے پر لیکن اس نے پورا مہینہ لگا دیا۔ کل ہی طباعت مکمل ہوئی ہے اور کتاب جلد ساز کے یہاں پہنچ گئی ہے۔ ٹائٹل کا بلاک بنوا لیا ہے۔ جلد ساز چند روز میں ڈمی کاپی دے گا اور اس کے مطابق ٹائٹل چھپ جائے گا۔ اس دوران میں جلد سازی بھی مکمل ہو جائے گی اور اس طرح میں ایک فرض سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ ایک کاپی آپ کو فوراً ہوائی ڈاک سے بھیج دوں گا اور باقی سمندری ڈاک سے۔ ہوائی ڈاک سے زیادہ کاپیاں اس لیے نہ بھیجوں گا کہ ایک کاپی پر ڈاک کا خرچ تقریباً پچیس روپے آتا ہے۔

انشاء اللہ کتاب چھپتے ہی اس پر تبصرے بھی کروا دوں گا۔ آپ پردیس میں ہوں گے اور آپ کی دھوم یہاں ہوگی۔ اس کام پر جو وقت صرف ہوا ہے وہ میرے اندازے سے بہت زیادہ ہے۔ بہرحال آپ کی خوشی مقصود تھی اس لیے میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ مولانا مہر

WWW.KITABOSUNNAT.COM

والا کام بھی منظر عام پر آ جائے تو بہت اچھا ہو۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ نے کہا تھا کہ آپ لندن میں اس موضوع پر کام کریں گے۔ کیا آپ اب بھی اپنے ارادے پر قائم ہیں یا میں ہی موجودہ مسودے کی نظر ثانی کر ڈالوں (۱)۔

آپ نے اپنے گرامی نامے مورخہ ۱۷، اکتوبر میں ایک سفر نامے کا ذکر کیا ہے جو لاہور کے ایک شخص نے تبت کی سیاحت کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کتاب کی مجھے شدید ضرورت ہے۔ اگر آپ اپنی پہلی فرصت میں بھجوا سکیں تو کرم ہوگا۔ اگر یہ کتاب دستیاب نہ ہو تو کم از کم اس کے اردو متن کا فوٹو اور سرورق کی نقل بھجوا دیجیے۔ مگر بہت جلد۔

میرا ایک یہ کام بھی کیجیے کہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم والوں سے معلوم کیجیے کہ اگر کسی مخطوطے کا فوٹو منگوایا جائے تو کیا خرچ ہوگا، نیز مائیکرو فلم پر کیا لاگت آئے گی۔

ابن انشا کا انتقال میرے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ۲۸ برس کے تعلقات تھے۔ یہ شخص طرح دار یہاں سے ہنستا بولتا گیا تھا اور وہاں سے لکڑی کے صندوق میں بند ''کارگو'' کی صورت میں آیا۔ خدا مغفرت کرے۔ بہت اچھا آدمی تھا۔

ایک اور سانحہ بھی ہوا کہ پروفیسر محمد حسن عسکری کا انتقال ہو گیا۔ بڑے ادیب ہی نہیں بڑے آدمی بھی تھے۔ اسلامیہ کالج میں یہ میرے استاد تھے۔ گو میں نے ان کی کلاس میں کبھی شرکت نہیں کی لیکن ان کی تحریروں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ تین برس تک روزانہ ان سے سلام دعا ہوتی تھی۔

آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ جب بھی شام کے وقت میں اداس ہوتا ہوں تو آپ کا خیال ذہن میں آ جاتا ہے۔ آپ کے دل کش قہقہے فضا میں گونجنے لگتے ہیں۔ ۱۹، دسمبر کو خاص طور پر بہت یاد آئے۔ ۷۶ء میں یہ پورا دن آپ کے ساتھ گزارہ تھا۔ یہ دن اس لیے بھی یاد رہا کہ یہ میرا یوم پیدائش تھا۔

میرا کالم نویسی کا سلسلہ جاری ہے۔ البتہ یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کہ اب ہفتے میں صرف ایک بار لکھتا ہوں۔ اس سے زیادہ لکھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے (۲)۔

اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش پر یہاں بہت کچھ ہوا مگر کوئی کام کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یار لوگوں نے محض روپیہ کمانے کی خاطر پرانی شراب نئی بوتلوں میں پیش کر دی ہے۔

آپ کے چچا جان کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

سفر نامے کی طباعت پر اخراجات اندازے سے کہیں زیادہ آئے ہیں۔ کاغذ تو خیر پہلے کا موجود تھا،

WWW.KITABOSUNNAT.COM

صرف طباعت، جلد سازی اور ٹائٹل وغیرہ پر سات ہزار اٹھ گئے لیکن مجھے اس کا خیال نہیں۔ آپ کی خوش نودی کی خاطر مجھے سب کچھ منظور ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی ناشر مل جائے تو سفر نامہ اقبال (۳) کا دوسرا ایڈیشن چھپوا دیا جائے۔ آپ کو اگر فرصت ملے تو اس پر نظر ثانی کر ڈالیے۔ آپ اپنے خطوط میں ذرا تفصیل سے کام لیا کیجیے جس جس سے ملاقات ہوا کرے اس کا ذکر کیا کیجیے۔ ذرا یہ بتائیے کن کن نئے دوستوں سے دوستی ہوئی ہے۔ ہر ایک (کا) مفصل تعارف کرائیے۔ کیا کبھی رالف رسل سے ملاقات ہوئی ہے؟ اگر ہو تو میرا اسلام کہیے گا اور ان سے یہ بھی کہیے گا کہ مولوی عبدالحق سے اپنی ملاقاتوں کی روداد لکھ دیں یا پھر آپ ان سے پوچھ کر یہ روداد قلم بند کر لیجیے گا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی لائبریرین Simon Digby ہیں۔ بڑے دل چسپ آدمی ہیں۔ ۷۱ء میں پاکستان آئے تھے تو ان سے میری ملاقاتیں رہی تھیں۔ ان سے آپ ضرور ملیے۔ میرا اسلام کہیے گا۔

پاکستانیوں میں کس کس سے ملاقات ہوئی ہے؟ اگر آپ کو فرصت ملے تو ایک مضمون لکھیے ''ابن ا کے آخری ایام'' اس سلسلے میں پاکستانی سفارت خانے اور بی بی سی والوں سے آپ کو بہت مدد مل سکتی ہے۔

دیکھیے میں نے کتنا طویل خط لکھ ڈالا۔ اس وقت میں یہی تصور کر رہا ہوں کہ آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں باتیں کر رہا ہوں۔

ابھی کچھ دیر پہلے والد صاحب قبلہ سے مل کر آ رہا ہوں۔ آپ کا سلام انھیں پہنچا دیا ہے۔ وہ دعا کہہ رہے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

آپ کا
مشفق خواجہ

۲۸ جنوری ۱۹۷۸ء

پس نوشت : اور ہاں اگر کوئی ''خاص'' آدمی دوست بنا ہو تو اس کا حال لکھیے اور ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجیے تا کہ آپ کے ذوق نظر کی داد دے سکوں۔

۱۔ ''نقوش مہر'' بعض موانع کے سبب شائع نہیں ہو سکی۔

۲۔ چند سطریں بہ وجوہ حذف کر دیں۔

۳۔ ''سفر نامہ اقبال'' کا دوسرا ایڈیشن ترامیم اور اضافوں کے بعد ۱۹۸۹ء میں ''مکتبہ اسلوب'' کراچی سے شائع ہوا تھا۔

(۵)

۳۔ڈی ۹/۲۶
ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

برادر مکرم و محترم! سلام مسنون۔

آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ ان میں سے ایک محبت نامہ تھا اور دوسرا قیامت نامہ۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے پہلے محبت نامہ کھول لیا ورنہ کہیں دوسرا لفافہ پہلے کھول لیتا تو پھر پہلا لفافہ کھولنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ بندہ پرور! اس بندۂ ناچیز پر ایسا بھی کیا ظلم۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں۔ میں تو سارے کام چھوڑ کر آپ کو خط لکھتا ہوں۔ اگر آپ پردیس میں ہیں تو میری حالت آپ سے زیادہ قابل رحم ہے کہ میں وطن میں غریب الوطن ہوں۔ جہاں کوئی ہم سخن اور ہم زبان نہ ہو، وہاں آدمی غریب الوطن ہی ہوتا ہے۔ میری وطنیت آپ کے دم سے تھی۔ آپ میرے ہم سخن تھے، ہم زبان تھے۔ آپ کے سوا کسی سے میل جول نہ تھا۔ اب آپ کو خط لکھتا ہوں تو یہ تصور کر لیتا ہوں کہ آپ سامنے بیٹھے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر کبھی میرا خط نہ ملے تو سمجھ لیجیے کہ خطا میری نہیں ڈاک والوں کی ہے۔ ہائے اگلے زمانے میں کیا عمدہ ڈاک کا نظام تھا، ہر منزل پر تازہ دم گھوڑے کھڑے رہتے تھے۔ پچھلی منزل کا ہرکارہ اگلی منزل کے ہرکارے کو خطوں کا پشتارہ تھما دیتا اور اس طرح خط ایک منزل سے دوسری منزل تک ہوتا ہوا منزل آخر تک پہنچ جاتا تھا۔ نہ ٹکٹ لگانے کا اور نہ ٹکٹ پر مہر لگوانے کا کھڑاک، نہ خط گم ہو جانے کا خطرہ۔ اب یہ حال ہے کہ دس روپے رکشے کے آنے جانے کے صرف کرو، تین روپے کا ٹکٹ لگاؤ اور پھر بھی یقین نہیں ہوتا کہ خط مکتوب الیہ تک ضرور پہنچے گا۔

آپ کا قیامت نامہ یعنی خفگی نامہ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے ہاں خفگی کا کم سے کم اظہار طلاق و عاق سے ہوتا ہے۔ گو آپ مجھے طلاق دے سکتے ہیں نہ عاق کر سکتے ہیں لیکن یہ تو لکھ سکتے ہیں:

"میں یہاں کے علمی حلقوں میں آپ کی دوستی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوں اور ادھر آپ نے خطوں کا جواب نہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کے غصے میں بھی محبت کا رنگ ہوتا ہے لیکن مزہ تو جب تھا کہ آپ پری وشوں کے حلقے میں بھی میرا ڈھنڈورا پیٹتے۔ بہر حال آپ وعدہ کیجیے کہ میرا خط نہ ملنے کی صورت میں آپ یہ ہرگز تصور نہیں کریں گے کہ میں کوتاہی قلم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

اچھا اب دوسری باتیں سنیے:

آپ کا سفرنامہ ابھی تک جلد ساز کی تحویل میں ہے۔ اس نے حتمی وعدہ ۲۰ فروری کا کیا ہے۔ ٹائٹل بھی چھپ رہا ہے۔ چار رنگوں کا ہے۔ اس کے لیے بہترین قسم کا آرٹ پیپر خرید کر پریس پہنچایا جا چکا ہے۔ کتاب ہر حالت میں آئندہ ہفتے تک مکمل ہو جائے گی۔ میں اس کے چھ نسخے اجمل صاحب کو بھیج دوں گا ایک ان کے لیے اور پانچ آپ کے لیے۔ یہ کہوں گا کہ پانچوں نسخے ہوائی ڈاک سے آپ کو بھیج دیے جائیں۔ مزید نسخوں کی ضرورت ہو تو لکھیے گا۔

معین الدین عقیل صاحب اور کشفی صاحبان کی کتابوں کا ایک ایک نسخہ اجمل صاحب کو پہنچا دیا ہے۔ امید ہے یہ دونوں کتابیں جلد ہی آپ کو مل جائیں گی (۱)۔ اب ذرا فرصت ملے گی تو مولانا مہر سے متعلق آپ کی کتاب کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کروں گا۔

میں نے اس مہینے سے کالم نگاری چھوڑ دی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کام میں ذہنی طور پر اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ دوسرا کوئی کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کی خاطر میں اپنے اصل کاموں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگرچہ اخبار والوں کا بے حد اصرار ہے کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں لیکن میرے لیے ممکن نہیں۔

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ۷ فروری کو یہاں سے واپس اپنے وطن چلے گئے۔ ۴ اور ۶ فروری کو ان سے دو طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ ان کے گھر پر اور دوسری مرتبہ پیر راشدی صاحب کے مکان پر۔ دونوں مرتبہ آپ بہت یاد آئے۔ گفتگو کچھ اتنی زیادہ علمی تھی کہ بارہا آپ کے اخلاقی و غیر اخلاقی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۰ فروری کو ڈاکٹر معین الدین عقیل کی شادی تھی۔ سہرا باندھ کر وہ ایسے نادم نظر آ رہے تھے کہ جیسے دولہا نہ ہوں نادم سیتاپوری ہوں۔ پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا جانے ان پر یا فریق ثانی پر یا دونوں پر کیا گزری۔ ڈاکٹر عقیل کی شادی میں نہ جانے پنجابی کی وہ رباعی یاد آتی رہی جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے زمانے کے صوفی جب نعرہ مارتے تھے تو سننے والے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ آج کل کے صوفی خود ہی نعرہ مارتے ہیں اور خود ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے ایک دن غالب لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر خیر رہا۔ کہنے لگے جانے سے پہلے ایک دن آئے تھے اور مجھے عزیز بھٹی پارک لے گئے تھے وہ بھی میری طرح آپ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا پتا یہ ہے:

A.6/13 4 ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

آپ فی الحال اتنا تو کر سکتے ہیں کہ سفرنامہ اقبال کی کتابت کی غلطیوں کی نشان دہی کر دیں اور ہاں آپ شاید یہ چاہتے تھے کہ فلسطین (۲) سے متعلق جو مضمون آپ نے لکھا تھا، وہ بھی اس میں شامل ہوگا۔ یہ باتیں میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر کبھی جی میں آیا تو اس کتاب کو دوبارہ چھپوانے کی کوشش کروں گا۔

رالف رسل صاحب سے میرا اسلام کہیے گا (۳)۔ وہ کراچی آئے تھے تو ان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ از راہ کرم انجمن تشریف لائے تھے۔ بابائے اردو سے متعلق ان کی گفتگو ضرور ''نوار بند'' کر لیجیے۔ آپ نے ''ٹیپ بند'' لکھا ہے۔ ایران میں اس کے لیے ''نوار بند'' کی اصطلاح رائج ہے۔ نوار وہی لفظ ہے جو پنجابی میں ''نواڑ'' کہلاتا ہے۔ وہ سفید پٹی جس سے پلنگ کا متن بنا جاتا ہے۔ (دیکھیے لفظ متن کا یہ کتنا عمدہ استعمال ہے)۔

آپ کے موضوع سے متعلق ایک کتاب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ یہاں نہیں ملتی، ورنہ یہ بھی اجمل صاحب کو بھجوا دیتا۔ اس کا نام ہے ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' یہ برٹش میوزیم میں ضروری ہوگی۔ آپ وہاں محمود صاحب سے ملیے۔ وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے۔ بہت اچھے آدمی ہیں (۴)۔

ایس ایم شاہ (۵) صاحب سے میرا اسلام بھی کہہ دیجیے۔ انھوں نے ایک کتاب کا عکس بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ دو تین سال سے یہ وعدہ وہ نبھائے چلے جا رہے تھے۔ اب یہ کتاب مجھے مل گئی ہے۔ انھوں نے خود تو وعدہ پورا نہیں کیا لیکن ان کی دعاؤں کے طفیل میرا کام ہو گیا۔ ان کا پی ایچ ڈی کا کام کس مرحلے پر ہے؟ لاہور کے ایک شخص نے تبت کا جو سفرنامہ لکھا تھا، وہ اپنی اولین فرصت میں بھجوا دیجیے۔ اگر کتاب دستیاب نہ ہو تو اس کا فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیجیے بلکہ یہی صورت بہتر ہوگی کیونکہ فوٹو اسٹیٹ سستا ہوتا ہے اور لندن میں تو اور بھی سستا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں یہ سفرنامہ بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ ریڈیو کے کام کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

آپ کے بھیجے ہوئے چند خوب صورت تصویری کارڈ مل گئے مگر میں آپ کے کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھنے کا مشتاق ہوں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کا سلام انھیں پہنچا دیا تھا وہ دعا لکھواتے ہیں۔

جب کبھی سوسائٹی جاتے ہوئے شہید ملت روڈ سے گزرتا ہوں اور ہل پارک کی طرف جانے والی سڑک پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار آپ یاد آ جاتے ہیں۔ ایک روز گلشن اقبال جاتے ہوئے سبزی منڈی کے پاس سے گزرا تو بھی آپ یاد آ گئے۔ اس شہر کے کئی راستوں پر آپ کی یادیں بچھی ہوئی ہیں۔ آپ اکثر یاد آتے ہیں اور سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ آپ مجھ سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی رہتا ہے کہ آپ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے وہاں گئے ہیں۔

آپ کا دوسرا سفرنامہ (۶) کس مرحلے میں ہے۔ اس کو بھی لکھ ڈالیے، ورنہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا بہت سی تفصیلات ذہن میں محو ہوتی جائیں گی۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔ شام کے چھ بج رہے ہیں۔ اس خط کو پوسٹ کرنے کے لیے میٹروپول ہوٹل کے ڈاک خانے جاؤں گا۔ دیکھیے اس ڈاک خانے کے نام پر بھی آپ یاد آ گئے۔ ڈاک خانے کے ساتھ ہی وہ ہوٹل شالیمار تھا جہاں ہم گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔

خدا کرے، آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۵ فروری ۱۹۷۸ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ "اردو شاعری کا تہذیبی و سیاسی پس منظر"۔ از ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی۔ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"۔ از ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ یہ ان حضرات کے ڈاکٹریٹ کے مقالے تھے۔

۲۔ "اقبال اور مسئلہ فلسطین"۔ "اقبال ریویو" جولائی ۱۹۶۹ء

۳۔ خواجہ صاحب کو رالف رسل کے بارے میں بہت خوش گمانی تھی۔ SOAS میں اردو کا لیکچرار تھا۔ بعد میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوا۔ کئی کتب کا مصنف اور مترجم ہے۔

۴۔ قاضی محمود الحق اس وقت برٹش میوزیم لائبریری کے شعبہ ترقی کے نگران تھے۔

۵۔ سید معین الدین شاہ۔

۶۔ "سفر آشوب" ۱۹۸۷ء میں "مکتبۂ اسلوب" کراچی سے شائع ہوئی۔

(۲)

برادر محترم و مکرم! سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ اس سے پہلے آپ کو دو خط لکھ چکا ہوں۔ امید ہے وہ آپ کو ملے ہوں گے۔ لاہوری سیاح کا سفر نامہ بھجوانے کا شکریہ۔

خدا خدا کر کے آپ کی کتاب کی طباعت مکمل ہو گئی۔ اس کے چھ نسخے اجمل صاحب کو بھجوا دیے ہیں۔ ایک ان کے لیے اور پانچ آپ کے لیے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ ایک نسخہ ہوائی ڈاک سے بھیج دیں۔ بتایئے آپ کو اور کتنے نسخوں کی ضرورت ہوگی؟ اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں جو پریشانی ہوئی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ کاتب، پریس، جلد ساز سبھی نے پریشان کیا۔ ان کے جھوٹے وعدوں کی وجہ سے بہت وقت ضائع ہوا۔ آمد و رفت کی دقتوں کے باوجود کم از کم پچاس مرتبہ شہر جانا پڑا۔ اب بہر حال ان تمام پریشانیوں کے مقابلے پر وہ خوشی زیادہ ہے جو اس کتاب کی طباعت سے حاصل ہوئی ہے۔ اجمل صاحب کو پچھلے دنوں ڈاکٹر کشفی اور عقیل صاحب کی کتابیں دے دی تھیں۔ وہ ان کی قیمت ادا کرنے پر مصر تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہیں۔ آئندہ بھی آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہوگی بھجوا دوں گا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی کتاب بھی مل جائے تو بھیج دوں۔

اب اس کتاب پر تبصرے کرانے کا مرحلہ شروع ہوگا۔

یہ خط ڈاک خانے سے لکھ رہا ہوں اس لیے تھوڑا لکھے کو بہت جانیے۔ اجازت دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۲۸ فروری ۱۹۷۸ء

بخدمت گرامی
جناب حمزہ فاروقی صاحب

(۷)

برادر مکرم و محترم ! سلام مسنون۔

کل آپ کا ۱۷ فروری کا خط ملا تھا اور آج ۲۲ فروری کا۔ اس سے پہلے تین خط لکھ چکا ہوں جو ۱۰/ ۱۵ اور ۲۸ فروری کو لکھے گئے تھے۔ خیال ہے کہ میرے خط اب تک آپ کو مل چکے ہوں گے۔

آپ کا ۲۲ فروری کا خط پڑھ کر مجھے دکھ ہوا(1)۔ اگر اس خط کو لکھنے کے بعد آپ دوبارہ پڑھتے تو شاید اسے پوسٹ نہ کرتے۔ آپ ہی انصاف کیجیے کہ ایک خط آپ ۱۷ کو پوسٹ کرتے ہیں اور صرف چار دن کے بعد آپ ۲۲ فروری کو دوسرا خط لکھ دیتے ہیں کہ میرے خط کا جواب نہیں آیا۔ چار دن تو آپ کا خط مجھ تک پہنچنے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ پھر بھلا میرا جواب آپ کو کیسے مل سکتا ہے؟

بہرحال آپ کچھ کریں۔ ترک مراسلت کریں یا ترک مراسم۔ اپنا کام تو محبت کرنا اور کیے جانا ہے۔ میں اس حمزہ فاروقی کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کے ساتھ میرا بہت سا وقت گزرا ہے۔

آپ کی کتاب کی طباعت مکمل ہو چکی ہے۔ چھ نسخے اجمل صاحب کو بھجوا دیے ہیں۔ ان میں سے پانچ وہ آپ کو بھیج دیں گے۔ مزید نسخوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی بھیج دوں گا۔ میرا خیال تھا کہ اس موقع پر آپ کی طرف سے جو خط آئے گا اسے پڑھ کر میں خوش ہوں گا لیکن افسوس کہ جو خط آیا ہے، اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کے مصنفی و تالیفی کاموں میں ''ناخواندہ مہمان'' بننے کی کوشش کی۔

بہرحال میری دعا ہے کہ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اگر کسی دوست کی دل آزاری سے آپ کو خوشی مل سکتی ہے تو خدا اس کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

مجھے معلوم نہیں کہ آپ آئندہ خط لکھیں گے یا نہیں لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی محبت ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ میں حسب سابق آپ کی صحت و شادمانی اور ترقی و کامیابی کے لیے دعاگو رہوں گا۔

آپ کا مخلص
شفیق خواجہ
۲ مارچ ۱۹۷۸ء

WWW.KITABOSUNNAT.COM

مجھے اپنی کتاب کا شدت سے انتظار تھا۔ کالم اضطراب میں، میں نے جو خط لکھا وہ خواجہ صاحب کی دل آزاری کا موجب بنا۔

(٨)

برادر مکرم و محترم! سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب آپ مجھ سے خوش ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب کسی معاملے میں آپ کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ کا مزاج بھی آسمان کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ کاش آپ کی طبیعت میں زمین کا سا دھیما پن ہوتا جو گردش میں بھی رہتی ہے اور کسی کو اس کی گردش کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگائیے کہ آپ کم از کم ایک آدمی کو یعنی راقم الحروف کو خوش رکھیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔

خدا کا شکر ہے کتاب آپ کو پسند آئی۔ یہاں بھی اسے پسند کیا گیا ہے۔ دو تین اخباروں میں تبصرے آ چکے ہیں اور اس مہینے میں کئی اور تبصرے آ جائیں گے۔ یہ سب میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ میرا دیباچہ بھی لوگوں نے پسند کیا ہے۔ ''آہنگ'' والوں نے تو اسے چھاپ بھی دیا ہے۔ میں نے آپ کی خواہش پر دیباچہ لکھا تھا، آپ کو پسند آیا تو یہی میری محنت کا صلہ ہے۔

کتاب یہاں کے تمام اہم ادیبوں کو بھیجی گئی ہے۔ ہندوستان کے بھی کئی لوگوں کو روانہ کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں لوگوں کے جو تاثرات ہوں گے ان سے بھی آپ کو مطلع کروں گا۔

میں نے اجمل صاحب کو کتاب کے ٢١ نسخے بھیجے تھے۔ انھیں فون کر دوں گا کہ وہ آپ کو مزید ١٥ نسخے بھیج دیں۔ انھیں ضرورت ہوگی تو اور دے دوں گا۔ ہاں غالب کا شعر، گلزار میں آوے، اسی طرح درست ہے جس طرح کتاب میں چھپا ہے۔ آپ کے مسودے میں غلط تھا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کتاب کے سلسلے میں دوستوں کو دعوت دی اور اس میں انگریز لڑکیاں بھی شریک ہوئیں۔ یہ لڑکیاں آپ کی دعوتوں ہی میں شریک ہوئی ہیں یا غموں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔

میں بھی یہاں آپ کی طرف سے دوستوں کو دعوت دینے کی سوچ رہا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ لڑکیاں کہاں سے آئیں گی؟ چلیے لڑکیوں اور آپ کے بغیر ہی سہی۔ جب غائبانہ نماز جنازہ ہو سکتی ہے تو غائبانہ دعوت کیوں نہیں ہو سکتی۔

کیا آپ لندن کے کتب فروشوں کی دکانوں پر جاتے ہیں۔ اگر آپ کی عنایت سے کتابوں کی فہرستیں مل جایا کریں تو بہت اچھا ہو۔ کتابیں نہیں تو کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۶ اپریل ۱۹۷۸ء

WWW.KITAABISTAN.COM

(۹)

ادر مکرم و محترم! سلام مسنون۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۴ اپریل چند روز قبل مل گیا تھا۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ لاہور سے ایک دوست آ گئے تھے۔ وہ میرے ہی مہمان تھے لہٰذا سارا وقت مہمان نوازی میں گزرا۔ آج صبح وہ روانہ ہوئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ محترم اجمل صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی۔ مولانا مہر سے متعلق تمام کاغذات میں انھیں بھیج دوں گا اور وہ ان کا فوٹو اسٹیٹ بنوا کر آپ کو ارسال کر دیں گے۔ انھوں نے کتاب کے مزید دس نسخے طلب فرمائے ہیں، وہ بھی بھیج دوں گا۔ کتاب پر تبصرے اب تک تین آئے ہیں؛ جنگ، جسارت اور مساوات میں مزید تبصرے عنقریب شائع ہوں گے۔ یہ سب ایک ساتھ بھیج دوں گا۔ ویسے یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اہل قلم کو بھیجی گئی ہے۔ تاکہ ادبی حلقوں میں اس کا تعارف ہو جائے۔ وقار احمد رضوی اور منیر فاروقی کو بھی ایک ایک نسخہ دے دیا ہے، محض آپ کی یاد دلانے کے لیے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن سے فون پر آپ کے متعلق گفتگو ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر بہت محبت اور شفقت سے کر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی ایک نسخہ ایک صاحب کو دے دیا ہے کہ پہنچا دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا دیباچہ آپ کے دوستوں نے پسند کیا۔ اس کا افسوس ہے کہ مکمل دیباچہ شامل کتاب نہ ہو سکا۔ ایک صفحے کی خاطر ایک پوری کاپی بڑھانی پڑتی۔ اخراجات خواہ مخواہ بڑھتے۔ کل میں نے ہندوستان کے ایک رسالے میں آپ کی کتاب ''سفر نامہ اقبال'' کا اشتہار پڑھا۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب وہاں کے کسی ناشر نے چھاپ لی ہے۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی کتاب اہل ہندوستان کے لیے بھی مفید ہے۔ وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کا نام کسی حد تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اب اس کتاب سے مزید تعارف ہو جائے گا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ غالب کا شعر اسی صورت میں درست ہے جس صورت میں آپ کی کتاب کے ص ۱۲۹ پر چھپا ہے۔ ''قد دل کش'' غالب نے نہیں لکھا، یہ آپ کی اختراع ہے۔ دیوان غالب دیکھ لیجیے اس میں ''قد دلجو'' ہی ہے۔

آپ کی کتاب کے سلسلے میں جو تقریب ہوئی تھی اس کی تصویریں ضرور بھیجیے[1] میں ان تصویروں کو دیکھ کر سمجھوں گا کہ میں بھی حاضر تھا وہاں۔ رالف رسل صاحب کا مشورہ صائب ہے۔ آپ کو مولانا مہر پر کام ضرور کرنا چاہیے۔ وہاں آپ کو ان کی تمام کتابیں مل جائیں گی۔

---

[1] کتاب ملنے پر میں نے لندن کے ''دیوانہ'' ریستوران میں اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کی دعوت کی تھی۔

والد صاحب قبلہ آپ کی خیریت اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ آپ کا سلام میں باقاعدگی سے ان تک پہنچا دیتا ہوں۔

میں حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔ کالم نگاری میں نے چھوڑ دی تھی لیکن ان لوگوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ جن دو مہینوں میں کالم نگاری نہیں کی ان کی تنخواہ بھی زبردستی دے گئے۔ آخر مجبور ہو کر ہفتے میں ایک دن لکھنے کی حامی بھری ہے۔ اب تک تین کالم چھپ چکے ہیں، چوتھا کل چھپے گا۔

آج کل یہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ خدا کرے آپ خوش و خرم اور صحت یاب ہوں۔

ایس ایم شاہ صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

آپ کی خیریت کا طالب
مشفق خواجہ
۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء

WWW.KITAABISTAN.COM

(۱۰)

۳ ڈی ۹/۲۶ ناظم آباد
کراچی ۱۸

برادر مکرم و عزیز! سلام مسنون۔

اب کے تو واقعی مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی۔ کوئی مہینہ بھر سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ اول تو کراچی میں قیام کا موقع بہت کم ملا۔ دوسرے جتنے دن بھی کراچی میں رہا دندان شکنی کے عذاب میں مبتلا رہا۔ امید ہے اس صورت حال کے پیش نظر آپ میری کوتاہی کو نظر انداز کر دیں گے۔ آپ کی کتاب پر اب تک متعدد تبصرے آ چکے ہیں: جنگ، حریت، پاکستان ٹائمز، جسارت، آہنگ، قومی زبان وغیرہ میں۔ آہنگ اور قومی زبان کے تبصرے ارسال ہیں۔ باقی آئندہ خط کے ساتھ بھیجوں گا۔ نصر اللہ خاں نے ایک کالم میں آپ کا ذکر کیا تھا، وہ بھی ارسال ہے۔ جنگ کا تبصرہ کسی جاہل مطلق نے لکھا تھا اس لیے اس کا ذکر ہی کیا۔

پاکستان ٹائمز میں لاہور کے کسی ناخلف کا تبصرہ تھا۔ یہ شخص لاہور کے سفر نامہ نویسوں کا تابع مہمل معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا خیال ہے کہ افسانوی انداز کے بغیر سفر نامہ لکھنا بے معنی ہے۔ یہ تبصرہ میں حاصل کر کے بھیجوں گا کیونکہ اخبار مذکور میرے پاس نہیں آتا۔ بہر حال اس قسم کے تبصروں کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں تبصرہ نگار بغیر پڑھے تبصرہ کرتے ہیں اور اپنی علمیت کے اظہار کے لیے مخالفانہ انداز اختیار کرتے ہیں(۱)۔

آپ کا عنایت کردہ سفر نامہ تبت مل گیا۔ بہت دیر میں ملا۔ اگر کوئی لندن سے پیدل چل کر آتا تو شاید وہ اس سے پہلے یہاں پہنچ جاتا۔ اس کرم کا بے حد شکریہ۔ اس سلسلے میں ایک زحمت دوں گا کہ ص ۴۰ اور ص ۴۱ کا عکس نہیں ہے۔ ذرا اصل کتاب ملاحظہ کر کے بتائیے کہ کیا سبب ہے۔ اگر غلطی سے عکس نہ بن سکا تو آپ بجھوا دیجیے۔ مزید کرم ہوگا(۲)۔

آپ نے لکھا ہے کہ ستمبر میں مقالہ پیش کرنا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟ کیا پاکستان آنے کا پروگرام ہے(۳)۔

سفر نامہ اقبال کے ہندوستانی ایڈیشن کے لیے میں نے ہندوستان کے ایک دوست کو خط لکھ دیا ہے، جونہی آئے گا آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

WWW.KITAABISTAN.COM

کیا مولانا مہر سے متعلق کاغذات آپ کو مل گئے؟ یہاں آج کل سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ پچھلے دنوں میں سندھ گیا تھا، وہاں تو ایسی گرمی تھی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کیا آپ اپنا روزنامچہ لکھتے ہیں۔ اگر نہ لکھتے ہوں تو اب شروع کر دیجیے۔ یہ بہت ضروری کام ہے۔

میں اپنے چند کالم عنقریب آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ یہ لفافہ تبصروں کے بوجھ سے بھاری ہو رہا ہے۔ آئندہ لفافے میں کالم ہوں گے۔ ہاں ''آہنگ'' کا تبصرہ مجھے واپس کر دیجیے گا۔ اس کے بعض اقتباسات کسی دوسری جگہ استعمال کروں گا۔ ویسے آپ کی کتاب کی یہاں خاصی شہرت ہوئی ہے لیکن افسوس کہ بکری نہ ہونے کے برابر ہے۔

خدا کرے، آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ

۶۔ جون ۱۹۷۸ء

بخدمت گرامی جناب حمزہ فاروقی،
لندن۔

۱۔ ''پاکستان ٹائمز'' کا وہ شمارہ جس میں معاندانہ تبصرہ چھپا تھا، لندن میں میرے ساتھیوں کے ہاتھ لگا۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے اسے اپنے اور لوگوں کے سامنے بہ آواز بلند پڑھا اور میرے ردِّعمل کے منتظر رہے۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میرے سفرنامے میں اس سے کہیں زیادہ غلطیاں تھیں لیکن بہتر ہوتا کہ آپ کی سنائی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے خود اسے پڑھتے اور غلطیوں کی نشان دہی کرتے۔

۲۔ یہ صفحات خالی تھے۔

۳۔ SOAS میں ایم اے کے ایک پرچے میں امتحان کے بجائے مختصر مقالہ پیش کیا جاتا تھا۔

(۱۱)

برادرِ عزیز و مکرم! سلام مسنون ۔

ابھی ابھی گرامی نامہ ملا اور میں فوراً خط لکھنے بیٹھ گیا۔ گو اب کے آپ کا آنا، جانے کی تمہید تھا۔ تاہم اس مرتبہ آپ سے جو ملاقاتیں ہوئیں وہ پہلے کی ملاقاتوں کی نسبت کہیں زیادہ متاثر کن تھیں۔ ملاقاتیں زیادہ بھی ہوئیں اور دلچسپ بھی اور آپ کو قریب سے دیکھنے کے بہتر مواقع ملے۔ آپ میں چند تبدیلیاں بھی آئی ہیں جو خاصی خوشگوار ہیں۔ پہلی تبدیلی تو یہ ہے کہ آپ میں لوگوں کے ساتھ Adjust (1) کرنے کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ علامہ شاہ جہاں پوری کے ساتھ آپ بہت خلوص سے ملے۔ دوسری خوبی آپ میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ آپ کی حسِ مزاح پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ اب آپ مزاح پیدا کرنے کے لیے دوسروں کی دل آزاری کا سامان نہیں بنتے۔ پہلے آپ کا انداز قدرے جارحانہ ہوتا تھا۔ اب اس جارحیت کی جگہ دل کش شائستگی نے لے لی ہے۔ تیسری صفت آپ میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ علمی معاملات میں آپ پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اب یہ سب لوگ ڈاکٹر عقیل اور اظہر حقی وغیرہ آپ کی تعریف پہلے سے کہیں زیادہ کر رہے تھے اور اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ سے زیادہ ملاقاتوں کے مواقع نہیں ملے (۲)۔

آپ کے ساتھ میرا جو وقت گزرا، اسے میں نعمتوں میں شمار کرتا ہوں۔ آپ کے تجربات و مشاہدات میرے علم میں اضافے کا باعث ہوئے۔ البتہ اس کا افسوس رہا کہ میں آپ کی ڈائری سے بھرپور استفادہ نہ کر سکا۔ اس میں قصور آپ کا ہے۔ آپ نے ڈائری ایسے وقت میں دی جب کہ آپ پا بہ رکاب تھے اور میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنے کم وقت میں اس ہفت خواں کو طے کرتا۔

آپ کا شکریہ کہ رالف رسل کو کتاب آپ نے پہنچا دی۔ باقی لوگوں تک بھی پہنچا دیجیے۔ افتخار عارف کو تو پوسٹ کر دیجیے۔ ہاں دو ایک نسخے کسی دکان پر رکھوانا نہ بھولیے گا۔ کیا میں بحری ڈاک سے چند اور نسخے بھیج دوں؟

بوڈلین لائبریری سے شاہ قدرت کے دیوان کی فوٹو اسٹیٹ کی اشد ضرورت ہے۔ یقین کیجیے کہ اس کے بغیر میرا کام رکا ہوا ہے۔ میں تو ہر لمحے ڈاکیے کا منتظر رہتا تھا کہ اب فوٹو اسٹیٹ آئی اور اب آئی۔ آپ ایسا کیجیے کہ انڈیا آفس یا برٹش میوزیم کے لائبریرین سے بات کیجیے۔ وہ ضرور منگوا دیں گے۔ یا پھر آپ انھیں براہِ راست خط لکھیے۔ یہ کام انتہائی ضروری ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اگر یہ فوٹو اسٹیٹ نہ آئی تو میرا کام رکا رہے

گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایس ایم شاہ صاحب سے مشورہ کر لیجیے۔ شاید وہ یہ مسئلہ حل کرنے میں مدد کر سکیں (۳)۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آپ کی حاضری باعث رشک ہے۔ خدا آپ کو ایسے مواقع مزید عطا فرمائے (۴)۔

بھئی وہ فلمیں تو اب کے پھر حسب معمول سادہ اوراق تھیں۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ محنت بھی ضائع ہوئی اور پیسے بھی۔ اب کے میں بھی آپ کے نقش قدم پر چلا۔ یعنی میرے کیمرے کی فلم چلی ہی نہیں۔

ابھی ''جسارت'' میں آپ کی روانگی کی خبر شائع ہوئی ہے۔ انٹرویو انشاء اللہ ایک آدھ ہفتے بعد شائع ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے میری بات ہوئی تھی، ان سے میں نے تبصرہ لکھنے کا تقاضا کیا ہے۔ وہ جلد لکھ کر دیں گے۔

میری کتاب جو لاہور سے چھپ رہی ہے۔ اس کے ساڑھے سات سو صفحات چھپ کر آ چکے ہیں۔ یہ اگلے ماہ تک مکمل ہو جائے گی (۵)۔

۲۳ نومبر کو سعید صاحب کی شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ ان کا خط آیا ہے جس میں آپ کی بہت تعریف لکھی ہے اور اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اس سے پہلے آپ سے زیادہ قریب رہنے کا موقع کیوں نہ ملا۔

کبھی موقع ملے تو میری کتاب پڑھ ڈالیے۔ یہ شاعری کیا ہے، دشت تنہائی کا سفر ہے۔ آپ کے موجودہ حالات میں یہ کتاب آپ کا خوب ساتھ دے گی (۶)۔

آپ کے مقالے کا معاملہ کس حد تک آگے بڑھا ہے؟ آپ پریشان نہ ہوں، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ جیسے صاحبان علم تو اپنے علم کی زکوٰۃ دے ڈالیں تو ایسے کئی مقالے تیار ہو سکتے ہیں۔

۱۔ adjust کو اردو میں ڈھالنا کہتے ہیں۔

۲۔ کراچی میں میرا قیام ۲۱ جولائی سے ۲۷ ستمبر ۱۹۷۸ء تک رہا تھا۔

۳۔ ''دیوان قدرت'' کا قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ کے شعبہ علوم شرقی میں پایا جاتا تھا۔ اس کا حوالہ درج ذیل ہے:

MS. ELLIOTT 285; folios 209 v-256R

۴۔ میں نے ۲۷ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء کا وقفہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بسر کیا تھا۔

۵۔ جائزہ مخطوطات اردو۔

۶۔ یہ خواجہ صاحب کا شعری مجموعہ ''ابیات'' تھا۔

والدصاحب قبلہ خیریت سے ہیں اور آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔

خدا کرے آپ خوش و خرم ہوں۔

بخدمت گرامی

جناب محمد حمزہ فاروقی

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء

(۱۲)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون ۔

ابھی ابھی آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے ۔ جی خوش ہوا کہ آپ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں ۔ اس کے جواب میں دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں ۔ خدا آپ کو یہاں اور وہاں دونوں جگہ خوش رکھے (یہاں مراد پاکستان اور وہاں سے انگلستان) ۔

آپ یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے ہیں ۔ میرے چھوٹے بھائی طارق نے ”بڑی بی ہوٹل“ کے پیچھے فلیٹ لے لیا ہے، اس لیے اب اکثر اس طرف جانا ہوتا ہے تو ہوٹل پر نظر پڑتے ہی آپ یاد آ جاتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی یادوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ آپ یہاں تھے تو دنیا سے میرا رابطہ قائم تھا اور اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ترک دنیا کی منزل کے بعد ترک ترک کے مرحلے سے گزر رہا ہوں ۔

آپ کے بارے میں ”جسارت“ میں جو خبر چھپی تھی، اس کا تراشہ بھیج رہا ہوں ۔ انٹرویو ابھی نہیں چھپا ۔ جلد ہی چھپ جائے گا اور فوراً بھجوا دوں گا ۔

سلیم الدین قریشی صاحب سے آپ کی رشتہ داری کی خبر سن کر کم از کم مجھے تو خوشی ہوئی ۔ ان صاحب کے مضامین جو کتاب میں چھپتے رہتے ہیں، میری نظر سے گزرے ہیں ۔ یہ مفید کام کر رہے ہیں ۔ انھوں نے آپ کو انڈیا آفس کے جو کیٹلاگ دکھائے تھے، ان کے نام اور قیمتیں لکھ بھیجئے پھر فیصلہ کروں گا کہ کون سا خریدنا چاہیے ۔

قریشی صاحب سے بھی معلوم کیجیے کہ بلوم ہارٹ کا اردو مخطوطات کا جو کیٹلاگ ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا، اس کے بعد بھی کوئی کیٹلاگ اردو کا چھپا کہ نہیں ۔ اگر نہیں تو کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ جن مخطوطات کا حوالہ مذکورہ کیٹلاگ میں نہیں ہے، ان کے نام کیا ہیں؟ کیا ان کی کوئی Hand List موجود ہے؟

حیرت ہے کہ قریشی صاحب نے بوڈلین لائبریری کے ایک مخطوطے کا عکس حاصل کر کے دینے سے معذوری کا اظہار کیا ہے ۔ انگلستان کی لائبریریاں تو اس سلسلے میں عام لوگوں سے تعاون کرتی ہیں اور قریشی صاحب تو اس میدان کے خاص الخاص آدمی ہیں ۔ بہر حال اس مخطوطے کی وجہ سے میرا کام رکا ہوا ہے ۔ اگر ادبی کاموں کے کرنے سے ثواب اور نہ کرنے سے گناہ ہوتا ہے تو میں یہ کہتا کہ آپ میرے کام میں تاخیر کر کے خواہ مخواہ گناہ گار ہو رہے ہیں ۔ ہمت کر کے آپ قریشی صاحب کے مشورے سے بوڈلین لائبریری والوں کو ایک خط لکھ بھیجئے مجھے یقین ہے کہ وہ ڈاک سے آپ کو فوٹو اسٹیٹ بھیج دیں گے(1) ۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اس وقت تک میری کتاب کے ۹۴۴ صفحات چھپ چکے ہیں۔ باقی تین سو بھی چند روز میں چھپ جائیں گے اور پھر میں آپ کی خدمت میں سب سے پہلے یہ کتاب روانہ کروں گا۔

پرسوں مولانا عبدالعزیز میمن کا انتقال ہوگیا۔ یہ علمی دنیا کا بہت بڑا نقصان ہے۔ خدا مغفرت کرے۔

کل غالب لائبریری میں ممتاز حسن مرحوم کی برسی پر ایک جلسہ ہوا۔ آپ بہت یاد آئے۔ ساتھ ہی وہ سب ملاقاتیں بھی یاد آئیں جن میں آپ بھی شریک تھے۔ ممتاز حسن صاحب جیسے لوگ ہمارے معاشرے میں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ واقعی عظیم انسان تھے۔ میں نے ایسا علم دوست اور انسان دوست انسان دوسرا نہیں دیکھا۔ میری مرتبہ کتاب ''اقبال از احمد دین'' انجمن کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کا انتساب میں نے ممتاز حسن صاحب ہی کے نام کیا ہے اور کسی کا یہ شعر لکھا ہے:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

کل ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے مذکورہ جلسے میں ممتاز حسن مرحوم کے بارے میں ایک مختصر لیکن اچھا مضمون پڑھا تھا۔ جلسے کے بعد آپ کا ذکر کرتے رہے۔ خیریت پوچھتے رہے۔ تبصرے کا وعدہ میں نے یاد دلایا۔ انھوں نے فرمایا کہ جلد ہی لکھ دیں گے۔

سعید صاحب کے نام کا خط انھیں پوسٹ کر دیا ہے۔ باقی سب لوگ خیریت سے ہیں۔ اظہر حقی صاحب آئندہ مہینے میں والد بن جائیں گے۔

کبھی کتابوں کی دکان پر جانا ہو تو دیکھیے گا کہ پیپر بیک میں کسی کی کوئی Autobiography شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے دل چسپی ایسے لوگوں کی خود نوشتوں سے ہے جو ہندوستان سے متعلق رہے ہوں، لیکن یہ فرصت کا کام ہے۔ جب کبھی آپ کو فرصت ہو تو۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ شام کو جاؤں گا اور آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ اگر مولانا حسن مثنیٰ صاحب ابھی تک وہاں موجود ہوں تو میرا سلام کہیے (۲)۔

آپ کا
مشفق خواجہ

۲۶ اکتوبر ۱۹۷۸ء

ضروری:

آپ نے جو تصویریں دی تھیں، وہ اچھی نہیں ہیں۔ ایک اچھی تصویر جو چکنے کاغذ پر ہو، بھیجے تا کہ تصویر چھپے تو لوگوں پر رعب پڑے۔

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ کسی مخطوطے کی عکسی نقل کا حصول اس قدر آسان نہ تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے براہ راست بوڈلین لائبریری کو خط لکھا تھا۔

۲۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی موتمر عالم اسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کی دعوت پر روس گئے تھے۔ وہاں آپ
نے تاشقند، سمرقند، بخارا، بحریہ خواجہ، لینن گراڈ اور ماسکو کا دورہ کیا تھا اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں لندن تشریف لائے۔ آپ نے ڈاکٹر خالد
حسن قادری کے ہاں قیام کیا تھا۔

(۱۳)

برادرِ عزیز و مکرم ! سلام مسنون۔

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے مقالے کی تدوین میں شب و روز مشغول ہیں۔ آپ کو ایسے ہی کاموں میں مشغول رہنا چاہیے اور یہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔

ایک تشویش ناک خبر یہ ہے کہ جناب بشیر احمد ڈار شدید بیمار ہیں۔ تین روز ہوئے ان کے صاحب زادے کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ دو مہینے سے ڈار صاحب نے لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ رکھا ہے اس لیے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ایکسرے میں پھیپھڑے پر ایک دھبا سا نظر آیا ہے جس کا بنا پر کینسر یا ٹی بی کا خدشہ ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ ڈار صاحب کا دم غنیمت ہے۔ دعا کیجیے کہ وہ صحت یاب ہو جائیں اور تادیر سلامت رہ کر علم کی خدمت کریں۔ میں نے جب سے ڈار صاحب کی تشویش ناک حالت کی خبر سنی ہے، طبیعت سخت بے چین ہے۔ آپ ڈار صاحب کو مزاج پرسی کا خط ضرور لکھیے۔ ان کا پتا یہ ہے۔ ۳۳۵ شاد باغ، لاہور۔

آپ کو جس مخطوطے کے عکس کے لیے کہا تھا، اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میرا کام رکا ہوا ہے۔ جس طرح بھی ہو، اسے حاصل کیجیے۔ آپ نے لکھا ہے کہ نومبر کے آخر تک آپ کے مقالے کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ مذکورہ عکس کی فراہمی پر توجہ دیجیے۔ یہ اتنا آسان کام ہے کہ آپ جیسے مستعد اور فعال انسان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس علمی کام میں تعاون کر کے ثواب حاصل کریں گے اور یہ بھی یاد رہے کہ علمی کاموں میں تاخیر کا سبب بننے کا گناہ ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اس گناہ سے محفوظ رکھے۔

آپ کا انٹرویو میں کب کا لکھ کر انھیں دے چکا ہوں مگر اخبار والوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اکثر یاد کراتا رہتا ہوں۔ اب توقع ہے کہ جلد چھپ جائے گا۔ میرا کیمرا خوب کام کر رہا ہے۔ یہ شوق بہت مہنگا ہے اس لیے کم تصویریں اتاری ہیں لیکن بہت اچھی۔

سب لوگ خیریت سے ہیں۔ والد صاحب قبلہ آپ کو سلام لکھواتے ہیں۔ آپ کی بھابھی بھی سلام لکھوا رہی ہیں۔

خدا کرے آپ ہر طرح سے خیریت سے ہوں۔

میری کتاب کس کس کو دے دی؟ مولانا حسن مثنیٰ کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

آپ کا
مشفق خواجہ

۲۶ نومبر ۱۹۷۸ء

WWW.KITAABISTAN.COM

(۱۴)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون ۔

گرامی نامہ مورخہ یکم دسمبر آج ہی موصول ہوا ہے۔ اتنی تاخیر شاید محرم کی تعطیلات کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں بھی گزشتہ ماہ کی آخری تاریخوں میں ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، جو امید ہے مل چکا ہوگا۔

خوشی کی بات ہے کہ بوڈلین لائبریری کو جو آپ نے خط لکھا تھا، اس کا جواب آ ہی گیا۔ آپ نے حساب لکھا ہے، وہ میرے ناقص خیال میں درست نہیں ہے۔ خط میں لکھا ہے کہ سلور پرنٹ کا رخ 16P برائے ایک پرنٹ ہے۔ مخطوطے کے جو فولیو مجھے درکار ہیں ان کی تعداد ۴۸ ہے۔ فولیو دو صفحوں کا ہوتا ہے اور عام طور پر ایک پرنٹ میں دو صفحے آتے ہیں۔ اگر ایک پرنٹ میں ایک ہی صفحہ مانا جائے تو تب بھی اجرت 16×96=1536 پنس ہوتی ہے۔ اب آپ اس کے پونڈ خود ہی بنا لیجیے۔ میرے حساب سے تو کل خرچ کسی طرح بھی سات پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک پرنٹ میں دو صفحے آ گئے تو اجرت ساڑھے تین پونڈ ہوگی۔ بہر حال آپ اس سلسلے میں مزید تحقیق فرما لیں(۱) ۔

سلور پرنٹ چونکہ سستا ہے اس لیے مجھے یہی حاصل کرنا ہے۔ آپ اسی کے حاصل کرنے کے لیے لائبریری کو لکھ دیجیے۔

ایک مرتبہ پھر آپ یہ بات جان لیجیے کہ مخطوطے کے جو صفحات نمبر لکھے ہیں، مجھے اس کے مطابق صرف ۴۸ اوراق کی ضرورت ہے۔ شاید آپ نے پورے مخطوطے کا حساب لگا لیا ہے۔

اب ایک چھوٹی سی گزارش ہے۔ آپ کی طرف میرے چھ سو روپے واجب ہیں۔ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ میں رقم یہاں ادا نہیں کر سکتا۔ لندن سے آپ کو مطلوبہ چیز یا چیزیں اسی رقم کے برابر بھیج دوں گا۔ میں نے عرض کیا تھا، ٹھیک ہے مجھے بعض کتابوں یا فوٹو اسٹیٹ کی ضرورت ہوگی، اس میں رقم منہا ہو جائے گی۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ میں فوٹو اسٹیٹ کی اجرت کا انتظام کر دوں! اس سادگی کی داد میں ہی دے سکتا ہوں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

اب کے تو آپ کو جو زحمت دی ہے سو دی ہے، آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ حالانکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک بہت ضروری کتاب منگوانی ہے، اس کے لیے بھی آپ کو لکھوں گا لیکن اب ہمت نہیں پڑتی۔

بہر حال جس طرح بھی ممکن ہو، مذکورہ مخطوطے کا سلور پرنٹ حاصل کر کے مجھے ایر میل سے پوسٹ کر دیجیے۔ اگر آپ کو اس پر بھی اصرار ہو تو میں جملہ اخراجات یہاں پر آپ کے بہنوئی صاحب کو ادا کر دوں

WWW.KITABOSUNNAT.COM

گا۔ چونکہ میری ضرورت شدید ہے اور میرا کام رکا ہوا ہے اس لیے میں مذکورہ سلور پرنٹ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ اگر ان تمام وضاحتوں کے باوجود آپ کی مالی حالت اجازت نہ دیتی ہو تو ازراہ کرم بواپسی ڈاک مطلع فرمائیے۔ میں کوئی اور انتظام کرنے کی کوشش کروں گا(۲)۔

اور سنائیے کیا حالات ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یکم جنوری سے قبل آپ مقالہ مکمل کرلیں گے۔ مجھے امید ہے یہ مقالہ ہر اعتبار سے معیاری اور آپ کے شایان شان ہوگا(۳)۔

لندن میں خوب سردی پڑ رہی ہے اور یہاں سردی آئی ہی نہیں۔ دن بھر گرمی رہتی ہے اور رات کو قدرے خنکی ہو جاتی ہے۔

پچھلے خط میں میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ جناب بشیر احمد ڈار صاحب شدید بیمار ہیں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں اور سلام لکھواتے ہیں۔ باقی باتیں سابقہ خط اور اس خط کا جواب آنے پر لکھوں گا۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۲ دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۔ خواجہ صاحب کے ذہن میں پرانے زمانے کے پونڈ کا تصور تھا۔ جب ۱۲ پنس کا ایک شلنگ اور ۲۰ شلنگ کا پونڈ تھا۔ اعشاری نظام رائج ہونے کے بعد پرانے سکے رفتہ رفتہ متروک ہوگئے اور نئے ۱۰۰ پنس کے پونڈ کا رواج عام ہوگیا تھا۔

۲۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۸ء کو میں نے ۱۷ پونڈ کا چیک بوڈلین لائبریری کے نام بھیج دیا تھا۔ انھوں نے ۸ فروری ۱۹۷۹ء کو مخطوطے کی عکسی نقل براہ راست خواجہ صاحب کو ہوائی ڈاک کے ذریعے بھیج دی۔

۳۔ مقالہ ۳۱ جنوری ۱۹۷۹ء کو مکمل ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

Socio - Political Aspects of Urdu Literature during 1857 and its Aftermaths.

اور یہ ''ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان'' کے جرنل کی تین اشاعتوں میں جنوری۔ اپریل اور اکتوبر کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔

(۱۵)

برادرِ عزیز و مکرم ! سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۹ دسمبر موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کی عنایت ہے کہ آپ نے میرے مطلوبہ مخطوطے کا سلور پرنٹ بنانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ میں اب انتظار کر رہا ہوں کہ یہ سلور پرنٹ مجھے مل جائیں اور میرا کام مکمل ہو۔ اس سلسلے میں آپ نے جو تعاون فرمایا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

رقم کا ذکر کرنے سے میں خفا نہیں ہوا۔ بس ذرا سا ملال ہوا تھا، سو وہ اب دور ہو گیا۔ آپ دل کے اچھے ہیں لیکن زبان اور قلم کے نادر شاہ ہیں۔ خیر رات گئی بات گئی۔

آپ نے انڈیا آفس کے جس کیٹلاگ کا ذکر کیا ہے، اس کی مجھے ضرورت تھی لیکن پچھلے مہینے ہی میں اس کا عکس بنوا چکا ہوں۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں پندرہ پیسے فی صفحہ کے حساب سے عکس بنا اور لندن میں Fol 48 کے سترہ پونڈ سے زیادہ صرف ہو رہے ہیں، حالانکہ میں نے سنا تھا کہ لندن میں علمی کام بہ کفایت ہو جاتے ہیں۔ خیر میرے یا آپ کے سترہ پونڈ ناہنجاران برطانیہ کو راس نہیں آئیں گے۔ ان لوگوں نے ڈیڑھ سو سال تک ہماری ملکی دولت کا استحصال کیا ہے۔ اب یہ ہماری ذاتی دولت کے درپے ہیں۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کے مقالے کا پہلا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ ان شاء اللہ اب تک ٹائپ کا کام شروع ہو چکا ہوگا۔

اسپین جانے کا خیال مبارک ہو، مسجد قرطبہ میں آپ ضرور جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں ایک رجسٹر ہے جس میں تمام زائرین اپنا نام پتا لکھتے ہیں۔ ذرا علامہ اقبال کا نام اس رجسٹر میں تلاش کیجیے۔

آپ کے ہاں سخت سردی پڑ رہی ہے اور یہاں سردی آئی ہی نہیں۔ ڈار صاحب کو میں نے بھی خط لکھا تھا۔ ان کے صاحب زادے کا خط آیا تھا، نیز پیر راشدی صاحب سے بھی معلوم ہوا تھا کہ ڈار صاحب کی حالت تشویش ناک ہے۔ دعا کیجیے کہ خدا انھیں صحت کلی عطا فرمائے۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کا سلام پہنچا دیا تھا۔ وہ بھی دعا لکھواتے ہیں۔ میری کتابیں آپ نے کس کس کو دیں؟

مولانا حسن مثنیٰ صاحب سے اگر ملاقات ہوئی تو میرا اسلام پہنچا دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

(۱۶)

برادر عزیز و مکرم! سلام مسنون۔

آپ کا دس جنوری کا گرامی نامہ آج کی ڈاک سے ملا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاک خانے کے محکمے میں جزوی ہڑتال جاری ہے۔ سنا ہے کہ کئی کروڑ خط جمع ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں میرا یہ خط آپ کو کب ملے گا۔

میرا یہ خط جب آپ کو ملے گا، اس وقت تک آپ کا مقالہ مکمل ہو چکا ہوگا۔ ازراہ کرم تفصیل سے لکھیے کہ اس مقالے میں آپ نے کیا کچھ لکھا ہے؟

پچھلے دنوں ابوالخیر محمد فاروق (آسٹریلیا والے) یہاں آئے تھے۔ ان سے دو مختصر ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ کا ذکر خیر رہا۔ وہ آپ کی اور آپ کے خوب صورت کیسٹ پلیئر کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ فاروق صاحب نے اپنی کتاب مجھے دی۔ یہ مغل ہندوستان کی سڑکوں اور رسل و رسائل کے بارے میں ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے اور بڑی محنت سے لکھی گئی ہے (1)۔

کل افتخار عارف سے بھی فون پر بات ہوئی۔ انھیں ابھی تک میری کتاب نہیں ملی۔ میں نے دوسرا نسخہ انھیں دے دیا تھا۔ آپ کے پاس جو نسخہ ہے وہ آپ کسی لائبریری کو دے دیجیے۔

میرے مطلوبہ فوٹو اسٹیٹ آ گئے ہوں تو انھیں جلد بھیجنے کی کوشش کیجیے گا۔ اگر ممکن ہو تو بذریعہ ایرمیل بھیج دیجیے گا اور رجسٹری۔ ڈار صاحب کے بیٹے سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ اب ڈار صاحب کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔

سلیم الدین قریشی صاحب نے جو کیٹلاگ ایڈٹ کیا ہے، وہ میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔ قریشی صاحب سے کہیے کہ وہ اس کا Invoice بنوا کر (میرے نام کا) بھیج دیں۔ اس کی بنا پر میں اسٹیٹ بنک سے اجازت لے کر اور اسی کے ذریعے کیٹلاگ کی قیمت اور بحری ڈاک کا خرچ بھیج دوں گا۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تبادلے میں اپنی کتاب ''جائزہ مخطوطات، جلد اول'' بھیج دوں۔ یہ ساڑھے بارہ سو صفحات کی کتاب ہے اور مخطوطات پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ہوگی۔ یہ کتاب ابھی تک جلد سازی میں ہے۔ فروری کے مہینے میں بہرصورت منظر عام پر آ جائے گی۔

آج کل میرا کیمرا خوب کام کر رہا ہے۔ ہر مہینے دو چار فلمیں اتار لیتا ہوں۔ میرے بھائی صاحب نے مجھے فلیش گن بھی بھیج دی ہے۔ فلمیں بھی بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح یہ شوق پورا ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو زحمت یہ دینی ہے کہ ازراہ کرم ذرا معلوم کیجیے کہ Ashipentax کیمرا K100 کی قیمت کیا

WWW.KITABOSUNNAT.COM

ہے۔ اس کا لینس 1.2 ہے۔ نیز یہ بھی معلوم کیجیے کہ فلیش گن Sunpak G × 33 کتنے میں ملتی ہے؟

آپ کے اسپین جانے کی خبر مسرت بخش ہے لیکن حقیقی خوشی اس وقت ہوگی جب آپ سفر کے دوران ہر روز مفصل خط لکھیں۔ اس طرح میں بھی شریک سفر ہو جاؤں گا۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ معین الدین عقیل اور اظہر حقی بھی خیریت سے ہیں۔ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ مولانا ابو سلمان نے مولانا محمد علی کے مکتوبات مرتب کیے ہیں۔ آپ کا سلام آپ کی بھابھی صاحبہ کو پہنچا دیا ہے۔ وہ بھی سلام لکھواتی ہیں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۵ جنوری ۱۹۷۹ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ ڈاکٹر ابو الخیر محمد فاروق آسٹریلیا کی کسی یونی ورسٹی میں لیکچرار تھے۔ یہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں لندن آئے تو انٹرنیشنل ہال میں ٹھہرے تھے۔ اس زمانے میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے انھیں خواجہ صاحب کا پتا اور فون نمبر دیا تھا۔

(۱۷)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون۔

آپ کے یکے بعد دیگرے دو خط ملے۔ ایک میں میرا خط نہ ملنے کی شکایت اور دوسرے میں خط کا ذکر تھا۔ قصہ یہ ہے کہ پچھلے مہینے ڈاک والوں نے جزوی ہڑتال کر رکھی تھی، اس لیے ڈاک تاخیر سے ملی اور تاخیر ہی سے روانہ ہوئی۔ اب کہیں حالات معمول پر آئے ہیں۔ دو روز ہوئے بوڈلین لائبریری والوں نے ''دیوان قدرت'' کے عکس براہ راست مجھے بھیج دیے ہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ یہ آپ کے پاس پہلے آتے تو یہاں آنے میں وقت صرف ہوتا اور اگر آپ انھیں مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب کے ہاتھ بھیجتے تو پھر قیامت کے روز ہی ملتے۔ لفافے پر 2.70 کے ٹکٹ لگے تھے اور یہ ہوائی ڈاک سے آیا ہے۔ یہ آپ کا ایسا لطف خاص ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اب کیٹلاگ بھی آجائے تو آپ کے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہو جائے گی۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا مقالہ پسند کیا گیا۔ مجھے اس کا پہلے ہی یقین تھا کہ آپ مقالہ بہت اچھا لکھیں گے۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ جس کام کا ارادہ کر لیں، وہ کر ہی لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ تساہل کی وجہ سے ادھر ادھر کی دل چسپیوں میں وقت صرف کر ڈالتے ہیں۔ مقالے کا جو خاکہ آپ نے لکھا ہے وہ بھی نہایت جامع ہے۔

آپ نے اپنے ذاتی مسئلے پر جو میری رائے طلب کی ہے تو عرض ہے کہ آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہیں رہ کر ڈاکٹریٹ کی تکمیل کریں۔ یہاں کسی علمی ادارے سے وابستگی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں ڈاکٹریٹ کی صورت میں یہ امکانات بہت زیادہ ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں رہ کر آپ پی ایچ ڈی نہیں کر سکتے۔ ذہنی پریشانیاں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گی۔ روانگی کے وقت آپ کی جو ذہنی کیفیت تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے علم کے میدان میں کچھ کر گزرنے کا جو عزم کیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ہر طرح کی پریشانیوں سے محفوظ رہیں۔ جہاں تک حصص کے نقصان کا تعلق ہے تو پہلے ہی آپ نے کون سا سود و زیاں سے واسطہ رکھا ہے۔ آپ نے ہمیشہ سود و زیاں سے بلند رہ کر سوچا ہے۔ اب بھی اسی پر عمل کیجیے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نقصان میں نہیں رہیں گے اور ویسے بھی مادی طور پر آپ کو حصص کے تعلق سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

یہ خط میں ایسے وقت میں لکھ رہا ہوں کہ آپ اسپین کی سیاحت میں مصروف ہوں گے اور جب تک یہ خط آپ کو ملے گا، آپ لندن واپس آ چکے ہوں گے۔ اسپین کی سیاحت کا حال مفصل لکھیے تا کہ میں روحانی طور پر آپ کا شریک سفر ہو سکوں (۱)۔

باقی آپ کے خط آنے پر۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب کی خدمت میں سلام۔ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں اور کہاں مقیم ہیں؟

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۹ فروری ۱۹۷۹ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ میں نے اسپین اور مراکش کا سفر ۱۱ فروری سے ۲۷ فروری ۱۹۷۹ء کے دوران کیا تھا۔

(۱۸)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون۔

آپ کا تازہ ترین خط مکتوبہ ۲۱ مارچ کل شام کو ملا تھا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا ۱۹، فروری کا خط آپ کو کامل ایک مہینے بعد ملا۔ شاید اس کا سبب یہ ہوگا کہ آپ چونکہ سفر میں تھے، اس لیے یہ خط آپ کے ہوسٹل کے دفتر میں پڑا رہا ہوگا۔

اس سے پہلے آپ کے تین خط ملے تھے۔ دو آپ نے اسپین میں لکھے تھے اور ایک مراکش سے۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ نے سفر میں مجھے یاد رکھا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو دنیا کے مختلف خطوں کی سیاحت کا موقع ملتا ہے اور میں خوش قسمت ہوں آپ کے سفر کی روداد سے محظوظ ہوتا ہوں۔ یہ خطوط اگرچہ مختصر تھے لیکن ایک مسافر سے اس سے زیادہ طویل خطوں کا طالب ہونا مناسب نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اپنی ڈائری میں زیادہ تفصیل سے کام لیا ہوگا۔ خدا نے چاہا تو حسب سابق اس ڈائری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ضرور ملے گا۔

''دیوان قدرت'' کے عکس کے لیے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس عکس پر جو مصارف ہوئے ہیں، ان کا خیال کر کے دل کانپ اٹھتا ہے۔ اتنی رقم اگر مصنف دیوان کو اس کی زندگی میں مل جاتی تو اس کا سال دو سال کا خرچ آسانی سے نکل آتا۔ میں نے سنا تھا کہ لندن میں عکس کا خرچ دو چار پنس فی صفحہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

میری کتاب جو لاہور میں چھپ رہی تھی، اس کی طباعت نومبر ۷۸ء کے وسط میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک جلد سازی کا کام ہو رہا ہے۔ ہمارے اداروں میں اسی طرح سست رفتاری سے کام ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اداروں میں کام کرنے والے اہلیت و صلاحیت کی بجائے سفارش کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ بہرحال جس وقت بھی کتاب ملی، آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے سلیم الدین قریشی صاحب سے کہہ دیا کہ وہ اپنے کیٹلاگ کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیں۔ میں اس کے لیے چشم براہ رہوں گا۔

میری دوسری کتاب ''اقبال'' از احمد دین انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ کے شروع میں طباعت مکمل ہو جائے گی تو آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

آپ کی کتاب ’’زمان ومکان‘‘ پر فی الحال تو تبصرے کرا رہا ہوں۔ نفیس اکیڈمی سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوا چونکہ کتاب ان کے پریس میں چھپی ہے لہذا تبصرے میں انھیں کا نام دے دیا ہے۔ انھوں نے فی الحال دس نسخے فروخت اور واپسی کے اصول پر لیے ہیں۔ کتاب کی فروخت مایوس کن ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہاں ڈائجسٹ وغیرہ زیادہ بکتے ہیں۔ میں نے تو اپنی کتاب کی فروخت سے مایوس ہو کر اس کا بڑا حصہ لائبریریوں اور اہل علم میں تقسیم کر دیا ہے۔ آپ کی کتاب پر ایک اور تبصرہ شائع ہوا ہے۔ بھیج رہا ہوں۔

سابقہ فلموں میں سے دو تین تصویریں صحیح نکلی ہیں۔ ان میں ایک آپ کی ہے۔ بھیج رہا ہوں۔ میرا فوٹوگرافی کا شوق عروج پر ہے۔ آپ کا نتیجہ کب آ رہا ہے؟ آج کل کیا شغل ہے؟

مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی خدمت میں سلام پیش کر دیجیے۔ والد صاحب قبلہ لاہور تشریف لے گئے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

احتیاطاً یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۳۔ اپریل ۱۹۷۹ء

بخدمت گرامی
جناب حمزہ فاروقی
لندن

(۱۹)

برادر عزیز ومکرم ! سلام مسنون ۔

آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی دکھ ہو رہا ہے کہ میرے اور آپ کے مہربان جناب بشیر احمد ڈار اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ۲۹ مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے کے قریب انھوں نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ افسوس صد افسوس کہ ایک مخلص اور انسان دوست شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی۔ ان جیسا دوسرا صاحب علم وقلم کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ڈار صاحب جیسا ممتاز اہل علم انتقال کر جائے اور اخباروں میں دوسطری خبر بھی شائع نہ ہو۔ مجھے ان کے انتقال کی اطلاع کل ہی ایس ایم میر صاحب نے فون پر دی ہے۔ ڈار صاحب اکتوبر میں بیمار پڑے تھے۔ چھ مہینے کے اندر اندر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرض کینسر کا تشخیص ہوا تھا۔ سنا ہے آخری زمانے میں مختلف دوائیوں کا ردعمل خراب ہوا۔ ذہن بھی متاثر ہو گیا تھا۔ بستر سے اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وجہ سے کئی مرتبہ شدید جسمانی چوٹیں بھی آئیں۔ آپ مرحوم کی بیگم صاحبہ کو تعزیت کا خط لکھ دیجیے۔ پتا وہی ہے جس پر آپ نے ڈار صاحب کو خط لکھا تھا۔

اگر آپ ڈار صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا حال قلم بند فرما دیں تو میں اسے یہاں کے کسی اخبار یا رسالے میں چھپوا دوں گا۔ محمد عبداللہ قریشی صاحب کو بھی میں نے مضمون لکھنے کے لیے کہا ہے۔

مولانا مہر سے متعلق اپنے مضمون کی نقل بھی بھیج دیجیے۔ ان کی برسی پر اسے بھی چھپوا دوں گا۔

اب اس سے زیادہ نہیں لکھا جاتا۔ طبیعت سخت اداس ہے۔ یقین نہیں آتا کہ ڈار صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ آمین

آپ کا
مشفق خواجہ

بخدمت گرامی
جناب محمد حمزہ فاروقی
لندن۔

(۲۰)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون۔

آپ کا ۲۹ جنوری کا گرامی نامہ آج ملا ہے۔

آپ نے والد صاحب کی خیریت پوچھی ہے۔ اس بات نے دل لہولہان کر دیا۔ دسمبر کی ۲۸ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے سوگوار چھوڑ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دسمبر کے شروع میں ان کی طبیعت بہت بہتر ہو گئی تھی اور ہم نے ۳ جنوری کو ان کی سالگرہ بڑے پیانے پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے بہت سے لوگوں کو مدعو کیا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ ۲۵ کو ان کی طبیعت بگڑی، ۲۶، ۲۷ کو وہ اسپتال میں رہے اور ۲۷، ۲۸ کی درمیانی شب کو بارہ بج کر آٹھ منٹ پر رحلت فرما گئے۔ میں نے اجمل صاحب سے فون پر عرض کیا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دیں۔ اس حادثے نے دل و دماغ کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔

سلیم الدین قریشی صاحب کا کیٹلاگ مجھے نہیں ملا۔ شاید وہاں سے بھیجا ہی نہیں گیا۔ اس کی مجھے جتنی شدید اور فوری ضرورت تھی، اتنی ہی تاخیر ہو رہی ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں فوری توجہ فرما سکیں تو کرم ہوگا۔

مفصل خط میں ان شاء اللہ آپ کا جواب آنے پر لکھوں گا۔ اپنا پتا صاف اور واضح لکھیے۔

خدا کرے آپ مع بھابھی صاحبہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۵۔ فروری ۱۹۸۰ء (۱)

بخدمت گرامی
جناب محمد حمزہ فاروقی
لندن۔

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ اس خط پر تاریخ درج نہ تھی۔ اس پروگرام پر مہر کی مدد سے تاریخ متعین کی گئی تھی۔

(۲۱)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون۔

آپ کا پہلا گرامی نامہ مل گیا تھا، جس میں آپ نے والد صاحب مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کا جواب میں نے فوراً لکھ دیا تھا۔ غلطی یہی کی کہ پوسٹ کرنے کے لیے ایک چپراسی کو دے دیا۔ اس نے یقیناً ٹکٹ کے پیسے جیب میں رکھے ہوں گے اور خط ضائع کر دیا ہوگا۔ اب یہ خط میں خود پوسٹ کروں گا۔

والد صاحب مرحوم کی دائمی مفارقت نے زندگی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں کس قدر ان سے وابستہ تھا۔ علمی کاموں میں بھی اسی لیے مزہ آتا تھا کہ ان کی داد ان سے ملتی تھی۔ آپ سے بھی انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ آخری دنوں میں کئی بار آپ کو یاد کیا تھا۔ بیماری کے دوران آپ جب بھی ان سے ملنے کے لیے آتے تھے تو وہ بے حد خوش ہوتے تھے۔ انھوں نے اکثر لوگوں سے اس کا ذکر کیا تھا کہ حمزہ صاحب کراچی آتے ہی مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ دعا کیجیے کہ خداوند تعالیٰ انھیں درجات عالیہ عطا فرمائے۔

میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے فوری طور پر تین کام کر رہا ہوں :۔

۱۔ ان کے بارے میں ایک مجموعہ مضامین۔ اس میں ان کے دوستوں اور جاننے والوں کے مضامین ہوں گے۔ آپ بھی اس کے لیے ایک مضمون ضرور لکھیے جو جو باتیں یاد آئیں، قلم بند کر دیجیے۔

۲۔ ان کا روزنامچہ مرتب کر رہا ہوں۔ اس میں پچاس سال پہلے کے لاہور کی پوری علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ آ گئی ہے۔

۳۔ ان کے نام مشاہیر (ابوالکلام آزاد، اقبال، سید سلیمان ندوی) کے خطوط کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ خط بھی کتابی صورت میں شائع کروں گا۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ میرا ارادہ ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ اس کی صورت نکل آئی ہے۔ آج کل میں اس کام پر خاصا وقت دے رہا ہوں۔ تمام ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس کے پہلے شمارے کے لیے اپنے سفرنامے کا اسپین سے متعلق حصہ جلد از جلد لکھ کر مجھے بھیج دیجیے۔ ضخامت کی آپ پروا نہ کیجیے۔ بس یہ شرط ہے کہ سفرنامہ حسب سابق دل چسپ ہونا چاہیے (۱)۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں یہ کام انجام دیں گے۔

مولانا مہر سے متعلق کتاب بھی اب آ جانی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جتنا کام آپ نے کرلیا ہے، وہی کافی ہے۔ جو کاغذات آپ نے مجھ سے منگوائے تھے، ان پر ایک نظر ڈال کر واپس بھیج دیجیے۔ میں مولانا ابوسلمان صاحب سے اس کی نظر ثانی کرا کے شائع کر دوں گا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کیٹلاگ روانہ کر دیا ہے۔ اصل خوشی اس وقت ہوگی جب یہ ملے گا۔ دو سال سے اس کی آمد آمد کی خبر سن رہا ہوں۔ اتنا انتظار تو میں نے کسی محبوب کا بھی نہیں کیا جتنا اس کا کرنا پڑا۔

اپنی کتابیں میں عنقریب آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ ڈاک سے پہنچنے میں دیر لگے گی۔ میرے ایک جاننے والے لندن جا رہے ہیں، ان کے ہاتھ بھیج دوں گا۔

احباب خیریت سے ہیں۔ جب ملاقات ہوتی ہے آپ کا ذکر خیر ضرور آتا ہے۔ آپ نے اپنے حالات تفصیل سے نہیں لکھے۔ آج کل کیا مشاغل ہیں؟ پی ایچ ڈی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ امریکہ میں کہاں کہاں کی سیر کی اور آئندہ کیا کیا ارادے ہیں؟ ان سب امور سے متعلق تفصیل سے لکھیے۔

آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ آپ کا خلوص، آپ کی شفقت، اس زمانے میں ناپید ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس دنیا میں آپ جیسے وسیع القلب انسانوں کا تناسب بڑھ جائے تو یہ دنیا واقعی رہنے کے قابل بن جائے۔

جنوری میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب دوبارہ کراچی آئے تھے، وہ بھی آپ کے خلوص کے تہِ دل سے قائل ہیں۔ کل پروفیسر ممتاز حسین آئے تھے، آپ سے ملنے کے شائق تھے۔ اب آپ آئیں گے تو ان سے ضرور ملیے۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔ میری مندرجہ ذیل گزارشات پر عمل کیجیے۔

۱۔ اپنے تفصیلی حالات و کوائف لکھیے یعنی یہ کہ کس عالم میں گزر رہی ہے؟

۲۔ والد صاحب قبلہ مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند فرما دیجیے۔

۳۔ میرے رسالے کے لیے اسپین کا سفرنامہ تحریر فرما دیجیے۔ جلد از جلد۔ پہلا شمارہ کتابت ہو رہا ہے۔ یہ تقریباً سات سو صفحات کا ہوگا(۲)۔

۴۔ مولانا مہر سے متعلق کام پر توجہ کیجیے۔

خدا کرے آپ اور بیگم صاحبہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ

۱۲ مارچ ۱۹۸۰ء

پس نوشت:

بھائی جان! اپنا پتا الگ الگ انگریزی حروف میں لکھیے۔ موجودہ صورت میں یہ بالکل سمجھ میں (نہیں) آیا۔

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ یہ سفرنامہ ۱۹۸۲ء میں ''مکتبہ اسلوب'' کراچی نے شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے ''آج بھی اس دیس میں'' کا مسودہ دیکھنے کے بعد اسے رسالے میں شائع کرنے کی بجائے کتابی شکل میں چھپوانا بہتر سمجھا۔

۲۔ سہ ماہی ''تخلیقی ادب'' کراچی۔

(بنام پروفیسر گیان چند جین)

(۱)

محترمی و مکرمی ! آداب۔

ڈاکٹر انور معظم صاحب کے ہاتھ ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ امید ہے ملا ہوگا۔ اس سے پہلے رسالہ، غالب، غلام جیلانی صاحب کے ہاتھ بھیج چکا ہوں۔

میں نے اپنے خط میں عرض کیا تھا کہ ڈاکٹر آغا سہیل کی کتاب ''دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا'' ارسال خدمت کروں گا۔ یہ کتاب اور اس کے ساتھ دو اور کتابیں بھیج رہا ہوں۔ پیکٹ میں گنجائش تھی اس لیے چار کتابیں ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری صاحب کے لیے اس میں رکھ دی ہیں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، ازراہ کرم ان تک پہنچا دیجیے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کی کتاب ویسی ہی ہے جیسے پی ایچ ڈی کے مقالے عام طور پر ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ آپ کی خدمت میں یہ کتاب پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی گلستاں کو گھاس کا 'تحفہ' بھیجا جائے (گیاہے بسوئے گلستان فرستم)۔ چوں کہ یہ آپ کا موضوع ہے، اس لیے ہر اچھی بری کتاب نظر سے گزر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

پہلے جو خط لکھا تھا، اس میں ایک آدھ بات جواب طلب ہے۔ توجہ فرمائیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۸۔ فروری ۱۹۸۹ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر گیان چند جین صاحب
حیدر آباد۔

(۲)

محترمی و کرمی ! آداب۔

گرامی نامہ مل گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ کا مضمون اور میرا کالم چھپ جائے تو خط لکھوں گا۔ یہ دونوں چیزیں اسی مہینے چھپی ہیں ان کے عکس منسلک ہیں۔

ایک زحمت دے رہا ہوں، ہم لوگ ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک ارمغانِ علمی پیش کر رہے ہیں جس میں علمی و ادبی مقالات شامل ہوں گے۔ آپ اپنی دلچسپی کے کسی موضوع پر مقالہ عنایت فرمائیے۔ بے حد کرم ہوگا۔

یہ ارمغان اس سال کے آخر تک شائع کرنے کا پروگرام ہے، اسی لیے آپ کا مقالہ اگر اگلے دو ماہ میں مل جائے تو کتابت و طباعت میں سہولت رہے گی۔

مجھے آپ کی مصروفیات کا احساس ہے لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ 'ارمغان' ہر اعتبار سے بلند پایہ ہو، ظاہر ہے اس کے لیے آپ کی توجہ ضروری ہے۔

اس سال کے آخر تک میری تین کتابیں شائع ہونے کی توقع ہے۔ یہ تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں۔ اگر مقالہ براہ راست بھیجنے میں کوئی دقت ہو تو خلیق انجم صاحب (دہلی) کو بھجوا دیجیے، یہ مجھ تک بحفاظت پہنچ جائے گا۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف تحریر فرمائیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر گیان چند جین صاحب
حیدر آباد۔

(بنام ساقی فاروقی)

(۱)

بھائی ساقی !

اسد محمد خان نے لندن سے واپس آتے ہی فون پر یہ اندوہناک اطلاع دی کہ تمھارا چہیتا کتا☆ داغِ مفارقت دے گیا ہے اور تم اس کے غم میں اتنے نڈھال ہو کہ ہر وقت اٹوائی کھٹوائی لیے پڑے رہتے ہو۔ آنے والوں کی تواضع کرنا تو کیا تم کسی سے سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتے۔ خیر یہ عادت تو تمھاری پہلے بھی تھی، اب اس سانحے کو اس عادت کا معقول جواز سمجھنا چاہیے۔ تاہم ایسا بھی کیا کہ تم اپنی جان کو روگ لگا لو۔ مانا کہ آں جہانی تمھارا ہمدم و دمساز تھا، برسوں سے تمھارا ہر وقت کا ساتھی تھا لیکن یہ کیوں بھولتے ہو کہ جو دنیا میں آتا ہے، اسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا بھی ہوتا ہے۔ جانے والے کے غم میں اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ شخصیت تو پہلے ہی مسخ ہو چکی ہے کیوں کہ وہ عزیز تمھاری شخصیت کا جزو لاینفک تھا۔ معلوم نہیں تم اس کے بغیر کیسے لگتے ہو؟ لوگوں کو پہچاننے میں دقت تو نہیں ہوتی؟

مجھے معلوم ہے کہ اخفش کی بکری کی طرح تمھارے کتے کی سخن فہمی بھی بے مثال تھی۔ وہ تمھاری ہر نظم کا پہلا سامع ہوتا تھا۔ تم جب تک اسے اپنا کلام سنا کر داد نہیں لے لیتے تھے، اس وقت تک کسی دوسرے کو شایانِ سماعت نہیں سمجھتے تھے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم شاعری میں ن م راشد سے متاثر ہو۔ یہ محض بہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم صرف اور صرف آں جہانی سے متاثر تھے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب سے تم نے شاعری شروع کی ہے، شاعری اور کتے خصّی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ عزیز موصوف سے تعلق خاطر کی بنا تمھیں کوئی گونا گوں فائدے نہیں پہنچے بلکہ وہ عزیز بھی خاصا فائدے میں رہا۔ اول اول وہ سخن فہم تھا، بعد میں سخن ور بھی ہو گیا۔ سنا ہے کہ بھونکتا بھی تھا تو عروضی حدود کے اندر۔ اسے بحرِ رمل مثمن مجنون بہت

☆ یہ خط میرے کتے ''کامریڈ'' کی موت کے بارے میں ہے۔ یہ عزیز دس اسٹون کا تھا اور مجھ سے بڑی زیادہ بھاری۔ آخری بار سردار جعفری صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے تو انھوں نے میری بیوی سے کہا، ''ساقی سے کہو کہ اس کا نام بدل دیں۔'' شراب و کباب کے درمیان بیوی نے کہا ''مسٹر جعفری کہتے ہیں کہ تم اس کتے کا نام بدل دو۔'' اور میں نے کہا تھا ''سردار بھائی، اس کا نام نہ بدلوایئے۔ آخر آخر میں یہ واحد کمیونسٹ رہ جائے گا جس پر آپ فخر کریں گے۔'' (ساقی فاروقی)

پسند تھی اور یہ تمھاری بھی پسندیدہ بحر ہے۔ تمھارا سارا کلام اسی بحر میں غرق ہوا ہے اور یہ دلیل ہے، اس کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کسی حد تک متاثر تھے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمھاری اکثر نظمیں اسی جواں مرگ کی فرمائشوں کا نتیجہ ہیں، خصوصا وہ تمام نظمیں جو تم نے انواع واقسام کے جانوروں پر لکھی ہیں۔ ان میں وہ نظم بھی شامل ہے جس کا عنوان ''ایک کتا نظم'' ہے سنا ہے کہ تم نے اس قسم کا نظموں کا پورا ایک دیوان مرتب کر لیا ہے جو ''ایک کتا دیوان'' کے نام سے چھپنے والا ہے۔ گویا اب تم اپنی عام زندگی کی طرح شاعری میں بھی کتے چھڑواؤ گے۔ اس کتے چھڑوانے پر خواجہ حیدر علی آتش کا ایک شعر یاد آ گیا۔ تم بھی سن لو:

اس ترک سے جو کی ہیں صحرا میں چار آنکھیں
جھنجھلا کے کیا ہی کتے چھڑوائے ہیں ہرن پر

مجھے کتوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اگر ہوتی تو میں بڑے فخر سے اپنے آپ کو خواجہ سگ پرست کہلوانا پسند کرتا۔ تاہم اب بھی کسی حد تک اس لقب کا مستحق ہوں کیوں کہ بعض سگانِ دنیا سے دوستی اور محبت کا تعلق رکھتا ہوں۔ بہر حال تمھارے کتے کی موت کا افسوس ہے کہ یہ کتے ہی کی موت مر گیا۔ اگر سگ دنیا ہوتا تو کسی بڑے عہدے پر فائز ہو کر اپنا اور تمھارا نام روشن کرتا۔

مجھے تاریخ گوئی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی لیکن تمھارے کتے کی موت میرے حق میں سگ گزیدگی کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے یعنی میں تاریخ گو بن گیا ہوں۔ پہلے ایک مادۂ تاریخ سنو: ''سگِ ساقی نواز حسب ضرورت'' (حسب ضرورت کی داد چاہتا ہوں) قطعہ تاریخ یہ ہے:

کون عف عف کرے گا سُن کے کلام
اک سخن فہم خوش وہاں نہ رہا
کہی ''دندان سگ'' سے یہ تاریخ
نظمِ ساقی کا قدرداں نہ رہا

آخر مصرعے کے عدد ۱۸۹ ہیں۔ ان میں ''دندان سگ'' کے عدد (۱۸۹) جمع کر دو، ۱۹۹۱ برآمد ہوگا۔

سنا ہے کہ تم نے خاصی رقم صرف کر کے لندن میں کتوں کے قبرستان میں عزیز موصوف کو منوں مٹی کے نیچے دفن کرایا ہے۔ مذکورہ قطعۂ تاریخ قبر پر لکھوا دو تا کہ معلوم ہو کہ تمھاری شاعری کے واحد قدردان کی دم موئے پر بھی ٹیڑھی ہے۔ ہاں قبر پر کتا گھاس ضرور لگوانا۔ یہ ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے جو آدمی کے

کپڑوں سے چمٹ جاتی ہے۔ قبر پر آنے والے عقیدت مندوں کے لیے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہوگی۔ یہ وہی کتا گھاس ہے جس کا ذکر استاد ذوق نے اس شعر میں کیا ہے:

سگِ دنیا پس از مردن بھی دامنگیر دنیا ہو
کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

تمھارا
مشفق خواجہ
۳ ستمبر ۱۹۹۱ء

WWW.KITAABISTAN.COM

(۲)

برادرِ عزیز و مکرم! خوش رہو۔

چند لمحے پیشتر تمھارا رجسٹری خط ملا۔ چند روز ہوئے کہ لاہور سے کتاب کے ۲۵ نسخے بھی مل گئے تھے۔ کتاب واقعی بہت اچھی چھپی ہے۔ تمھاری شاعری کو اچھی طرح چھپنا چاہیے تاکہ خریدار طباعت کی خوبی سے تو متاثر ہو۔ تمھارا خط آنے سے پہلے میں یہ کتاب یوسفی صاحب، عالی صاحب، ادا جعفری، لائبریری، انجمن ترقی اردو اور غالب لائبریری کو بھیج چکا تھا۔ آج آصف فرخی کو اس کا نسخہ اور اس کے ساتھ قمر جمیل، اسد محمد خان اور فہمیدہ ریاض کے لیے نسخے بھجوا دیے۔ گزشتہ جمعہ کو شمس الرحمٰن فاروقی سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک کتاب منگوائی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ تمھاری کتاب بھی بھیج دی۔ گویا میرا نسخہ ملا کر اب تک گیارہ نسخے تقسیم ہو چکے ہیں۔ ایک نسخہ آمنہ (۱) نے زبردستی لے لیا کہ میں کالج لے جاؤں گی۔ چلو اچھا ہے ناپختہ ذہنوں کو اپنے کام کی کتاب مل جائے گی۔ اب باقی ۱۳ نسخے رہ جاتے ہیں۔ یہ اگلے چند دنوں میں تمھاری فہرست کے ان لوگوں کو دوں گا جو پہلے دستیاب ہوں گے۔ جن کو دوں گا ان کی فہرست بھجوا دوں گا۔ تمھاری فہرست میں چند نام ایسے ہیں جن کو کتاب دینا ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ بہرحال تم اسی میں خوش ہو تو مجھے کیا۔ بہتر ہے کتاب تمھاری اپنی مرضی سے ضائع ہو۔

سوغات کا شمارہ ۳ ملا۔ اس میں تمھارا نام صرف ایک خط میں آیا ہے اور وہ بھی بے ضرر طریقے سے محمود ایاز (۲) تم سے ڈر گیا۔ شریف آدمی ہے ورنہ وہ بھی تمھارے قبیل کا ہوتا تو تمھارا خط مع اپنے جواب کے چھاپ دیتا۔ نارنگ سے بھی تقاضا کر کے تمھارے بارے میں ایک خط لکھوایا تھا۔ افسوس کہ یہ جھگڑا آگے نہیں بڑھا۔ مزہ آدھا رہ گیا۔

میں نے لائبریریوں کو دو نسخے اس لیے دیے ہیں کہ کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظر سے گزرے۔

تمھاری کتاب کو میں کلیات اس لیے کہتا ہوں کہ جیسی شاعری تم اب کرتے ہو ویسی آئندہ بھی کرو گے۔ اگلے پچاس برسوں میں تم نے مزید دو سو نظمیں اور دو سو غزلیں لکھ بھی لیں تو کیا فرق پڑے گا۔ ہاں فرق ضرور پڑے گا، کلیات کی ضخامت دگنی ہو جائے گی۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے شاہدہ (۳) بہن کو فون کیا تو تمھارا پیغام پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ "آپ خط نہیں لکھتے تو کبھی فون ہی کر لیا کیجیے"۔۔۔ اس جملے میں جو کرب ہے، اسے محسوس کرو اور سب

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کام چھوڑ کر انھیں خط لکھو۔۔۔ ہاں شاہدہ بہن نے تمھاری کتاب مانگی ہے، لہٰذا ایک نسخہ میں انھیں ضرور بھیجوں گا۔ گویا ضائع شدہ نسخوں کی تعداد اب ۱۳ ہو گئی۔

ایک بری خبر سنو۔ وہ جو ہمارا دوست مہتاب ظفر (۴) تھا، ۲۲ اکتوبر کو اس کا انتقال ہو گیا۔ افسوس کیسا اچھی آدمی تھا اور کتنی جلدی چلا گیا!

تمھاری صحت و شادمانی اور طوالت عمر کی دعاؤں کے ساتھ (ہمارے ایک دوست طوالت کا تلفظ لواطت کرتے ہیں)۔

تمھارا
مشفق خواجہ
۲۸ اکتوبر ۱۹۹۲ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ آمنہ۔ مشفق کی بیوی۔ میں مشفق کو انہی کے سامنے پیارو یار اور ذلیل وغیرہ کیا کرتا تھا۔

۲۔ محمود ایاز۔ جنھوں نے ایک بار میرا دل دُکھایا۔ میں نے جواباً ایک مہلک خط لکھ کر اپنا دل اور اُن کی طبیعت صاف کر دی تھی۔

۳۔ شاہدہ۔ میری چھوٹی بہن جو مجھ سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتی ہے اور شادی کے بعد بھی Brother Image کو توڑنے میں ناکام رہی۔

۴۔ مہتاب ظفر۔ ایک خوش گو شاعر۔ میرا اور مشفق کا مشترک دوست۔

(۳)

پیارے ساقی ! خوش رہو۔

ابھی ابھی تمھارا ایک سطری خط ملا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ یہ خوشی کی ہی نہیں خوش قسمتی کی بھی بات ہے کہ تم کسی کو اچھے لفظوں میں یاد کرو۔ تم اگر میرے بزرگ ہوتے تو میں آئندہ کے لیے یہ کہتا کہ ''مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے'' اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے گناہوں میں یاد رکھنا۔ تمھاری گنہگار زندگی پر رشک آتا ہے۔ تمہیں وہ سب کچھ یہیں مل گیا جس کی امید میں میں ''پارسائی'' کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

پچھلے دنوں میں تمھارا ایک ہنگامہ خیز انٹرویو، جنگ' میں دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ یہاں سے لے کر لاہور تک اس کا چرچا سننے میں آیا۔ تمھارے بعض جملے تو ضرب الامثال کی طرح لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ ''ضرب الامثال'' میں لفظ ''ضرب'' کا مزہ اچھی طرح تمھیں لے سکتے ہو۔

پچھلے مہینے لاہور کے جنگ میں مسعود منور ٭ نے تمھارے بارے میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا ہے۔ اس شخص نے تمھاری اتنی تعریف کی ہے کہ ایسی اور اتنی تعریف تو تم نے کبھی خود بھی نہیں کی۔ مضمون کے ساتھ تصویر بھی بڑی خوبصورت چھپی ہے۔ لوگ سفید بالوں کی وجہ سے بوڑھے لگتے ہیں لیکن تم جوان تر دکھائی دیتے ہو کیوں کہ بالوں کی سفیدی سے اعمال کی سیاہی پوری طرح جھلک رہی ہے۔ یوسفی صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ اتنی دعوتیں کرتے ہیں کہ میری طرح بہت سوں کو فکر معاش نہیں رہی۔ ان کا یہاں آجانا میرے حق میں تو ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ ہر ملاقات میں دو چار نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ پرانی بات ایک ہی کان میں پڑتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے تمھاری تعریف کر دیتے ہیں۔ تمھیں اچھا شاعر ہی نہیں اچھا انسان بھی سمجھتے ہیں۔ ان کے احترام میں میں بھی اس خیال فاسد کی تائید کرتا ہوں۔

گزشتہ مہینے کے آخر میں میں لاہور اور اسلام آباد گیا تھا۔ وہاں بے شمار لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثر لوگوں سے تمھارے بارے میں گفتگو ہوئی۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم محفلوں میں گفتگو کا موضوع بنتے ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ زیادہ تر تبصرے ''سخن گسترانہ'' ہوتے ہیں، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم خود کب کسی کو معاف کرتے ہو۔

تین چار دن ہوئے ایک بینک میں شاہدہ بہن سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی وہاں کسی کام سے آئی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے اور میں نے ان سے تمھاری خیریت پوچھی کیونکہ ایک عرصے سے تمھارا کوئی خط نہیں ملا تھا نہ مجھے۔ اب مجھے خط لکھ دیا ہے تو انھیں بھی لکھ دو۔

خدا کرے تمھیں صحت و شادمانی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل رہا ہو۔۔۔

تمھارا

مشفق خواجہ

۲۸ فروری ۱۹۹۳ء

☆ مسعود منور۔ ایک ذہین ادیب جو شراب نوشی میں مجھ سے بھی آگے نکل گیا۔ آج کل ناروے میں رہتا ہے۔ اُس کی دو کتابیں ابھی ابھی چھپی ہیں۔

(۴)

برادرم ساقی فاروقی ! خوش رہو۔

محترم احمد ندیم قاسمی صاحب کے نام تمھارے خط کی فوٹو اسٹیٹ نقل ملی، اسے پڑھ کر جی خوش ہوا۔ تم نے کیسی شگفتہ اور خوب صورت نثر لکھی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ شاعری میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ بالآخر نثر میں پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔

مزید خوشی اس بات کی ہوئی کہ اب تم ماشاءاللہ عروض کے ماہر بھی ہو گئے ہو لیکن خدا کے لیے راغب مرادآبادی(۱) کی طرح صرف عروض کے ماہر نہ رہ جانا کہ یہ علم بے فیض ہے۔ جو اس کا ہو جاتا ہے، وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ راغب مرادآبادی کے بارے میں میں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ راغب کے کلام میں کوئی عروضی خامی اور کوئی عروضی خوبی نہیں ملتی۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ میرے اس جملے کا اطلاق تم پر بھی ہو۔ لہٰذا دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ جو بحریں مروج ہیں، انھیں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کرو، عروض کی چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلاؤ۔ شاعری کو اس کے بنیادی وصف ''نغمگی'' سے محروم نہ کرو۔

کوئی نئی بحر ایجاد کرنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس بحر میں کہی گئی غزل کا کوئی مصرع کسی دوسری بحر میں نہ پڑھا جا سکے۔ یہ ''موجد'' کا عجز ہوگا کہ وہ اپنی ایجاد کردہ بحر کو دیگر بحروں سے ہم آہنگ ہونے سے نہ بچا سکے۔ ایسی نئی بحر کس کام کی جس پر کسی دوسری بحر کا اشتباہ ہو۔ تم کہتے ہو کہ تم نے بحر بسیط مثمن سالم کے رکن ''فاعلن'' کو ''مفاعلن'' میں تبدیل کر دیا ہے اور یہ نیا وزن ایجاد کیا ہے: مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن ۔ تمھاری غزل کے مندرجہ ذیل تین مصرعے:

سینے میں آگ جل اٹھی لہجے میں رنگ آ گئے

☆

لاکھوں توہمات کے جالے پڑے ہیں ذہن میں

☆

خالی ہوئیں تو روح میں بھر کے امنگ آ گئے

جو پڑھے گا اس کا ذہن مشہور مروجہ بحر (رجز مطوی مخبون۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن) کی طرف جائے گا، اس وجہ سے وہ تمھارے باقی سات مصرعوں کو ناموزوں قرار دے گا۔

یہ تو پورے پورے مصرعے تھے جو ایک دوسری بحر میں پڑھے جا سکتے ہیں، مصرعوں کے کئی ٹکڑے بھی ایسے ہیں جو تمھاری ایجاد کردہ بحر کے علاوہ مذکورہ بحر میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ ذیل کے ٹکڑوں کا وزن مفتعلن مفاعلن بھی ہے۔

ہم تو بس ایک درد کی/ غرفہ ذرا سا کھل گیا/ دیکھا کہ دور دور سے/ اہل فرنگ آ گئے/ آنکھیں تری شبیہ سے/ ساقی کہیں اماں نہیں۔

غزل میں پانچ شعر ہیں، دس مصرعے ہیں اور بیس نصف مصرعے ہیں۔ ان میں سے تین مکمل مصرعے اور چھ نصف مصرعے دوسرے وزن میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ اب تم خود سوچو کہ نصف سے زیادہ غزل دوسری بحر میں پڑھی جا سکتی ہے، لہٰذا تمھاری ایجاد کیا ہوئی، یہ تو وہی پرانی بحر ہے۔

تمھارا یہ کہنا کہ تمھاری ایجاد کردہ بحر "مترنم" اور "قابل قبول" ہے اور تم نے اسے اپنے اندر کی موسیقی سے آزمایا ہے۔ یہ تمھارے اندر کی موسیقی کچھ خبثِ باطن قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے جو صرف تمھارے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے نہیں جنھوں نے باہر کی موسیقی بھی سنی ہے۔

لہٰذا میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم اس غزل کے وزن پر دوبارہ غور کرو۔ صرف آٹھ نصف مصرعوں میں تبدیلی کرنی ہوگی اور یہ غزل مروجہ بحر میں پڑھنے والے کو ذہنی جھٹکوں سے محفوظ کر دے گی۔ کوئی تمھیں اس کی داد نہیں دے گا کہ تم نے نئی بحر ایجاد کی ہے بلکہ جو یہ (۲) پڑھے گا یہی کہے گا کہ ساقی بحر عروض میں بے دست پا ہو کر غوطے کھا رہا ہے۔ (غوطے لگا نہیں رہا، کھا رہا ہے، دونوں کا فرق ملحوظ رہے)۔ تھوڑے لکھے کو بہت جانو اور اپنی عروض دانی کی دھاک بٹھانے کا خیال ترک کر دو۔ تم ساقی فاروقی ہی رہو، عروضی سمرقندی بننے کا سودا سر سے نکال دو۔

تمھارا

مشفق خواجہ

۱۸ جنوری ۱۹۹۴ء

۱۔ راغب مراد آبادی۔۔۔ کراچی کے ایک زود گو، ماہر عروض مگر برے شاعر۔

۲۔ میں نے ایک غزل: ہم تو بس ایک درد کی رحمت سے تنگ آ گئے (مستفعلن، مفاعلن، مستفعلن مفاعلن) لکھی تھی۔ قاسمی صاحب کو بھیج دی تھی۔ انھیں کچھ مصرعوں کا وزن سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے مشفق سے رجوع کیا۔ مشفق نے غلطی سے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔ ہم تینوں کی بحث "معاصر" لاہور، میں چھپ چکی ہے۔ لب لباب قاسمی صاحب کے آخری خط کے یہ فقرے تھے: "پیارے ساقی جی، ہم دونوں جو بڑے غصے سے ابھرے تھے، صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ فتح مبارک ہو۔"

WWW.KITABOSUNNAT.COM

(۵)

برادرم ساقی! خوش رہو۔

معذرت خواہ ہوں کہ میں تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ ہوا یہ کہ ادھر میں نے بہت سا وقت سیر و سیاحت میں گزارا۔ پہلے بہاولپور گیا اور وہاں آس پاس کے علاقوں (ملتان، اوچ، صحرائے چولستان وغیرہ) کی سیر کی اور پھر دسمبر کے آخری دس روز لاہور میں گزارے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہارے کاموں سے غافل رہا۔ لاہور میں مظفر علی سید سے ان دو کالموں کے عکس حاصل کیے جو انھوں نے تمہارے بارے میں لکھے ہیں؛ نقوش والوں کو یاد دہانی کرائی کہ 'باغ و بہار' اور 'فسانہ عجائب' (مرتبہ رشید حسن خان) کا ایک ایک نسخہ تمہیں بھیج دیں۔ امید ہے یہ کتابیں تمہیں اب تک مل چکی ہوں گی (۱)۔

پچھلے دنوں احمد ندیم قاسمی صاحب نے تمہاری غزل (اہل فرنگ آ گئے) مجھے بھیجی اور اس کے وزن کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی تائید کی اور لکھا کہ یہ غزل مروجہ بحر سے خارج ہے۔ انھوں نے تمھیں بھی اس کی اطلاع دی اور تم نے قاسمی صاحب کے نام دلچسپ خط لکھا۔ میں نے اس خط کا جواب کل تمہارے نام لکھا ہے جو آج اس خط کے ساتھ پوسٹ کر رہا ہوں۔ اس کی نقل قاسمی صاحب کو بھی بھیجوں گا۔ میرے منسلکہ خط پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور خوب سوچ سمجھ کر اس کا جواب دو۔ یہ ایک اصولی مسئلہ ہے جسے طے ہونا چاہیے تاکہ آئندہ تم کوئی نئی ''بحر'' ایجاد کرو تو کسی پرانی بحر پر دست تصرف دراز نہ کرو۔

تمہاری غزل (گہر ساز میں ہوا) بہت پسند آئی۔ ماشاء اللہ ترقی کر رہے ہو۔ ان شاء اللہ ایک دن اپنا اور اپنے مداحوں کا نام روشن کرو گے۔ اس غزل کی پچاس فوٹو اسٹیٹ تیار کرائیں، سب سے پہلے یوسفی صاحب اور زہرا نگاہ کو یہ غزل پیش کی اور پھر اندھے کی ریوڑیوں کی طرح غزل کی نقلیں تقسیم کر ڈالیں۔ یہ غزل صرف تمہاری غزلوں ہی میں نہیں، اردو کی غزلوں میں بھی امتیازی شان رکھتی ہے۔ جو پڑھتا ہے داد دیتا ہے بلکہ مجھے داد دیتا ہے جیسے یہ غزل میں نے تم کو لکھ کر دی ہو۔ البتہ اس شعر سے تشویش ہوئی۔

میں نے ہزار بار برہنہ کیا اسے
یہ معجزہ خیال کی پرواز میں ہوا

اب یہ ''کام'' تصوراتی طور پر انجام دینے لگے ہو! ایسا نہیں ہونا چاہیے حسب معمول عملی طور

WWW.KITAABGHAR.COM

پر مصروف رہو۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ مولوی عبدالحق کہا کرتے تھے کہ آدمی چالیس سال کی عمر میں پیدا ہوتا ہے اور اسے اپنی عمر کا حساب اسی سال پیدائش سے کرنا چاہیے اس اعتبار سے تو تم ابھی بیس برس کے بھی نہیں ہوئے، پھر یہ صورت حال کیوں؟ کشتے وغیرہ کھایا کرو۔

تم نے پوچھا ہے کہ کیا میرے مرنے کے بعد میری خدائی کا اعلان کرو گے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے کیوں کہ اگر تم مر گئے تو لوگ کہیں گے کہ یہ کیسا خدا تھا جو عام بندوں کی طرح رخصت ہو گیا۔ میری دعا ہے کہ تم صدوسی سال زندہ رہو اور اپنی خدائی کے مزے لوٹو، تا آنکہ ایک دن تمھاری آنکھیں کھل جائیں اور تم میر کے ہم زبان ہو کر یہ کہو، ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو میں نے معذرت[۲] کا خط لکھ دیا تھا۔ آج ان کا جواب آیا ہے۔ میرے خط سے ان کا رنج دور ہو گیا ہے اور اب وہ اس پر معذرت کر رہے ہیں کہ انھوں نے ایسا خط مجھے کیوں لکھا۔ انھوں نے ایک بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ اب بڑھاپے کی وجہ سے وہ زود رنج ہو گئے ہیں نیز حالات نے انھیں ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے کہ ذرا سی مخالفانہ بات بھی وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ میرے کالموں کا جو انتخاب چھپ رہا ہے، اس میں ایک جگہ فاروقی کا بھی "سخن گسترانہ" ذکر تھا، وہ میں نے نکال دیا ہے۔ اس کی اطلاع بھی انھیں دی تھی۔ اس سے وہ خوش ہوئے۔ میں تمھاری طرح تو ہوں نہیں کہ لوگوں کی دل آزاری کر کے خوش ہوں۔ اگر غیر شعوری طور پر کسی کی دل آزاری ہو جائے تو فوراً معذرت کر لیتا ہوں۔ کاش تم بھی اس مقام شرافت پر فائز ہوتے!

خدا کرے تم خیریت سے ہو۔

تمھارا
مشفق خواجہ

۱۹ جنوری ۱۹۹۴ء

پس نوشت: ہاں، رشید حسن خان کی مرتبہ کتابیں اگر اب تک نہ ملی ہوں تو احمد ندیم قاسمی صاحب کے ذریعے انھیں یاددہانی کرادو وہ ایک ٹیلی فون کر دیں تو کام ہو جائے گا۔

۱۔ میں نے رشید حسن خان کی مرتب کردہ کتابیں "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" منگوائی تھیں۔

۲۔ شمس الرحمٰن پر مشفق نے ایک سخت کالم لکھا تھا۔ شمس الرحمٰن نے اپنے ایک خط یا فون پر مجھ سے اپنی آزردگی کا اظہار کیا۔ میں نے اپنے مشفق کو فون کیا کہ فوراً شمس الرحمٰن سے رابطہ کریں کہ ان کا دل دکھایا ہوا ہے۔

(۶)

برادرم ساقی! خوش رہو۔

کل شام کو تم سے تین مرتبہ فون پر بات کر کے بے حد خوشی ہوئی اور اس خوشی میں شان الحق حقی صاحب بھی شریک ہوئے۔ بعد میں شان صاحب سے دیر تک تمھارے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ''ذہن جدید'' (۱) میں وہ تمھارا مضمون پڑھتے رہے اور ہنستے رہے (حالاں کہ ضرورت رونے کی تھی) یہ جان کر افسوس ہوا کہ تمھیں میرا وہ خط نہیں ملا جو میں نے تمھاری غزل کی رسید میں اور تمھارے خطوں کے جواب میں لکھا تھا۔ اچھا ہوا کہ میں نے اس کی فوٹو اسٹیٹ نقل رکھ لی تھی۔ اب یہ تمھیں بھیجتا ہوں۔ تمھارا خط نہ آنے کی وجہ سے مجھے یہ بدگمانی تھی، تم نے عمداً جواب نہیں لکھا کہ تمھیں میری باتیں پسند نہیں آتی ہوں گی لیکن یہ جان کر بدگمانی دور ہو گئی کہ تمھیں میرا خط نہیں ملا۔ اب یہ خط رجسٹری سے بھیجوں گا تا کہ ضائع ہونے کا امکان نہ رہے۔

''نردبان'' میں جو کچھ چھپا ہے، اس پر تم مشتعل نہ ہو۔ تمھارے خط کا یہ ردعمل تو ہونا ہی تھا۔ تمھیں جو کچھ کہنا تھا، تم نے کہہ دیا، اب ان لوگوں کو بھی دل کی بھڑاس نکال لینے دو۔ میری اطلاع کے مطابق تمھارے خلاف ابھی کچھ اور مضامین بھی چھپنے والے ہیں۔ اب یہ سلسلہ لمبا چلے گا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ لاہور کے ادبی حلقوں میں احمد ندیم قاسمی کے نام کا تمھارا خط (مورخہ ۲۸ فروری) بہت پسند کیا گیا اور وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ مناسب ہو گا صرف یہی خط شائع نہ ہو بلکہ اسی سلسلے کی میری، تمھاری اور قاسمی صاحب کی ساری خط و کتابت یکجا شائع کر دی جائے تا کہ معاملے کے سارے پہلو سامنے آ جائیں۔ میں قاسمی صاحب کو لکھ رہا ہوں اور میرے جو خط ان کے پاس نہیں ہوں گے، فراہم کر دوں گا۔

میں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں تمھارے مضمون نما خط پر ایک کالم لکھا ہے۔ اس کا عکس بھیج رہا ہوں۔ امید ہے تم پسند کرو گے۔ اس کالم کی وجہ سے بے شمار لوگوں کو تمھارے مذکورہ خط کا علم ہوا اور وہ اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ عالی صاحب اور بعض دوسرے کرم فرماؤں نے مجھ سے اس کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں طلب کیں۔ اتنے طویل خط کی کئی فوٹو اسٹیٹ بنوانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بادل ناخواستہ یہ کام کرنا پڑا۔

شاہدہ بہن کو میں نے فون کر دیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی صرف بات پکی ہوئی ہے۔ منگنی چند ماہ بعد ہوگی اور شادی چند سال بعد۔ وہ جلد ہی تمھیں خط لکھیں گی اور تصویریں بھیجیں گی۔

تمھارے خط کا انتظار رہے گا۔

تمھارا
مشفق خواجہ
۱۴ اپریل ۱۹۹۴ء

ا۔ ''ذہن جدید'' کے مدیر زبیر رضوی، ساجد رشید ہی کی طرح خوش نوا بھی ہیں اور تنک مزاج بھی۔ انھوں نے اپنے رسالے میں اگلے شمارے کی جھلکیوں، کا اعلان کیا۔ اس میں وزیر آغا پر میرے مضمون کا ذکر بھی تھا۔ آغا صاحب نے اپنے منشی انور سدید سے خط لکھوایا جو کچھ اس طرح کا تھا کہ ''اگر میرا مضمون چھپ گیا تو ہندوستان پاکستان کے تعلقات مزید خراب ہو جائیں گے۔'' یہ اس لیے کہ میں نے یہ مضمون سب سے پہلے وزیر آغا کو ہی بھیجا تھا اس نوٹ کے ساتھ کہ ''اسے 'اوراق' میں چھاپ دیجیے۔ تاکہ اس کی سفاکی کم ہو جائے ورنہ میں بجلی کو پٹر کرائے پر لے کر یہ تحریر سارے پاکستان پر برساؤں گا۔'' جواباً انھوں نے ''نردبان'' اور ''اردو زبان'' کے ساقی فاروقی نمبر نکالے تھے۔ میں واقعی خوش ہوا تھا۔

(۷)

ساقی خوش ادا ! خوش رہو ۔

تمھارا خط ملا۔ کالم ملا(۱) پڑھ کر مزہ آ گیا۔ مگر بھائی یہ تو سوچو جس کالم میں سینوں اور کولہوں کا ذکر ہو اور جس میں اسلامی تہمد بچھی ہوئی ہو اور علامہ اقبال کو سلفے سے لذت اندوز ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہو اور مسوں کو تیمم سے بھیگتا بتایا گیا ہو، وہ ''تکبیر'' جیسے پرچے میں کیسے چھپ سکتا ہے، جن لوگوں کو کھمبے میں بھی فحاشی نظر آتی ہو، انھیں تمھارے کالم میں فحاشی سے آگے کی چیزیں نظر آ سکتی ہیں۔ لہذا تم یہ کالم ''شب خون'' میں چھپنے کو بھیج دو۔

تمھاری غزل (۔۔۔ ایجاد کیوں نہیں کرتے) پڑھی۔ یوں تو سبھی شعر بہت عمدہ ہیں مگر 'مکالمے' والا شعر تو قیامت کا ہے۔ اسی طرح کی غزلیں کہتے رہو، ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن بہ حیثیت شاعر اس درجے پر فائز ہو جاؤ گے جس درجے پر شمس الرحمٰن فاروقی نے ظفر اقبال اور احمد مشتاق کو فائز کر رکھا ہے۔ ظفر اقبال تو خیر شاعر ہے مگر احمد مشتاق تو خود شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی گیا گزرا ہے۔ فاروقی پر تمھارے اثرات بہت زیادہ ہیں، کیا اسے تم راہ راست پر نہیں لا سکتے مگر تم تو خود کج رو ہو، اس کو راہ راست پر کیا لاؤ گے۔ خطرہ ہے کہ کہیں اس کی دوستی میں اس جیسی شاعری خود بھی نہ کرنے لگو۔

تمھارے کالم اور غزل کی نقلیں میں نے یوسفی صاحب اور زہرا نگاہ کو دے دی ہیں۔ اب وہ جانیں اور تم جانو۔

'تکبیر' والوں کے لیے جو ایک ہزار روپے تم نے بھیجے تھے، وہ میں نے ان کو پیش کر دیے۔ ان کی طرف سے موصول ہونے والی رسید بھیج رہا ہوں۔ امید ہے 'تکبیر' تمھیں مل رہا ہوگا۔

اچھا اب ایک بات نہایت توجہ سے سنو۔ تم جتنی اچھی نثر لکھتے ہو، اس کا ایک عمدہ نمونہ بھی تمھارے قلم سے نکلنا چاہیے تا کہ یادگار رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ میری تجویز ہے کہ تم اپنی آپ بیتی لکھو۔ تم نے جس طرح زندگی گزاری ہے اور جو جو کچھ تمھارے مشاہدے اور تجربے میں آیا ہے، اگر تم اسے بیان کر دو تو ایک لازوال کتاب وجود میں آ سکتی ہے۔ آپ بیتی ۔۔۔ سچی آپ بیتی لکھنے کے لیے جس جرأت اور اخلاقی بدلحاظی کی ضرورت ہے، وہ تمھارے سوا کسی اور میں نہیں۔ تم دوسروں کی نہیں، اپنی حرامزدگیوں کو بھی دیانت داری کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اردو زبان میں آج تک کوئی ایسی آپ بیتی نہیں لکھی گئی جو لکھنے والے کی جرأت و بے باکی کا منھ بولتا ثبوت ہو۔ لہذا قلم اٹھاؤ اور اس سفر پر چل نکلو۔ روسو اور سینٹ

WWW.KITAABGHAR.COM

(۷)

پیارے ساقی! خوش رہو۔

اقبال کا شعر تمھیں غلط یاد ہے اور یہ بھی درست نہیں کہ یہ "جاوید نامہ" میں ہے۔ صحیح صورت یہ ہے:

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم(۱)
پیشِ اقدام جہاں بے چادریم

یہ مثنوی اسرار خودی میں ہے۔ یہ شعر مثنوی کے جس حصے میں ہے، اس کا عکس بھیج رہا ہوں۔ اس سے تمھیں شعر کا محل استعمال معلوم ہو جائے گا اور اصل واقعہ بھی۔ اگر تمھاری فارسی، تمھاری اردو کی طرح کمزور نہیں ہے تو تم ان اشعار کو آسانی سے سمجھ لو گے۔ بصورت دیگر ڈاکٹر خالد حسن قادری کو فون کر کے رہنمائی حاصل کرو مگر احتیاط لازم ہے۔ قادری صاحب فنِ تاریخ گوئی میں اتنے ماہر ہیں کہ کسی شعر کا مطلب بتانے سے پہلے وہ یہ بھی بتائیں گے کہ اس کے دونوں مصرعوں سے کس کس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ خدا انھیں سلامت رکھے کہ تاریخ گوئی کے میدان کے وہ آخری مرد ہیں۔ گو عمر کی جس منزل میں وہ ہیں، اس میں مرد عورتوں کی تفریق باقی نہیں رہتی۔ صرف نام سے کام چلتا ہے۔ جس طرح تم پیر مغاں بن چکے ہو مگر ساقی ہی کہلاتے ہو۔ مزید مثال یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا کاظم علی جوان نوے سال کی عمر میں بھی جوان ہی کہلاتا تھا۔

چار روز پہلے تمھارا فون آیا تو تمھارے تازہ ترین حالات معلوم ہوئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم اپنے کتوں، بلیوں، بلوں، پھوؤں، بچھوؤں اور دیگر ہم مشربوں کے ساتھ نہایت خوش و خرم ہو۔ خدا تمھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ امید ہے تمھارے ہم مشرب بھی تمھارے ساتھ خوش ہوں گے۔ اگرچہ اس کے امکانات کم ہیں۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ تمھارے ایک بلے کا حسن غارت ہو گیا ہوگا۔ میری مانو تو جہاں اتنی رقم صرف کی ہے، تھوڑی سی اور صرف کر کے اسے مصنوعی دانت لگوا دو۔ یا پھر کچھ دن انتظار کرو، اس کے باقی دانت بھی "جھڑ" جائیں تو اپنی کوئی پرانی بتیسی اس کے منھ میں ڈال دو۔ اس طرح وہ تمھارے دندان آز سے شریفوں کو زیادہ آزار پہنچا سکے گا۔

مگر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کتے بلیوں پر تم سینکڑوں پونڈ صرف کر دیتے ہو مگر شعرائے کرام پر دو چار پونڈ بھی خرچ نہیں کرتے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک بڑے شاعر نے فون کر کے تمھیں اپنی میزبانی کا شرف عطا کرنا چاہا تو تم نے بہانہ کر دیا کہ تم مصر جا رہے ہو۔ میں اسی لیے لندن نہیں آتا کہ تم میرے ساتھ

یہی سلوک کرو گے بلکہ اس سے زیادہ کہ واقعی مصر لے جاؤ گے حالاں کہ اب وہاں کوئی بازار نہیں لگتا اور کوئی خریدار نہیں ملے گا۔ شاعر موصوف کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم کہیں نہیں گئے۔ لندن ہی میں موجود تھے، لہٰذا بہتر ہو گا کہ موصوف کو فون کر کے معذرت چاہو بلکہ یہ مژدہ بھی سناؤ کہ آئندہ تم پاکستان آؤ گے تو انہی کے دولت خانے پر قیام کرو گے (۲)۔

میں خوش ہوں کہ میری فرمائش پر تم نے آپ بیتی لکھنی شروع کر دی ہے مگر یہ جان کر تشویش ہوئی کہ تم اس میں مذہب اور خدا کے بارے میں اپنے خیالات فاسدہ کا اظہار کرو گے۔ خدا کے لیے ایسی حماقت نہ کرنا۔

سیدھی سادی اپنے فسق و فجور کی داستان لکھو۔ بڑھاپے میں ایسی داستانیں لکھنے میں مزہ آتا ہے اور وقت اچھی طرح گزرتا ہے۔ تم نے جو نشیب و فراز (نشیب زیادہ اور فراز کم) دیکھے ہیں، ان کی داستان لکھو۔ اب تک دوسروں کے بارے میں سچ بولتے رہے ہو، اب اپنے بارے میں سچ لکھ کر دیکھو۔ اگرچہ یہ کام مشکل ہے مگر تم کر گزرو گے کہ مشرقی شرم و حیا کو تم یہیں چھوڑ گئے تھے۔ نثر لکھنے کا یہ فائدہ بھی ہو گا کہ شاعری کی عصمت محفوظ رہے گی۔ خدا کا ذکر کتاب کے آخر میں صرف اتنا کرنا کہ اس سے صدقِ دل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لینا۔

افسوس کہ ورق تمام ہوا، ابھی تمھاری مدح باقی ہے۔ پھر کبھی سہی۔

تمھارا واحد خیر خواہ
مشفق خواجہ
۲۳ اگست ۲۰۰۰ء

پس نوشت: ہاں ایک ضروری بات یہ ہے کہ آپ بیتی کی نثر اتنی عمدہ ہونی چاہیے کہ اگر امتدادِ زمانہ سے تمھاری شاعری تقویم پارینہ بن جائے تو تمھاری نثر تمھیں زندہ رکھے۔

۱۔ مجھے پہلا مصرع یاد آیا تھا: "ماکہ از" خاتون طے عریاں تریم
خواجہ پیا نے بتایا کہ "ماراز" نہیں بلکہ "ما ازاں" ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ شاید یہ "جاوید نامہ" میں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ "یہ اسرارِ خودی" میں ہے۔"

۲۔ جمیل الدین عالی نے امریکہ سے فون کیا: "تمھارے یہاں ایک ہفتے کے لیے ٹھہرنے کے لیے آرہا ہوں"۔ میں نے انھیں کہا "کہیں ٹھہریے اور وہاں ناشتہ، لنچ اور شام کا کھانا میرے یہاں ہوتا رہے گا۔ میں آپ کے نوابی للے تللے نہیں کر سکتا"۔ وہ دس سال پہلے صرف ایک بار میرے پاس یہاں ٹھہرتے تھے اور میں ان کی خدمت کر کے بدحواس ہو گیا تھا۔

(بنام نیرّ مسعود)

(۱)

محترمی و مکرمی! تسلیمات۔

یہاں کے حالات آج کل کچھ ایسے ہیں کہ ذہنی سکون ناپید ہے اور پھر میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں آسمانی بلاؤں کا نزول کچھ زیادہ ہی رہتا ہے۔ دعا کیجیے کہ حالات بہتر ہوں۔

میں نے پچھلے خط میں اطلاع دی تھی کہ کلیات یگانہ کی کمپوزنگ شروع ہو گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات کمپوز ہو چکے ہیں۔ اتنے ہی صفحات اور ہوں گے۔ امید ہے کہ اس سال کے آخر تک کلیات چھپ جائے گی۔

چراغ سخن کا پہلا ایڈیشن بالآخر مل گیا۔ اس کے سرورق پر وہ شعر موجود ہے جو آپ نے اپنی یادداشت سے لکھا تھا (۔۔۔انتظام باغ سخن) آپ کے حافظے کی داد دیتا ہوں۔

'کارامروز' کے شمارے اب تک نہیں ملے۔ تجس اعجازی صاحب نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان شماروں کو تلاش کریں گے۔ ذرا ایک مرتبہ پھر ان کو متوجہ فرمائیے۔ حیرت ہے کہ لکھنؤ میں یہ رسالہ دستیاب نہیں۔

میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت کا طالب

آپ کا
مشفق خواجہ

۱۵ فروری ۱۹۹۰ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر نیرّ مسعود لکھنؤ

(۲)

محترمی و مکرمی! تسلیمات ۔

فروری کے وسط میں ایک دوست دہلی گئے تھے۔ ان کے ذریعے ایک خط بھیجا تھا، امید ہے ملا ہو گا۔ اس میں میں نے عرض کیا تھا کہ یگانہ کے وہ مضامین جو 'صلائے عام' میں شائع ہوئے تھے، وہ 'اردو' میں یک جا شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ شمارہ چھپ گیا، ارسال خدمت ہے۔ آج کل ڈاکٹر انور معظم اور جیلانی بانو یہاں تشریف فرما ہیں۔ ان کو زحمت دے رہا ہوں۔ وہ یہ خط اور رسالہ آپ کو ڈاک سے بھیج دیں گے۔

'نیا دور' کا اودھ نمبر مع ضمیمہ مجھے مل گیا ہے مگر اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے، سوائے اس کے کہ ایک دو مضامین اچھے ہیں۔

کالموں کا انتخاب مکتبہ جامعہ نے شائع کر دیا ہے۔ میں نے ابھی دیکھا نہیں۔ 'کتاب نما' میں اشتہار نظر سے گزرا ہے۔

اس سال اکتوبر میں آپ سے ملاقات کو دس سال پورے ہو جائیں گے۔ وقت کتنی جلدی گزرتا ہے!

کلیات یگانہ کی کمپوزنگ متن کی حد تک مکمل ہو گئی ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات ہوئے ہیں۔ مقدمہ، حواشی، اشاریہ اور فرہنگ وغیرہ کے ڈھائی سو صفحات ہوں گے۔

تجسس اعجازی صاحب نے 'کار امروز' کے بارے میں کچھ بتایا نہیں۔ اگر ان سے اس رسالے کے شمارے مل جائیں تو یگانہ کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۹ اپریل ۱۹۹۰ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر نیر مسعود، لکھنؤ

(بنام ڈاکٹر اسلم پرویز)

(۱)

محترمی ومکرمی! سلام مسنون۔

میں ۱۷، اکتوبر کو لاہور گیا تھا۔ یکم نومبر کو واپس آیا تو جمع شدہ ڈاک میں نیشا سلمہا کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس بچی کی زندگی کا نیا دور اس کے لیے اور اس کے تمام متعلقین کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو۔ ہم دونوں کی دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

دولھا دلھن سے کہیے کچھ دنوں کے لیے یہاں سیر کے لیے آئیں۔ شادی کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام ہم کریں گے جس میں آپ کے ان تمام دوستوں کو مدعو کیا جائے گا جو مکانی فاصلے کی وجہ سے ۲۰ اور ۲۷، اکتوبر کی تقاریب میں شریک نہیں ہو سکے۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آمنہ آپ کو اور بھابھی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہیں اور مبارک باد پیش کر رہی ہیں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۵۔ نومبر ۱۹۹۰ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب
دہلی۔

(۲)

محترمی و مکرمی! سلام مسنون۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۴، دسمبر ۱۹۸۶ء کو مل گیا تھا جس میں آپ نے اپنی کتاب 'بہادر شاہ ظفر' کی ترسیل کی اطلاع دی تھی۔ میں اس انتظار میں رہا کہ کتاب آ جائے تو خط لکھوں۔ بے حد انتظار کے بعد یہ کتاب کل ملی ہے اور آج خط لکھ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اتنی دیر میں کتاب سے استفادہ ممکن نہیں، لیکن رات کئی گھنٹوں تک اس کی ورق گردانی کرتا رہا ہوں۔ جی خوش ہو گیا۔ آپ نے میری آنے والی کئی راتوں کے جاگنے کا انتظام کر دیا ہے۔ اب اس کا ورق بہ ورق اور لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا۔ نیشنل آرکائیوز کے ذخیرے سے آپ نے استفادہ کر کے بہت سا ایسا مواد پیش کیا ہے جس نے کتاب سے میری دل چسپی کو بڑھا دیا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے ایسے عمدہ تحفے سے مجھے نوازا۔

ایک زحمت دے رہا ہوں۔ ہم لوگ ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک 'ارمغانِ علمی' پیش کر رہے ہیں۔ اس کے لیے آپ اپنی دل چسپی کے کسی موضوع پر ایک مقالہ عنایت فرمائیے۔ اگر اگلے دو ماہ میں آپ یہ مقالہ عنایت فرما سکیں تو بے حد کرم ہوگا۔

آپ سب لوگ بے حد یاد آتے ہیں، جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے دہلی میں گزارے ہوئے دن زیادہ یاد آ رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے ہم دونوں کو جس محبت اور خلوص سے نوازا اس کے لیے ہم ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔ آپ نے پاکستان آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد آپ کی مصروفیات کم ہو گئی ہوں گی۔ اب کچھ وقت ہمارے لیے بھی نکالیے۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو پیار۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۴ مارچ ۱۹۸۷ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب
دہلی۔

(بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

(۱)

برادر عزیز و مکرم! سلام مسنون۔

آپ کے دونوں خط ملے اور اقبال سے متعلق مقالے کا عکس بھی۔ ان عنایات کے لیے ممنون ہوں۔ علامہ اقبال کی رائے کی جلیل قدوائی کے بارے میں ضرورت تھی۔ آپ کے مضمون سے کام چل جائے گا(۱)۔ اقبال کا متعلقہ شمارہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''دائرے'' والوں کو آپ کا پتا دے دیا ہے اور کہا ہے کہ پچھلے چند شمارے آپ کو بھجوا دیے جائیں۔

رسالہ ''اردو'' کے شمارے آپ کو بھجوا دیے تھے، امید ہے ملے ہوں گے۔

اب کے میرا بہاول پور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگرچہ وہاں کی سنٹرل لائبریری میں گزشتہ صدی کے بعض اخبارات (اودھ اخبار وغیرہ) سے استفادہ کرنا ہے۔ اب اگلے سال میں پروگرام بناؤں گا۔ ویسے مجھے بہاول پور بہت پسند آیا۔ کاش کوئی صورت ایسی ہوتی کہ میں اپنے کتب خانے سمیت وہاں ''آباد'' ہو سکتا۔ کراچی کی زندگی نہایت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ اپنے کتب خانے کی طرف سے سخت پریشان ہوں کہ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔

سویا مانے کا مقالہ بہت اچھا۔ مواد کے اعتبار سے زبان و بیان کی غلطیاں دور ہو جائیں تو اس کا چھپنا بہت ضروری ہے۔ زاہد منیر عامر صاحب سے کہیے کہ وہ اس کام کو اردو کی خدمت سمجھ کر انجام دیں(۲)۔

آج کل میں یگانہ کے سلسلے میں قیام پاکستان سے پہلے کے ادبی جرائد دیکھ رہا ہوں۔ بہت بڑا ذخیرہ تو خود میرے کتب خانے میں ہے۔ اقبال کے بارے میں بہت سی چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ ان پر نشان لگا کر رکھتا جا رہا ہوں کہ کبھی آپ کراچی تشریف لائیں تو انھیں دیکھیں گے۔

میرے پاس ایک کتاب ''تحفہ امانیہ'' ہے جو نجف علی خاں اتالیق امیر امان اللہ خاں کی تصنیف ہے۔ یہ صاحب ایک زمانے میں کابل جیل میں نظر بند تھے۔ قید کے دوران انھوں نے مذکورہ عنوان سے ایک پندنامہ منظوم اپنے بیٹے کے لیے لکھا تھا جو کریمی پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے آخری سرورق پر علامہ اقبال کی ایک سطری ''تقریظ'' ہے۔ یہ کتاب آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ بہر حال اس وقت یہ سامنے ہے تو اس کی تقریظ کیے دیتا ہوں:

تقریظ

از ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ملک الشعراء مشرق سطریں مطابق اصل میں نے یہ نظمیں سرسری نظر سے دیکھ لیں۔ مصنف کا جوش عقیدت قابل داد ہے۔ اقبال

یہ عبارت سبز روشنائی میں چھپی ہے۔ امتداد زمانہ سے روشنائی اتنی مدھم ہو گئی ہے کہ عکس نہیں بن سکتا۔ کتاب پر سال طباعت درج نہیں ہے۔ البتہ سرورق نمبر ۲ پر انتساب کی عبارت کے نیچے مصنف کے نام کے ساتھ یہ تاریخ درج ہے۔ ماہ قوس ۱۳۰۲ش۔

شاید آپ کے علم میں ہو کہ لاہور کا مشہور کریمی پریس میرے نانا کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میرے ماموں ایک عرصے تک اسے چلاتے رہے۔ میں اس پریس کی طبع کردہ کتابیں جمع کرتا رہتا ہوں۔ مذکورہ کتاب اسی سلسلے میں میرے پاس ہے۔

''اقدار'' میں نہیں خریدتا۔ شروع کے ایک دو پرچے دیکھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ رشید حسن خاں کے مضمون کے لیے ایک دوست سے کہہ رکھا ہے جونہی مل گیا، پیش کر دوں گا۔ (۳)

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۶ اکتوبر ۱۹۹۴ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اردو لیکچرار کے امیدواروں کے کاغذات، رائے کے لیے علامہ اقبال کو بھجوائے تھے۔ امیدواروں میں جلیل قدوائی بھی شامل تھے۔ اقبال کی رائے بڑی حد تک ان کے حق میں تھی۔ راقم نے اپنے ایک مضمون (''اقبال کے پانچ غیر مدون خطوط'' مطبوعہ ''صحیفہ'' لاہور، اقبال نومبر ۱۹۷۷ء) میں اقبال کا مذکورہ خط شامل کیا تھا، یہاں اسی مضمون کا ذکر ہے۔

۲۔ سویامانے یاسر (حال ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، اوساکا یونی ورسٹی برائے مطالعات غیر ملکی) نے ایم اے اردو کا یہ مقالہ بہ عنوان ''غلام عباس: سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ'' شائع کر دیا تھا (سنگ میل لاہور، ۱۹۹۶ء)

۳۔ مجھے ''اقدار'' کراچی میں شائع شدہ مضمون ''کلام اقبال کی تدوین'' (رشید حسن خاں) کی تلاش تھی۔ بعد ازاں یہ مضمون ''سیارہ'' لاہور (ستمبر ۱۹۹۹ء) میں شائع ہوا۔ اب یہ رشید حسن خاں کی ''تدوین، تحقیق، روایت (دہلی ۱۹۹۹ء) اور راقم کی ''اقبالیات: تفہیم و تجزیہ'' (لاہور ۲۰۰۴ء) میں بھی شامل ہے۔

(۲)

برادرِ عزیز و مکرم !

سلام مسنون۔

کراچی کے ہنگاموں کی وجہ سے آپ کا خط خاصی تاخیر سے ملا۔ آپ نے جواب مفصل دیا۔ بڑی زحمت اٹھائی۔ بے حد ممنون ہوں۔ آپ کا مضمون میرے ذہن میں نہیں تھا، عکس دیکھا تو یاد آیا کہ نظر سے گزر چکا ہے۔ غالب لائبریری کے میں جو مجموعہ شائع کر رہا ہوں، اس میں صرف وہی مضامین ہوں گے جو اردو میں لکھے گئے ہیں۔ تراجم شامل نہیں ہوں گے۔ اس مجموعے کا ایک حصہ اقبال سے متعلق مضامین پر مشتمل ہوگا۔ اگر آپ اپنے مضمون پر نظر ثانی کر دیں تو اسے اس حصے میں بطور دیباچہ شامل کر لیا جائے۔ بعد میں آپ ''اقبالیاتِ ممتاز حسن'' کو وسیع پیمانے پر مرتب کر دیجیے۔ ڈاکٹر معز الدین کی کتاب بڑی حد تک ناقص ہے اور یہ موضوع آپ جیسے کسی صاحب نظر کا منتظر ہے (۱)۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ممتاز حسن مرحوم کے قدر دان ہیں۔ مجھے ان سے نیاز مندی کا تعلق تھا۔ بے حد شفیق اور مہربان بزرگ تھے۔ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جس زمانے میں وہ مولوی عبدالحق کے نام اقبال کے خطوط مرتب کر رہے تھے۔ اس زمانے میں خاصا وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا۔ کتاب کے دیباچے میں بھی انھوں نے میرا تذکرہ بڑی شفقت سے کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عظیم انسان نہیں دیکھا۔ ہر شخص کی مدد پر آمادہ رہتے تھے۔ ادیبوں کو تو انھوں نے اتنے فائدے پہنچائے اور ایسے ایسے طریقوں سے کہ آپ سنیں تو حیران ہوں۔ پاکستان کے کئی اہم علمی اداروں کے وہ بانی تھے اور شاید ہی کوئی ادارہ ہو جس کی انھوں نے مدد نہ کی ہو۔ جب وہ برسرِ اقتدار تھے تو لوگ ان کی خوشامد کرتے تھے لیکن جب وہ ریٹائر ہو گئے تو لوگ ان سے یوں کنارہ کش ہو گئے جیسے ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہو۔ مرحوم کو اس صورت حال کا شدید احساس تھا اور مرنے کے بعد انھیں بالکل ہی بھلا دیا گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ احمد دین والی کتاب (۲) میں نے انھیں کے نام منسوب کی تھی اور حامد عزیز مدنی کا یہ شعر لکھا تھا:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

شان الحق حقی صاحب کو مرحوم سے دلی عقیدت ہے، انھیں کے اشتراک سے ممتاز صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ کچھ مضمون ان کے پاس تھے، کچھ میں نے جمع کیے ہیں۔ توقع ہے کہ اگلے سال کے شروع میں یہ مجموعہ چھپ جائے گا۔ کمپوزنگ شروع ہو گئی ہے۔ اس جمعہ کو ڈیڑھ سو صفحات کمپوز ہو کر آ جائیں

گے۔ اس مجموعے میں آپ کے مضمون کی شمولیت سے مرحوم کی روح خوش ہوگی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس مضمون کو پڑھ کر بے حد خوش ہوتے۔

آپ نے مرحوم کے جن مضامین کی نشان دہی کی ہے، ان میں سے بعض میرے پاس ہیں۔ ڈاکٹر معز الدین کی کتاب میں شامل متون پر اعتبار نہیں۔ اصل ماخذ کو دیکھوں گا۔ اگر کوئی مشکل پیش آئی تو آپ کو زحمت دوں گا۔

مرحوم عبداللہ قریشی کے بارے میں کراچی میں تو کسی اخبار تک میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ ان کے بارے میں آپ یا اگر کوئی اور لکھ سکے تو ''قومی زبان'' کے صفحات حاضر ہیں۔ آپ نے جو انٹرویو لیا تھا، ایک تازہ تمہید کے ساتھ بھجوا دیجیے۔ تمہید میں ان کے مختصر حالات بھی دے دیجیے (۳)۔

اکرام چغتائی صاحب سے رابطہ ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسلام آباد میں وہ میرے چھوٹے بھائی کے پاس بیٹھے تھے، بھائی نے فون پر ان سے بات کرا دی۔

فروغ احمد صاحب کے انتقال کا بے حد افسوس ہوا (۴)۔ آٹھ دس سال پہلے وہ کراچی میں علاج کے سلسلے میں آئے تھے تو ان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ پاشا رحمان صاحب کے ہاں ان کا قیام تھا۔ چند روز ہوئے پاشا صاحب آئے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ فروغ صاحب پر ایک مضمون لکھ دیں۔ ایک تعارفی مضمون ''قومی زبان'' کے لیے بھی کسی سے لکھوا دیجیے۔

مرحوم کا ایک طویل غیر مطبوعہ مقالہ غلام عباس پر میرے پاس ہے۔ یہ ''تخلیقی ادب'' کے غلام عباس نمبر کے لیے لکھوایا تھا۔ یہ نمبر ایک عرصے سے ''زیرِ طبع'' چلا آرہا ہے۔

۱۔ یہ ذکر ہے ''مقالاتِ ممتاز حسن'' (مرتبہ: شان الحق حقی۔ ادارہ یادگارِ غالب کراچی۔ ادارہ یادگار غالب کراچی، ۱۹۹۵ء) کا...... راقم نے ''علامہ اقبال اور ممتاز حسن'' کے عنوان سے ''قومی زبان'' (اپریل ۱۹۷۵ء) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے ایما پر یہ مضمون نظر ثانی کے بعد، متذکرہ بالا مجموعے کے حصہ 'اقبالیات' میں بطور پیش لفظ ''ممتاز حسن: ایک ممتاز اقبال شناس'' کے عنوان سے شامل کیا گیا۔

۲۔ خواجہ صاحب نے مولوی احمد دین کی کتاب ''اقبال'' (۱۹۲۶ء) کا نیا ایڈیشن حواشی و تعلیقات کے ساتھ میں نے انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی شائع کیا تھا۔

۳۔ راقم نے ''سیارہ'' مئی جون ۱۹۸۸ء میں محمد عبداللہ قریشی (م: ۱۲ اگست ۱۹۹۴ء) سے ایک مصاحبہ (انٹرویو) شائع کیا تھا۔

۴۔ پروفیسر فروغ احمد (م: ۲ نومبر ۱۹۹۴ء) شاعر، ادیب، قائداعظم کالج ڈھاکا میں اردو کے استاد۔ تفصیل دیکھیے: ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ: ''پروفیسر فروغ احمد: حیات اور خدمات'' از ناظمہ اعجاز، ۱۹۹۰ء۔ مخزونہ اورینٹل کالج لائبریری، لاہور

WWW.KITABOSUNNAT.COM

تحسین فراقی صاحب کا کیا حال ہے؟ میں نے ان کے خسر کے انتقال پر تعزیت کا خط لکھا تھا۔ اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہیں۔ زاہد منیر عامر کے نئے تقرر سے خوشی ہوئی۔ وہ صحیح جگہ پہنچ گئے۔ ''خدا بخش جرنل'' کے تازہ شمارے میں ان کا مضمون دیکھا۔ بہت اچھا مضمون ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر صاحب کا ایک عرصے سے کوئی خط نہیں آیا۔ ان سے کہیے کہ خط لکھیں۔ پچھلے دنوں سہیل عمر صاحب آئے تھے۔ ایک روز ان سے طویل ملاقات رہی۔

باقی سب خیریت ہے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء

WWW.KITAABISTAN.COM

(۳۰)

برادر عزیز و مکرم! سلام مسنون ۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲، اپریل ملا۔ پچھلا دو سطری خط آپ نے اس وقت لکھا تھا جب آپ لاہور سے باہر جا رہے تھے۔ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ واپس آ کر مفصل خط لکھوں گا۔ تازہ خط تو پچھلے خط سے بھی مختصر ہے۔ وہ مفصل خط آپ کب لکھیں گے؟ شاید ہندوستان سے واپس آ کر کہ اس وقت لکھنے کے لیے آپ کے پاس لوازمہ بھی ہوگا۔ ہندوستان جانے کی اطلاع دل خوش کن ہے (۱)۔ ہمارا تہذیبی و ثقافتی ماضی وہیں ہے اور اس ماضی سے ہمیں گاہے گاہے تعلق رکھنا چاہیے۔ ہندوستان جانے کو میرا بھی دل بہت چاہتا ہے مگر خود ساختہ زنجیریں وسعتِ زنجیر سے باہر نکلنے نہیں دیتیں (۲)۔

آپ نے لکھا ہے کہ ''ارمغان'' ۳۔۴ ماہ میں تیار ہو جائے گا۔ تحسین فراقی صاحب نے ایک دو ماہ کا مژدہ سنایا ہے۔ وہ شاید ارمغان کو بھی غزل سمجھتے ہیں جو ایک دو ماہ میں تیار ہو جائے گی۔ آپ کا مؤقف درست ہے، ارمغان کی تیاری میں کم از کم اتنا وقت ضرور صرف ہونا چاہیے، جتنا داستان امیر حمزہ کے لکھنے میں صرف ہوا تھا (۳)۔

میں نے آپ لوگوں ہی کی خاطر جھنڈیر کا پروگرام بنایا تھا، آپ ساتھ نہیں ہوں گے تو کیا مزہ۔ لہذا میں نے بھی وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ آئندہ کبھی ارادہ ہوا تو وہاں کسی سے محفل کے انعقاد کا انتظام کروں گا تا کہ آپ اور فراقی صاحب سرکاری حیثیت میں شرکت کر سکیں (۴)۔

رفاقت علی شاہد صاحب (۵) کے ہاتھ میں نے ''جاڑے کی چاندنی'' بھجوا دی تھی ۔ چند دیگر کتب و رسائل بھی بھیجے تھے۔ کیا یہ چیزیں آپ کو مل گئیں؟

لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا سدِ باب ہونا چاہیے۔ ان کے خلاف کئی گشتی مراسلے میرے پاس آئے ہیں جن کا لب و لہجہ نہایت ناشائستہ ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ ہم اپنے بڑوں کی قدر نہیں کرتے تھے، اب یہ ہو رہا ہے کہ ہم انہیں ذلیل بھی کرتے ہیں (۶)۔

پچھلے دنوں اہلیہ کی طبیعت ناساز رہی۔ میری صحت بھی ڈانواں ڈول رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ نیت ڈانواں ڈول رہتی تھی، اب یہ عالم صحت پر گزر رہا ہے۔ انقلابات ہیں زمانے کے! اور درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

رشید حسن خاں صاحب کا ایک خط آپ کے نام آیا ہے، وہ بھیج رہا ہوں۔ احتیاطاً لفافہ رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔

کہ اتنی دور سے آیا ہے خط ضائع نہ ہو جائے۔ لفافے میں دو اور خط بھی رکھ دیے ہیں۔ یہ از راہ کرم ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر اورنگ زیب تک پہنچا دیجیے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۱۰ اپریل ۱۹۹۷ء

۱۔ راقم کو پروفیسر تحسین فراقی اور پروفیسر محمد ایوب صابر کی رفاقت میں جون ۱۹۹۷ء میں بھارت کا سفر درپیش ہوا تھا، بہ سلسلہ علامہ اقبال سیمی نار، بہ اہتمام شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی۔ تفصیل دیکھیے: ''دہلی میں اقبال سیمی نار'' (رسالہ ''اقبالیات'' لاہور، جولائی ۱۹۹۷ء) ۲۔ اس سے پہلے خواجہ صاحب ۱۹۸۵ء میں بھارت جا چکے تھے۔

۳۔ مراد ہے ''ارمغان علمی، بپاس خدمات علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی'' جسے عارف نوشاہی، تحسین فراقی اور راقم نے مرتب کیا تھا۔ (القمر انٹرپرائز لاہور، ۱۹۹۸ء)

۴۔ جھنڈیر لائبریری (میلسی) جانے کا پروگرام بالآخر اپریل ۲۰۰۱ء میں روبہ عمل آ سکا۔ خواجہ صاحب کراچی، تحسین فراقی اور اورنگ زیب عالمگیر لاہور سے جھنڈیر پہنچ گئے مگر افسوس کہ راقم وہاں نہ جا سکا اور خواجہ صاحب کی چند روزہ صحبت سے محروم رہا۔

۵۔ رفاقت علی شاہد (پ: ۱۹۶۶ء) متعدد کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ انیسویں صدی میں اردو گل دستے کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ زیر تصنیف ہے۔

۶۔ یہ ذکر ہے ان گمنام مراسلوں کا جن کے ذریعے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی کردار کشی کی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ آئندہ میقات کے لیے وہ اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر مقرر نہ ہو سکیں۔ نامعلوم مہم چلانے والے اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

(۴)

برادرِ عزیز و مکرم! سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۲۴ مئی موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ "ارمغان وحید" کا کام کچھ آگے بڑھا ہے مگر آپ دونوں تو اس سے بھی آگے بڑھ رہے ہیں کہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ یہ سفر رفتن مبارک باد..... خدا کرے یہ سفر علمی اعتبار سے مفید ہو اور آپ خیریت کے ساتھ واپس آئیں۔ خیریت کے ساتھ ہی نہیں بہت سی کتابوں کے ساتھ بھی۔ واپس آ کر مفصل خط لکھیے گا جو سفرنامے کی طرح طویل اور دلچسپ ہو مگر آپ کا سفرنامہ تو شرعی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ہم جیسے آوارہ خوانوں کی خاطر اب کے دو چار اچھے چہرے بھی دیکھ لیجیے گا۔ اس کارِ خیر کا گناہ میرے سر رہے گا۔ آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی (۱)۔

کتاب کا نام ارمغان وحید ہی مناسب ہے۔ گوہر نوشاہی صاحب سے آپ مایوس ہو جائیے۔ ڈاکٹر صاحب کے مختصر کوائف اور کتابیات کی شمولیت کافی رہے گی۔ میں گوہر صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ اب وہ زحمت نہ فرمائیں اور اپنا مضمون اس وقت مکمل کریں جب ڈاکٹر وحید قریشی دوبارہ مقتدرہ کے صدر نشین ہوں (۲)۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی اس مجموعے میں شمولیت بہت ضروری ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان سے ایک مختصر مضمون حاصل کر لیا جائے؟ اس کی مجلس مشاورت و ادارت کے صدر احمد ندیم قاسمی ہیں، کیا ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک دو صفحات ان سے نہ لکھوا لیے جائیں؟ اگر آپ ان تجاویز سے متفق ہوں تو ان دونوں حضرات کو میں خط لکھ سکتا ہوں۔ مجموعی طور پر ان دونوں کے مضامین ۱۵۔۲۰ صفحات میں آ جائیں گے اور اس طرح دو بڑے ناموں کی شمولیت بھی ہو جائے گی (۳)۔

مضامین کی فہرست سے اندازہ ہوا کہ اچھا خاصا مجموعہ بن گیا ہے۔

دہلی میں اگر کوئی پرسانِ حال ملے تو میرا سلام کہیے گا۔ دو بزرگوں تک اگر آپ بطور خاص سلام پہنچا سکیں تو کرم ہوگا۔

ایک تو ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور دوسرے شاہد علی خان صاحب (مکتبۂ جامعہ)۔

شدید گرمی اور بجلی کے غائب ہونے کے باوجود اپنے کاموں میں حسب معمول مصروف ہوں اور کالم لکھنے کی وجہ سے ذہنی سکون بھی میسر ہے۔

WWW.KITAABISTAN.COM

ایک خط عبدالغنی فاروق صاحب کے نام بھی لکھ رہا ہوں۔ ازراہ کرم ان تک پہنچا دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۸ مئی ۱۹۹۷ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ افسوس ہے میں بھارت کا سفرنامہ نہ لکھ سکا۔ فقط پہلی قسط ''سرزمین دلی کی'' کے عنوان سے ''علامت'' لاہور (اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوئی۔

۲۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا مضمون، بعدازاں مکمل ہوکر ''ارمغان علمی'' میں شامل ہوا۔

۳۔ متذکرہ مجموعے میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا مضمون ''حقیقت اور فکشن'' شامل ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے کتاب کی ''تقدیم'' تحریر کی تھی۔

(۵)

برادر عزیز و مکرم! سلام مسنون۔

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے خطوط لکھنے کا سلسلہ جو دہلی میں شروع کیا تھا، وہ آج تک قائم ہے۔ آج کی ڈاک سے اخباری تراشوں کے فوٹو اسٹیٹ ملے ہیں۔ دلی کا سفر نامہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے مگر جب آپ اسے اشاعت کے لیے لکھیں گے تو اس کی افادیت اور دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں اب تک آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ ادھر کچھ دنوں سے میری اور آمنہ کی طبیعت خراب رہی۔ شدید گرمی، بجلی کا غائب رہنا اور اس پر طبیعت کی خرابی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس عذاب سے گزر رہا ہوں گا۔ میں تو اب خدا کے فضل سے ٹھیک ہوں، البتہ آمنہ بلڈ پریشر کی وجہ سے مضمحل رہتی ہیں۔ علاج ہو رہا ہے۔

دہلی میں آپ کی جو پذیرائی ہوئی، اس سے بے خوشی ہوئی⁽¹⁾ اور سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی ہے کہ آج موصول ہونے والے تراشوں میں ایک ایسی تصویر بھی ہے جس میں ایک کنارے پر آپ ہیں اور دوسرے کنارے پر ایک خوبصورت سا چہرہ۔ بیچ میں جو دو آدمی کھڑے ہیں وہ کباب میں ہڈی نظر آتے ہیں۔ آپ کے چہرے پر جو بشاشت نظر آ رہی ہے، وہ دوسرے کنارے ہی کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہے تحسین فراقی اس تصویر میں نہیں ہیں، ورنہ وہ آپ کو محظوظ ہونے کا موقع نہ دیتے اور کسی عاشقانہ بلکہ فاسقانہ غزل کہنے کے لیے مسلسل اسی طرف دیکھتے رہتے اور اس طرح آپ کے راستے کی دیوار بن جاتے۔

آپ نے بڑا کرم فرمایا کہ خواجہ غلام السیدین کے نام خطوط کا مجموعہ (بزم یاراں) شاہد علی خاں صاحب سے حاصل کر لیا۔ میں انھیں شکریے کا خط لکھ رہا ہوں مگر جناب، ان خطوط کا ایک نہیں، دو مجموعے چھپے ہیں اور ان کے نام میں نے آپ کو فون پر لکھوائے تھے۔ دوسرے مجموعے کا نام ''اگلی صحبتیں'' ہے۔ اب یہ کسی دوسرے ذریعے سے منگواؤں گا۔ ایم حبیب خان صاحب کے پاس بہت سی کتابیں رکھی ہیں، میں نے انھیں لکھا تھا کہ ان میں سے دو چار آپ کے اور تحسین صاحب کے حوالے کر دیں مگر افسوس کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کے ذریعے جو لفافہ بھیجا ہے، اس میں ایک کتابچے کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ لکھا ہے کہ آپ کی کتابیں ڈاک سے بھیج دوں گا۔ یہ بات وہ کئی برسوں سے لکھ رہے ہیں حالانکہ ڈاک کے اخراجات میں انھیں پیشگی ادا کر چکا ہوں۔

آپ کو ائیر پورٹ پر کتابوں کی مد میں گیارہ سو روپے دینے پڑے۔ میرے خیال میں یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ یقیناً آپ ایسی کتابیں لائے ہوں گے جو عام حالات میں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ نومبر میں لاہور آنے کا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ اس وقت ان کتابوں کو دیکھوں گا۔ ویسے ہندوستان سے میرے پاس

کثرت سے کتابیں آتی ہیں۔ اوسطاً مہینے میں دس سے پندرہ تک۔ پچھلے چند ماہ میں صرف خدا بخش لائبریری نے ۲۴ کتابیں بھیجی ہیں۔ یہ سب بلا طلب ہوتی ہیں۔ شاہد علی خاں صاحب کے پاس میری کتابوں کی رائلٹی کی مد میں اچھی خاصی رقم جمع ہے۔ ان سے کتابیں منگواتا ہوں اپنے حساب میں مگر وہ اتنے مصروف ہیں کہ دس کتابوں کے لیے لکھوں تو ایک دو سے زیادہ نہیں بھیجتے۔

آپ نے پروفیسر اسلم صاحب کی کتاب (۲) میں شامل کتبوں کا مہندیوں کے قبرستان کے کتبوں سے مقابلہ کر کے معلوم کیا کہ اکثر کتبے غلط نقل ہوئے ہیں۔ میں نے مقابلہ کیے بغیر کتاب میں شامل بیشتر کتبوں کی اغلاط سے اسلم صاحب کو مطلع کیا تھا۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ کتبے انھوں نے رواروی میں نقل کیے۔ دوسرے بعض کتبوں میں خطاطوں نے آرائشی خطاطی کی ہے اور بعض الفاظ سطروں کے اوپر لکھ دیے ہیں۔ اسلم صاحب نے ان الفاظ کو صحیح مقام پر نقل نہیں کیا۔ کتبوں میں شامل شعر بھی بیشتر غلط نقل ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلم صاحب موزوں طبع نہیں ہیں۔ میں نے یہ سب باتیں انھیں لکھی تھیں اور انھوں نے ان اغلاط کو تسلیم کیا تھا مگر، ان باتوں کے باوجود، ان کا سفرنامہ بے حد دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں لیکن میری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ کتاب کی دلچسپی کا یہ حال ہے کہ جب تک میں نے اسے ختم نہیں کر لیا، دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔ پروفیسر اسلم صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، صاحب علم ہیں، مگر دو باتیں نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ ایک تو تلفظ کی غلطیاں بہت کرتے ہیں، دوسرے شعر صحیح لکھتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں۔ محقق کے لیے موزوں طبع ہونا ضروری ہے۔

پروفیسر اسلم کے ذکر پر یاد آیا کہ جس روز ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اقبال اکیڈمی چھوڑی ہے اسی دن میں نے پروفیسر اسلم صاحب کو خط لکھا کہ اب وہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی قریشی صاحب کو واپس کر دیں۔ میرا خط ملتے ہی اسلم صاحب قریشی صاحب کے گھر گئے اور اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ قریشی صاحب کے لیے بیکار بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔ کوئی نہ کوئی مشغولیت ہونی چاہیے۔ پروفیسر اسلم صاحب بھی اب علی گڑھ سکول سے متعلق ہونے کے بعد خاصے مصروف ہو گئے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ انھیں وہاں سے پندرہ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ وہ وہاں خوش ہیں۔ اکیڈمی کی وجہ سے قریشی صاحب کے اور اسلم صاحب کے باہمی تعلقات خوشگوار نہیں رہے تھے۔ اب ان شاء اللہ یہ صورت حال نہیں رہے گی اور دونوں میں پہلے کی طرح دوستانہ مراسم قائم ہو جائیں گے۔

قریشی صاحب کے ذکر پر یاد آیا کہ "ارمغان علمی" کس منزل میں ہے۔ اس کے نام کے سلسلے میں عرض ہے کہ "ارمغان وحید" درست نام نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے "تحفہ منجانب وحید" جب کہ معاملہ اس

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کے برعکس ہے۔ لہٰذا ''ارمغان علمی'' ہی نام مناسب رہے گا۔ پروفیسر شفیع مرحوم کو بھی اسی نام سے ارمغان پیش کیا گیا تھا۔ نام ''علمی ارمغان'' بھی ہو سکتا ہے۔

ابھی ابھی تحسین صاحب کا خط بھی ملا ہے۔ انھیں بھی جواب لکھوں گا۔ خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۸ جولائی ۱۹۹۷ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ دہلی کے چودہ روزہ سفر میں، تین روز تو اقبال سیمی نار میں مصروفیت رہی۔ پھر استقبالیوں اور دعوتوں کا سلسلہ چلا۔ استقبالیہ جلسے اور نشستیں انجمن ترقی اردو، اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مرکز جماعت اسلامی ہند اور غالب اکیڈمی اور مکتبہ جامعہ میں منعقد ہوئیں اور سید مظفر حسین برنی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عبدالحق اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے طعام کے لیے مدعو کیا۔

۲۔ پروفیسر محمد اسلم (م: ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۸ء) کے ''سفر نامہ ہند'' (لاہور ۱۹۹۵ء) کا ذکر ہے۔ راقم بھارت کے سفر (جون ۱۹۹۷ء) میں یہ کتاب ساتھ لے گیا تھا، اس کے ذریعے دہلی کے آثار دیکھنے میں خاصی سہولت رہی۔

(۲)

برادر عزیز و مکرم ! سلام مسنون ۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۷ جولائی موصول ہوا۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں ۔ اس سے پہلے دو خط آپ کے نام لکھ چکا ہوں ۔ امید ہے اب تک یہ اورنگ زیب صاحب نے آپ کے حوالے کر دیے ہوں گے ۔ پی ایچ ڈی کے لیے ایک دو نہیں ، ہزاروں موضوعات ہیں مگر اب ایسے طالب علم کہاں جو محنت سے کام کر سکیں اور کام کرنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہوں ۔ جس شخص نے زندگی میں پانچ صفحات کا ایک مضمون بھی نہ لکھا ہو، وہ ایک دم پانچ سو صفحات کا مقالہ لکھ دیتا ہے ۔ میری رائے میں تو آپ جب تک کسی طالب علم کو خوب ٹھونک بجا کر نہ دیکھ لیں ، پی ایچ ڈی میں داخلہ نہ دیں ۔ خلیل قدوائی اور رفیق خاور جیسے ادیب ایم اے کے مقالے کے لیے تو موزوں ہو سکتے ہیں مگر پی ایچ ڈی کی سطح پر ان پر کام نہیں ہو سکتا(۱) اگر افراد ہی پر یہ کام کرنا ہے تو پھر مندرجہ ذیل پر توجہ فرمائیے ۔ آپ نے چونکہ دواوین کی تدوین کو خارج از آہنگ قرار دیا ہے، اس لیے صرف نثر نگاروں کے نام لکھتا ہوں:

۱۔ مالک رام
۲۔ اثر لکھنوی (بطور نقاد)
۳۔ ممتاز حسین
۴۔ ابراہیم جلیس
۵۔ اختر حسین رائے پوری
۶۔ اشرف صبوحی
۷۔ شیخ محمد اکرام
۸۔ امداد امام اثر
۹۔ میر باقر علی داستان گو
۱۰۔ چراغ حسن حسرت
۱۱۔ عبدالمجید سالک
۱۲۔ ڈاکٹر تاثیر
۱۳۔ مولوی عبدالحق
۱۴۔ شوکت سبزواری
۱۵۔ خواجہ احمد فاروقی
۱۶۔ خواجہ حسن نظامی
۱۷۔ مجنوں گورکھپوری
۱۸ کنہیالال کپور
۱۹۔ قاضی عبدالودود
۲۰۔ امتیاز علی عرشی
۲۱۔ وقار عظیم
۲۲۔ ظفر علی خاں (بطور نثر نگار)
۲۳۔ ممتاز شیریں
۲۴۔ جوش (بہ حیثیت نثر نگار)
۲۵۔ محمد حسن عسکری
۲۶۔ خواجہ ناصر نذیر فراق

WWW.KITAABISTAN.COM

ایک اہم کام یہ ہوسکتا ہے کہ اردو کے بڑے نثر نگاروں کی فرہنگیں تیار کرائی جائیں، مثلاً سرسید، محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا حالی، عبدالحلیم شرر جیسے مصنفین کی فرہنگیں تیار ہوں (مع امثال) تو اردو کے بہت سے خوابیدہ الفاظ سامنے آجائیں گے۔

اب میں کچھ دوسرے موضوعات تجویز کرتا ہوں جن پر کام کی بے حد ضرورت ہے:

۱۔ اردو میں لغت نگاری
۲۔ اردو میں قواعد نویسی
۳۔ اردو میں تحقیق
۴۔ اردو ادب، عہد محمد شاہی میں
۵۔ عہد میر کے اردو شعرا
۶۔ اردو کا ایک اہم ادبی مرکز: مرشد آباد
۷۔ پنجاب میں اردو نثر نگاری (قیام پاکستان سے قبل)
۸۔ بیسویں صدی کے ادبی رسائل (قیام پاکستان سے قبل)
۹۔ دلی کا دبستان نثر
۱۰۔ برصغیر کے علمی وادبی ادارے (قیام پاکستان سے قبل)
۱۱۔ اردو کے رومانی نثر نگار
۱۲۔ اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے مشترکہ عناصر
۱۳۔ اردو ادب کی تاریخیں
۱۴۔ اردو میں قرآن شریف کے تراجم
۱۵۔ اردو میں قرآن شریف کی تفسیریں
۱۶۔ اردو پر فارسی زبان وادب کے اثرات

کلاسیکی شاعروں پر اور ان کے دواوین کی تدوین کا کام بھی ہونا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں ایسے اساتذہ بہت کم ہیں جو پی ایچ ڈی کا کام کرانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ آپ جیسے دو چار استادوں کو چھوڑ کر مجھے تو دور دور تک کوئی ایسا استاد نظر نہیں آتا جو ادب کا صحیح ذوق رکھتا ہو اور ادب کے بارے میں اس کی معلومات وسیع ہوں۔

نومبر کے آخر میں میرے بھتیجے کی شادی ہے اور دسمبر میں ڈاکٹر وحید قریشی کی صاحب زادی کی۔ کوشش کروں گا کہ ان دونوں شادیوں کا درمیانی وقفہ لاہور میں گزاروں کہ بیوی کے ساتھ دو مرتبہ ہوائی سفر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس دوران میں ان شاء اللہ آپ سے ملاقاتیں رہیں گی۔ میرے پچھلے دونوں خطوں کا جواب جلد عنایت فرمایئے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۸ جولائی ۱۹۹۷ء

۱۔ یہ خواجہ صاحب کی رائے تھے۔ شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی سے ان دونوں شخصیات پر پی ایچ ڈی سطح کا کام ہوچکا ہے۔

(۷)

برادرم عزیز و مکرم! اسلام مسنون۔

۲۱، اگست کا خط ابھی ابھی ملا۔ شکریہ

۱۔ ممتاز حسن مرحوم کا پتا C- 12, K.D.A Scheme No. 1 درست ہے۔ C- 129 بھی درست ہے۔ ایک مکان میں ان کی رہائش تھی اور دوسرے میں اس اشاعتی ادارے کا دفتر تھا جس کے وہ سربراہ تھے۔ یہ وہی ادارہ ہے جس کی طرف سے کئی فارسی شعرا کے مخطوطوں کے عکس شائع کیے گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ممتاز صاحب نے PECHS سوسائٹی میں مکان بنوایا تھا اور اسی میں رہتے تھے۔

۲۔ MCNEIL درست ہے نہ MC NEIL۔ صحیح لفظ McNEIL ہے۔ یعنی M کے بعد Capital C نہیں ہوگا۔ اس قسم کے نام اسی طرح لکھے جاتے ہیں، جیسے McMOHAN, McLEOD وغیرہ Dictionary of Indian Biography دیکھ لیجیے۔

۳۔ حواشی کے نشانات اڑا دیجیے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ ڈاکٹر مختار الدین صاحب سے حواشی کے لیے کہا جائے۔

۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے کوائف کتاب کے شروع میں ہوں تو اچھا ہے۔ ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیباچے میں ان کا ذکر کر دیا جائے اور انھیں کتاب کے آخر میں رکھا جائے (۱)۔

اجی حضرت! آپ بھی غضب فرماتے ہیں۔ آپ کے خط کے جواب میں خاصا وقت صرف کر کے پی ایچ ڈی کے موضوعات کی فہرست بھیجی مگر آپ نے رسید تک نہیں دی۔ ''ترجمان القرآن'' کے سلسلے میں دو خط لکھے۔ رسالے مل گئے اور ساتھ ہی دفتر ''ترجمان القرآن'' سے سالانہ چندے کی طلبی کا خط آ گیا۔ میں نے وی پی پی وصول کرنے کا جو لفافہ بھیجا تھا، اس پر کیا کارروائی ہوئی! (۲)

۱۔ یہ چاروں استفسارات متذکرہ بالا ''ارمغان علمی'' میں شامل مضمون ''ممتاز حسن کے خطوط، دوارکاداس شعلہ کے نام'' (مختار الدین احمد) کے ضمن میں کیے گئے تھے۔

۲۔ خواجہ صاحب، علمی و ادبی رسائل و جرائد بالعموم چندہ ادا کر کے منگاتے تھے۔ ''ترجمان القرآن'' کے بھی باقاعدہ خریدار تھے۔ وی پی وصول کرنے کے باوجود دفتر ترجمان کی غفلت سے انھیں سالانہ چندے کی طلبی کا خط آ گیا تھا۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

موعودہ مفصل خط اگر آپ اسی سال لکھ سکیں تو کرم ہوگا

خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۵ اگست ۱۹۹۷ء

WWW.KITAABISTAN.COM

(۸)

برادر عزیز و مکرم! سلام مسنون۔

آپ کا ۱۷، اکتوبر کا خط مل گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اب بہت بہتر ہوں اور اپنے کاموں کی طرف توجہ کر رہا ہوں۔ گو معمول کے مطابق ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے کی نشست نہیں رہتی۔ وقفے وقفے سے آرام بھی کر لیتا ہوں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی ستمبر کے پہلے ہفتے کراچی آئے تھے۔ اپنے مضمون کی ایک نقل انھوں نے مجھے دی تھی۔ میں نے اسی وقت اسے پڑھ لیا تھا۔ میرے خیال میں یہ مضمون اسی صورت میں شامل کر لیجیے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں۔ (خصوصاً خاندان کے حوالے سے) جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں (۱)۔

رفاقت علی شاہد کے حواشی مفید ہیں (۲) مگر مقالے کے ساتھ ان کی اشاعت مناسب نہ ہوگی اور پھر اگر مقالے کی غلطیوں کی تصحیح کرنی تھی تو مکمل معلومات دی جاتیں۔ رفاقت صاحب نے اس کا اہتمام نہیں کیا، مثلاً ممنون سے متعلق منشاء الرحمن منشا کے کام کا ذکر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ''گلزار ابراہیم'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ علی لطف نے اس کا ترجمہ کیا ہے جب کہ صحیح صورت یہ ہے کہ لطف نے ''گلشن ہند'' میں صرف منتخب شعراء کے تراجم ترجمہ کیے ہیں، پورے تذکرے کا ترجمہ نہیں کیا۔ کلیات جعفر علی حسرت کے بارے میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں اس کی اشاعت کی خبر ہے جب کہ اس کی اشاعت کو ایک مدت گزر چکی ہے۔ پھر ایسے جملے بھی نظر آتے ہیں: ''کہیں نظر سے گزرا تھا۔۔۔'' اس قسم کی باتوں کی موجودگی میں رفاقت صاحب کے حواشی پر بھی لوگ اعتراض کریں گے۔ رفاقت صاحب کی محنت قابل داد ہے لیکن یہ حواشی کہیں اور چھپیں تو بہتر ہے۔

''ارمغان علمی'' اور ''ارمغان وحید'' میں سے پہلا نام مناسب ہے۔ دوسرے نام کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں ''ارمغان منجانب وحید''۔ اس قسم کا اعتراض ''ارمغان نارنگ'' پر کیا گیا تھا کہ اس سے ''ارمغان برائے نارنگ'' کے معنی نہیں نکلتے۔

آپ کے بیلجیم جانے کی اطلاع سے خوشی ہوئی اور اس کا افسوس کہ عین اسی زمانے میں میں لاہو میں ہوں گا۔ سہیل عمر صاحب نے بتایا ہے کہ آپ ۲۷، نومبر کو واپس آ جائیں گے۔ کوشش کروں گا کہ میں ۳۰ تک لاہور میں رہوں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ اکرام چغتائی کی قیادت میں لندن بھی جائیں گے۔ فتح پور کے کاموں میں اکرام چغتائی سے بہتر رہنما نہیں مل سکتا (۳)۔

ڈاکٹر گیان چند کل (۲۳، اکتوبر) شام کو لاہور کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے شائق ہیں۔ آج میں نے سہیل عمر صاحب کو فون پر کہا کہ وہ ان سے آپ کی ملاقات کا انتظام کر دیں۔ توقع ہے کہ میرے خط کے پہنچنے تک آپ ان سے مل چکے ہوں گے۔ انھیں اورینٹل کالج بھی لے جایئے (۴)۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۲ اکتوبر ۱۹۹۷ء

۱۔ اس مضمون کا ذکر خط ۱۴ کے حاشیہ ۲ میں آ چکا ہے۔

۲۔ رفاقت علی شاہد نے یہ حواشی ''ارمغان علمی'' میں شامل مضمون ''کلکتہ اور اطراف کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات'' (شانتی رنجن بھٹاچاریہ) پر لکھے تھے۔

۳۔ بلجیم کا یہ سفر ایک اقبال سیمی نار کے سلسلے میں تحسین فراقی، سہیل عمر، اکرام چغتائی اور خالد احمد کی رفاقت میں نومبر ۱۹۹۷ء میں پیش آیا تھا۔ لندن ہم نہ جا سکے تھے۔ سیمی نار کی روداد دیکھیے ''اقبالیات'' جنوری ۱۹۹۸ء، نیز مشمولہ ''تفہیم و تجزیہ'' لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۴۔ ڈاکٹر گیان چند کے دورہ لاہور میں انھیں ایک استقبالیہ تو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب (ناظم مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور) نے عامر ہوٹل میں دیا تھا۔

دوسرے، شعبہ اردو اورینٹل کالج نے ان کے اعزاز میں سینٹ ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں نثار احمد فاروقی، ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ) اور جاوید طفیل بھی شریک تھے۔

WWW.KITAABISTAN.COM

(۹)

برادر عزیز و مکرم! سلام مسنون ۔

آپ کے دونوں خط مل گئے۔ شکر گزار ہوں، آپ نے اپنے والد بزرگوار مرحوم و مغفور کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے (۱)، اسے پڑھ کر آپ کے لیے اور مرحوم کے لیے دل سے دعا نکلی۔ آپ نے مجھے ایک پیکر عمل سے متعارف کرایا اور مرحوم نے کام کرنے والوں کے لیے ایک روشن مثال چھوڑی۔ دراصل کسی تحریک کی کامیابی کی بنیاد مخلص کارکن ہی ہوتے ہیں جو کسی صلے اور نام و نمود کی خواہش کے بغیر، اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ آسودہ حال لوگ دراصل اس قسم کے کام کر ہی نہیں سکتے کہ آسودگی کی خواہش راستے کا پتھر بن جاتی ہے۔ آپ کے دادا جان کا کردار بھی مثالی تھا۔ وہ اگر اپنے بیٹوں کو تحصیل علم کے لیے مشکلات اٹھانے کا راستہ نہ دکھاتے تو ان کے بیٹے اور پوتے آج بھی کاشتکار ہوتے اور اس خاندان میں کوئی رفیع الدین ہاشمی پیدا نہ ہوتا۔ آپ کے والد مرحوم کو ان کی نیکیوں کا اجر تو اگلے جہان میں مل رہا ہوگا لیکن ایک انعام اسی دنیا میں مل گیا اور وہ انعام آپ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مرحوم کی مفصل سوانح عمری لکھیں کہ یہ نئی نسل کے لیے بہت کچھ سیکھنے کا ذریعہ ہوگا۔ سوانح عمری صرف ان لوگوں کی نہیں لکھی جاتی جو اصطلاحی معنوں میں بڑے ہوں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جو اپنے پیچھے بقول مخدوم کام چھوڑتے ہیں، نام نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا ان کی سوانح عمری بھی لکھی جانی چاہیے۔

خدا کرے اب تک عارف نوشاہی کا ارسال کردہ ‘ارمغان کا لوازمہ’ آپ کو مل چکا ہو اور کتاب پریس چلی گئی ہو۔ دیباچہ میں نے دیکھ لیا، بہت عمدہ ہے۔ البتہ ایک بات درست نہیں کہ میرا نام محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع کے ساتھ اساتذہ تحقیق میں شامل کیا گیا ہے۔ میں ان اساتذہ کی خاک پا بھی نہیں اور ان کے ساتھ میرا نام لینا ایک ادبی کفر ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب مجھ سے محبت فرماتے ہیں، یہ میرے لیے باعث فخر ہے مگر میرا نام اس طرح چھپے گا تو اس سے اہل نظر خوش گوار اثر نہیں لیں گے۔ میری گزارش ہے کہ آپ اس دیباچہ میں سے میرا نام حذف کر دیں۔ قاسمی صاحب سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں اگر وہ پوچھیں گے تو میں جواب دہ ہوں گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ امید ہے آپ توجہ فرمائیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے ناقابل تلافی رنج ہوگا۔ ہاشمی صاحب! ہر آدمی اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے مگر میں مزاجاً اس سے رنجیدہ ہوتا ہوں کیونکہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ آپ یقین کیجیے کہ قاسمی صاحب کے دیباچے میں اپنا نام اس انداز سے دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی کیونکہ میں ہرگز ان الفاظ کا مصداق نہیں ہوں (۲)۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

آپ نے اپنے کتب خانے کے بارے میں گنجائش کی جو بات لکھی ہے بالکل درست ہے۔ میں نے تو لائبریری کے لیے دس کمرے مخصوص کیے تھے اور اب وہ بھی کم پڑ گئے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ اپنے پاس صرف وہ کتابیں رکھیں جن کا رکھنا بے حد ضروری ہو۔ باقی تمام کتابیں فروخت کر دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۔ والد مرحوم (محمد محبوب شاہ ہاشمی، م: ۱۳ جنوری ۱۹۹۸ء) کے بارے میں یہ مضمون ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور کے شمارہ ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ ''ارمغان علمی'' کی ''تقدیم'' میں جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا: ''بطور خاص علمی تحقیق میں انھیں (ڈاکٹر وحید قریشی صاحب) کو استاد کا مقام حاصل ہے اور وہ حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، پروفیسر رشید حسن خاں اور جناب مشفق خواجہ کے سے اساتذۂ تحقیق کی صف میں شامل ہیں۔ خواجہ صاحب نے بعد کے خطوں میں بھی اصرار کیا کہ ان کا نام نکال دیا جائے، چنانچہ ان کے پیہم اصرار پر ہم نے ان کا نام حذف کر دیا۔

(بنام جناب ڈاکٹر انور محمود خالد)

(۱)

محترمی و مکرمی ! سلام مسنون۔

چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ کہیں اور گزارنے کے بعد بالآخر میں وہیں آ گیا جہاں میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ یعنی وہ مکان جو نہ دولت خانہ ہے نہ غریب خانہ بلکہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ جہاں میں نے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزارا ہے، اس شہر کا خوبصورت ترین علاقہ ہے۔ میری قیام گاہ عین سمندر کے کنارے تھی۔ سمندر کے قریب آنے کا تو بارہا اتفاق ہوا ہے لیکن کنارِ بحر اتنے عرصے تک قیام کا موقع پہلی بار ملا۔ سمندر کی کرامتیں بے شمار ہیں۔ وقت کے ساتھ اس کے پانی کا رنگ بدلتا ہے۔ کبھی نیلا، کبھی سیاہ، کبھی مٹیالا اور کبھی سورج کی کرنوں سے شیشے کی طرح چمکتا ہوا۔ شام کو غروب آفتاب کے وقت تو افق پر علامہ اقبال والے لعل بدخشاں کے ڈھیر اس طرح نظر آتے ہیں جیسے پانی میں آگ لگ گئی ہو اور شعلے بلند ہو رہے ہوں۔ غرض کہ سمندر کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ خصوصاً ان آبی پرندوں کے ساتھ جو ایسی ترتیب و تنظیم کے ساتھ پرواز کرتے تھے کہ فضا میں خوبصورت نقش بنتے چلے جاتے تھے۔ یہ سارا حسن فطرت اپنی جگہ مگر گھر تو گھر ہے۔ اسے تو یاد آنا ہی تھا اور یہ شعر بھی یاد آتا رہتا تھا:

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
دربدر ہیں تو یاد آتا ہے

حالانکہ میں دربدر نہیں تھا، اپنے بہن بھائیوں اور دوسرے قریبی بلکہ قریب از جان عزیزوں کے ساتھ تھا۔ یہ سب عزیز نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے گھر جاؤں کہ مجھے وہاں وہ سہولتیں حاصل نہ ہوں گی جو یہاں ہیں مگر اپنی دنیا سے الگ رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ لہذا میں یہاں آ گیا اور سب سے پہلے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں تا کہ آپ کی ان عنایات کا شکریہ ادا کر سکوں جو بیماری کے دوران میرے حال پر رہیں۔ آپ نے اس زمانے میں اولاً روزانہ اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن فون کر کے میری ہمت بندھائی اور بیماری کے احساس کو زائل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں جو اس وقت خدا کے فضل و کرم سے بڑی حد تک صحت یاب ہو چکا ہوں تو میں اسے آپ کی دعاؤں اور صحت مندانہ گفتگو کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ آپ سے اور آپ جیسے دوسرے کرم فرماؤں (مثلاً ڈاکٹر صدیق جاوید، ڈاکٹر وحید قریشی) سے بات کر کے احساس ہوتا تھا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ بہر حال آپ کا شکریہ کہ آپ نے مسلسل چار ماہ تک میری غم گساری کی۔

گھر آنے کے بعد پہلا کام تو یہ کر رہا ہوں کہ جمع شدہ ڈاک دیکھنی شروع کی ہے اور اب پہلا خط آپ کے نام لکھا ہے۔ کچھ عرصہ قبل مجھے آپ نے "اپنا گریباں چاک" پر اپنا ریڈیائی شذرہ بھیجا تھا۔ اسے پڑھ کر میں نے اپنے تاثرات ایک خط کی صورت میں قلم بند کر دیے۔ یہ خاصا طویل خط ہے اور تیز رفتاری سے لکھنے کی وجہ سے بڑی حد تک ناخواندہ ہو گیا ہے۔ لہذا ایک عزیز سے اسے صاف کرا رہا ہوں (کمپیوٹر پر) تاکہ آپ کو پڑھنے میں دقت نہ ہو۔ اسی کے ساتھ یہ خط بھی پوسٹ کروں گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۱۴ مارچ ۲۰۰۴ء

WWW.KITAABISTAN.COM

تیسرا حصہ

اندازِ بیاں اور

WWW.KITAABISTAN.COM

حیات نامہ

(۱۹۳۵ء تا ۲۰۰۵ء)

اصلی نام: خواجہ عبدالحئی

ادبی نام: مشفق خواجہ

کالمانہ نام: خامہ بگوش

اخبارات و رسائل جن میں کالم لکھے:

۱۔ روزنامہ "جسارت"، کراچی، ۱۹۷۰ء

۲۔ ہفت روزہ "زندگی"، ۷۲ـ۱۹۷۱ء

۳۔ روزنامہ "صداقت" کراچی ۱۹۷۴ء

۴۔ ہفت روزہ "تکبیر"، کراچی، ۱۹۸۴ء

تاریخ پیدائش: ۱۹/ دسمبر ۱۹۳۵ء، لاہور، (۱۹۴۸ء سے کراچی میں قیام)

تاریخ وفات: ۲۱/ فروری ۲۰۰۵ء (کراچی)

تعلیم: بی اے (آنرز) ۱۹۵۷ء کراچی یونیورسٹی؛ ایم اے (اردو) ۱۹۵۸ء کراچی یونیورسٹی

اعزاز: پرائڈ آف پرفارمنس، حکومت پاکستان ۱۹۹۴ء

سابقہ مشاغل: انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی؛ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۷۳ء، ۱۹۶۱ء تک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ علمی و ادبی کام کرنے کا اعزاز۔

نیز بحیثیت:

۱۔ مدیر سہ ماہی "اردو"

۲۔ مدیر ماہنامہ "قومی زبان"

۳۔ مدیر "قاموس الکتب"

۴۔ نگران شعبہ تحقیق و مطبوعات خدمات انجام دیں

موجودہ مشاغل: اپنے ذاتی علمی و تحقیقی منصوبوں پر کام

تالیفات، مرتبات، تصانیف:

۱۔ ''خوش معرکۂ زیبا'' تذکرہ شعرا مصنفہ سعادت خان ناصر، تصنیف ۱۸۴۸ء اس ضخیم تذکرے کو مفصل مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے دو جلدوں میں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔

۲۔ ''پرانے شاعر نیا کلام'' بعض ایسے شعرا پر تحقیقی کام جن پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ حالات اور انتخاب کلام۔ یہ کتاب قسط وار سہ ماہی ''غالب'' کراچی میں ۷۶ـ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ ''ابیات'' مجموعہ کلام۔ ۱۹۷۸ء کراچی (کلام ۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۸ء)
ناشر نیا دور، کراچی۔

۴۔ ''اقبال (از احمد دین) علامہ اقبال پر لکھی گئی اردو میں پہلی کتاب جو پہلی بار علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی مگر بوجوہ جلا دی گئی۔ مفصل مقدمے، تعلیقات و حواشی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی سے شائع ہوئی۔

۵۔ ''غالب اور صفیر بلگرامی'' غالب اور ان کے شاگرد صفیر کے باہمی تعلقات اور مراسلت کے بارے میں۔ کراچی ۱۹۸۱ء۔

۶۔ ''تخلیقی ادب'' (ادبی کتابی سلسلہ)
ہم عصر تخلیقی ادب کے جائزوں اور منتخب تحریروں پر مشتمل یہ پانچوں جلدیں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران کراچی سے شائع ہوئیں۔

۷۔ ''جائزہ مخطوطات اردو''
پاکستان میں موجودہ مخطوطات اور دنیا بھر میں ان کے دیگر نسخوں کا تذکرہ۔ پہلی جلد جو ۱۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، مرکزی اردو بورڈ لاہور سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۸۔ ''تحقیق نامہ''
چھ تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ شائع کردہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۹۱ء۔

۹۔ تقریبا دو درجن تحقیقی مقالات جو برصغیر کے مختلف علمی جریدوں میں شائع ہوئے۔

۱۰۔ ''مرزا یگانہ: شخصیت اور فن''
آصف پبلی کیشنز، علی گڑھ (بھارت)۔ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔

WWW.KITAABISTAN.COM

۱۱۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک مختلف موضوعات پر تقریباً پانچ سو فیچر لکھے۔

۱۲۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۷ء تک مختلف اخبارات و رسائل جسارت، ۱۹۷۰ء؛ زندگی، ۷۲۔۱۹۷۱ء، صداقت، ۱۹۷۴ء کے لیے دو ہزار سے زائد (سیاسی و ادبی) کالم لکھے۔ ادبی کالموں کے تین انتخاب کتابی صورت (۱۔ خامہ بگوش کے قلم سے، ۲۔ سخن در سخن، ۳۔ سخن ہائے ناگفتنی) میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

۱۳۔ کلیاتِ یگانہ (جنوری ۲۰۰۳ء)

زیرِ طبع کتابیں:

۱۔ خطوطِ یگانہ (ترتیب)

۲۔ مضامینِ یگانہ (ترتیب)

۳۔ ''فرمانِ سلیمانی'' روزنامچہ مرزا سلیمان قدر۔ نوشتہ لطافت لکھنوی
مقدمہ، تعلیقات و حواشی کے ساتھ

۴۔ جائزہ مخطوطاتِ اردو (دوسری جلد)

WWW.KITAABISTAN.COM

میری کالم نگاری

خود اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کسی دوسرے کی کتاب پر لکھنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ پڑھے بغیر اس کی وہ خوبیاں تلاش کر لی جاتی ہیں جو اس میں نہیں ہوتیں۔ اپنی کتاب کی جھوٹی تعریف تو الگ رہی، سچی تعریف بھی نہیں کی جا سکتی کیوں کہ خدشہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بھی جھوٹ ہی سمجھا جائے گا: مثلاً اگر ہم یہ عرض کریں کہ اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے تو آپ پہلے لفظ ”سنجیدہ“ کے کئی بار استعمال پر مسکرائیں گے اور پھر نہایت سنجیدگی سے یہ فرمائیں گے، اگر یہ کتاب سنجیدہ ہے تو غیر سنجیدہ کتاب کسے کہا جائے گا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن خدا لگتی کہنے میں اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو یہ فرمائیے، کیا یہ کتاب ویسی ہی نہیں ہے جیسی اردو میں عام طور پر تنقیدی کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ فرق صرف یہ ہے کہ اردو کی تنقیدی کتابوں کے مصنفوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کسی غیر ملکی زبان سے ترجمہ نہیں ہے بلکہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ ہاں کہیں کہیں دو اور دو کا حاصل جمع تین یا پانچ بھی ہو گیا ہے لیکن اس عمل کا اردو کے محاورے ”تین پانچ کرنا“ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محاورہ اردو کے پیشہ ور نقادوں ہی کے حوالے سے اچھا لگتا ہے جو بقول شخصے، تنقید کم لکھتے ہیں، گھوڑوں پر رقم زیادہ لگاتے ہیں۔ گھوڑوں پر رقم لگانے میں کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔ مگر ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ سراسر خسارے کا سودا ہے کیونکہ ہم سے وہ لوگ عموماً ناراض ہو جاتے ہیں جن کو موضوع بنا کر ہم اظہار خیال کی جرات کرتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے ہمیشہ نیک نیتی سے لکھا ہے۔ مگر آج کل نیت کو کون دیکھتا ہے، صرف وہی دیکھا جاتا ہے جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست۔

بہر حال اب جب کہ کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے، ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے، ان سب کے لیے ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبت بھی چونکہ محبت میں سبھی کچھ جائز ہوتا ہے، اس لیے کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں جنھیں غالب کے لفظوں میں ”سخن گسترانہ“ کہا جا سکتا ہے۔ امید ہے ہماری یہ ”سخن گستری“ آئندہ کے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔ ”خوشگوار تعلقات“ سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ممدوحین وہی کچھ لکھتے رہیں جو اب تک لکھتے رہے ہیں اور ہم ان کے لکھے پر بساط بھر اظہار خیال کرتے رہیں۔ جب ہم ان کے لکھے کا برا نہیں مانتے تو انھیں بھی ہمارے لکھے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

ممکن ہے ہماری مذکورہ بالا معذرت خواہانہ باتوں پر بعض لوگوں کو یقین نہ آئے، لہٰذا ہم ان کی تالیفِ قلب کے لیے اعلان کرتے ہیں کہ اس کتاب میں جتنے بھی نام آئے ہیں، سوائے لاغر مرادآبادی کے نام کے، وہ سب فرضی ہیں۔ ناموں کی جزوی یا کلی مماثلت اتفاقی ہوسکتی ہے، ارادی نہیں۔

ہمیں اس موقع پر وہ لوگ بھی یاد آرہے ہیں جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ مرحومین کے بارے میں کوئی کالم کتاب میں شامل نہ کیا جائے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مرحومین کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کا ذکر اسی طرح کرتے رہیں جس طرح ان کی زندگی میں کرتے تھے تاکہ وہ ہمیں اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آتے رہیں۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب زندہ ادب کے بارے میں نہ سہی، زندہ ادیبوں کے بارے میں ضرور ہے۔

کالموں کا انتخاب شائع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ جس ادبی معاشرے میں بھی صاحبِ کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹھہرے یہ جو ہمارے کرم فرما شاہد علی خاں صاحب ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے کالم مکتبہ جامعہ سے کتابی صورت میں شائع نہ ہوئے تو ضائع ہوجائیں گے۔ خاں صاحب بڑے تجربہ کار ناشر ہیں اور دوسروں سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں شائع ہونے ہی کی وجہ سے ضائع ہوجاتی ہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرے لوٹتے ہیں اور جب ان کا دیوان شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لٹ گئے۔ ایسے بے شمار دیوانوں کا ادب کی تاریخوں میں تو نہیں، کاغذ کے ضیاع کی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے۔ ہم نے خاں صاحب کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ رشید حسن خاں صاحب نے خان صاحبی کی کچھ ایسی دھاک بٹھا رکھی ہے کہ ہم ہر اس شخص سے ڈرتے ہیں جس کے نام میں ''خاں'' کا لاحقہ شامل ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں خاں صاحب کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

کالم نگاری ہم بہت عرصے سے کررہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے کالموں کی مجموعی ضخامت ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' سے کم نہیں ہوگی۔ اتنے بہت سے کالموں کو پڑھ کر انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے، حشر کے دن گناہ گار عورتوں کو یہ سزا ملے گی کہ انھیں صرف وہی کھانے کھلائے جائیں گے جو انھوں نے خود پکائے ہوں۔ اسی طرح کسی لکھنے والے کو بڑی سے بڑی سزا دی جاسکتی ہے وہ یہ ہوسکتی ہے کہ اسے اسی کی تحریریں پڑھوائی جائیں۔ ہم اس سزا کے بھگتنے کے لیے اپنے آپ

کو آمادہ نہ کر سکے۔ البتہ سزا کا دورانیہ کم کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کے آٹھ برسوں کے دوران لکھے گئے کالموں میں سے کچھ کالم انتخاب کر لیے جائیں۔ ان کالموں کو ہم نے جمع کیا اور ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی کالم سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابل انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔

اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سید نے ہماری دستگیری کی اور انتخاب کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے فرمایا ''کوئی مصنف اپنی تحریروں کا انتخاب خود نہیں کر سکتا کیوں کہ اسے اپنی ہر تحریر 'عالم میں انتخاب' اور آپ کو 'کالم میں انتخاب' نظر آتی ہے۔ میں انتخاب کروں گا تو یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کون سا ہے اور برا کون سا۔ میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم برا ہے اور کون سا زیادہ۔ انتخاب کرنے کا یہ کڑا معیار سید صاحب ہی کے بس کی بات ہے کیونکہ ان کی نگاہ انتخاب خوبیوں سے زیادہ عیبوں کی قدر دان ہے اور پھر اس معاملے میں وہ خاصے تجربہ کار بھی ہیں۔ اس کا ثبوت نظیر صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا وہ انتخاب ہے جو سید صاحب نے مرتب فرمایا تھا اور چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شاید اسی انتخاب کی وجہ سے لوگ بھول چکے ہیں کہ نظیر صدیقی صرف نقاد نہیں، طنز و مزاح میں بھی رواں ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ کسی نقاد کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ تنقیدی مقالات کے ہوتے ہوئے الگ سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔

سید صاحب نے نہایت توجہ اور محنت سے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑی محبت سے ہمارے کالموں کو پڑھا۔ ان تمام کالموں کو مسترد کر دیا جن میں ان کی پسندیدہ شخصیات کو ہم نے مسترد کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک وہ کالم بھی بے اعتبار ٹھہرا جو خود ان کے اعزاز میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کے وزیٹنگ کارڈ کو ان کی واحد مستقل تصنیف قرار دیا گیا تھا اور تصنیف بھی ایسی جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اس کالم کی اشاعت کے بعد سید صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''تنقید کی آزادی'' بالآخر شائع ہو گیا۔ مزید دو مجموعے زیر طبع ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری کالم نگاری کا کم از کم ایک مثبت نتیجہ بھی ظاہر ہوا ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ سید صاحب کے مسترد کردہ کالموں کو بطور انتخاب شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی محنت اور ہماری ناکارکردگی کا دستاویزی ثبوت لوح جہاں پہ حرف مکرر کی طرح باقی رہ جائے لیکن اس قسم کے کالم تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ چنانچہ دوسری قسم کے کالم ہی کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن اب ایک اور مشکل سامنے آ گئی کہ اگر سید صاحب کے تمام منتخبہ کالم شائع کیے جائیں تو ان کی ضخامت بھی قاری

اور ناشر دونوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ مجبوراً منتخبہ کالموں میں سے بھی تقریباً نصف حذف کرنے پڑے۔

ان سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد نظر ثانی کا مرحلہ آیا۔ دو چار کالم پڑھ کر ہی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط۔ بہر حال ہم نے بڑی محنت سے کتاب کی غلطیاں دور کر دیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے۔ کتاب کے آخر میں "غلط نامہ" شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر پھر خیال آیا کہ اردو کی کتابوں میں غلط نامہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو خود غلط نامے کا نعم البدل ہوتی ہیں۔

WWW.KITAABISTAN.COM

انتخاب خامہ بگوش

ادبی خرکار

وہ دن گئے جب اردو ادب پر برصغیر کے چند بڑے شہروں کی اجارہ داری تھی۔ اب تو یہ زبان اور اس کے ادیب دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں اور بعض مقامات پر تو لاہور، کراچی، دہلی اور لکھنؤ جیسی ادبی چہل نظر آتی ہے۔ اردو کے بین الاقوامی مشاعرے تو منعقد ہوتے ہی تھے۔ اب بین الاقوامی رسالے بھی شائع ہونے لگے ہیں جن میں برصغیر سے باہر کے ادیبوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ تارکین وطن معاشی دباؤ کے تحت رزق کی تلاش میں غیر ملکوں میں جاتے ہیں تو ادب کے ذریعے ان کا تعلق اپنے وطن سے قائم رہتا ہے۔ ادبی رسالے بھی معاشی دباؤ کے تحت اس تعلق کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کس طرح؟ اس کا اندازہ ذیل کی خط کتابت سے ہوگا جو ایک کرم فرما کی عنایت سے ہمیں پڑھنے کے لیے ملی تھی۔ جی نہ چاہا کہ ایسی بصیرت افروز خط کتابت سے ہم اکیلے محظوظ ہوں لہٰذا ہم اس کا کچھ حصہ اپنے قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

(۱)

کراچی ۲/فروری ۱۹۹۳ء

مکرمی خلیل بے خود صاحب۔ آداب۔ آپ نے ماہنامہ “خرکار” کا سالانہ زرتعاون عنایت کر کے ادب نوازی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کی وجہ سے تاریخ ادب میں آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ اگر آپ اس تاریخ میں اپنا نام آب زر سے لکھوانا چاہتے ہیں تو رسالے کی تاحیات سرپرستی قبول فرمایئے۔ اس کے نرخ منسلکہ ریٹ کارڈ پر درج ہیں۔ آپ نے سالانہ زرتعاون کے ڈرافٹ کے ساتھ جو خط بھیجا ہے، اس کی خوب صورت نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شاعر ہیں نیز آپ کے شاعرانہ نام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ازراہ کرم اپنا کلام مع تصویر عنایت فرمایئے تاکہ دنیائے ادب کے سامنے مستقبل کے ایک بڑے شاعر کو فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ ہمارے ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سعودی عرب، خلیج کی ریاستوں، یورپ، کینیڈا اور امریکہ میں آباد برصغیر کے بے شمار باشندوں کے اندر چھپے شاعروں کو برآمد کیا ہے۔ یہ تمام شاعر آج اردو دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ آپ کے اندر کے خوب صورت شاعر کو بھی باہر آنا ہوگا۔

خرکارنوازی کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ ہی جیسے صاحبان عزم و ہمت کی وجہ سے اردو عالمی سطح پر مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کے جواب کا بے تابی سے انتظار کروں گا۔ آپ کا خیر اندیش

مینا لکھنوی

(۲)

دبئی۔ ۱۵ فروری ۱۹۹۳ء

محترمی!

تسلیمات،

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مگر جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں شاعر نہیں ہوں۔ میرا نام آپ کو شاعرانہ اس لیے نظر آیا کہ میں حضرت بے خود گڈھ مکتیشری کا فرزند ہوں۔ میرا اصل نام خلیل اللہ خاں ہے، اسے میں نے مختصر کر کے والد مرحوم کے تخلص سے جوڑ دیا ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہوں۔ افسوس کہ ایک شاعر کا بیٹا ہونے کے باوجود شعر کہنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ البتہ اردو زبان سے بے پناہ محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے ایک دوست نے آپ کے رسالے کا سالانہ چندہ بھیجنے کے لیے کہا تو میں نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔ آپ مجھے رسالے کا سرپرست بنانا چاہتے ہیں تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس کا ہدیہ بھی پیش کر رہا ہوں۔ غزل میں نے کبھی نہیں لکھی، اسی لیے بھیجنے سے معذور ہوں، البتہ آپ کی خواہش کے احترام میں اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔ فی الحال اپنے رسالے میں اسی کی اشاعت پر اکتفا کیجیے۔

مخلص

خلیل بے خود

(۳)

کراچی ۸/ مارچ ۱۹۹۳ء

عزیزی خلیل بے خود صاحب!

سلام و رحمت،

سرپرستی کی رقم کا ڈرافٹ ملا اور تصویر بھی۔ دونوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہوئی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت بے خود گڈھ مکتیشری کا فرزند ارجمند شاعر نہ ہو۔ میں نے آپ کی تصویر کو بغور دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے اندر ایک طرح دار شاعر موجود ہے۔ آپ اس شاعر کو باہر نکالیے۔ اگر کسی وجہ سے اس کے باہر نکلنے میں کچھ دیر ہے تو میں آپ کے لیے غزلوں کا انتظام کر سکتا ہوں بلکہ کر لیا ہے۔ میرے عزیز دوست فرصت ناگ پوری میرے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔ ان سے آپ کے لیے چند غزلیں لکھوائی ہیں، ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ ایک ایک کر کے انھیں ''خرکار'' میں شائع کرتا رہوں گا۔ آپ اس دوران مقامی مشاعروں اور شعری نشستوں میں شرکت شروع کر دیجیے۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ بطور شاعر مشہور ہو جائیں گے۔ فرصت ناگ پوری صاحب کو غزلوں کا کچھ معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ ان کے لیے آپ جو رقم بھیجیں، اس کا ڈرافٹ میرے نام ہونا چاہیے۔ میں ایک دم ساری رقم ان کے حوالے نہیں کروں گا کیوں کہ آئندہ بھی غزلیں لکھوانی ہوں گی۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ حضرت بے خود گڈھ مکتیشری کے فرزند ہیں۔ میں نے قیام پاکستان سے چند ماہ پہلے انھیں سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں دیکھا تھا۔ سبحان اللہ کیا کلام تھا اور پڑھنے کا انداز بھی کیسا دلنشین تھا۔ ان کا نورانی چہرہ اور خوب صورت آواز اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ وہ میرے حال پر بہت مہربان تھے۔ اسی رشتے سے میں نے آپ کو ''محترمی'' کی بجائے ''عزیزی'' لکھا ہے۔ ان شاء اللہ آپ ہمیشہ عزیز ہی رہیں گے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ اس وقت زیادہ نہیں لکھا جا رہا کیوں کہ میرا قلم خاصا پرانا ہو گیا ہے اور لکھنے میں دقت ہوتی ہے۔

دعا گو •

مینا لکھنوی

(۴)

دبئی۔ ۲۳/ مارچ ۱۹۹۳ء

بزرگوار محترم!

سلام مسنون،

آپ کا محبت نامہ ملا اور غزلیں بھی۔ والد مرحوم سے تعلق خاطر کا آپ نے خوب خیال رکھا۔ نہایت عمدہ غزلیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فرصت ناگ پوری نے میرے ہی خیالات و جذبات کو منظوم کر

دیا ہے۔ یہ غزلیں پڑھ کر میرے اندر چھپا ہوا شاعر باہر آ گیا ہے۔ اس کی طرف سے بھی سلام قبول کیجیے۔

حضرت فرحت ناگ پوری کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔ امید ہے وہ آئندہ بھی میرے حال پر کرم فرماتے رہیں گے۔ مجھ سے جو خدمت ہو سکے گی، اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ منسلکہ ڈرافٹ انھیں کے حساب میں بھیج رہا ہوں۔ میرے ایک دوست کے دوست یہاں مشاعروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہر سال کسی شاعر کا جشن مناتے ہیں اور پاک و ہند کے بہت سے شاعروں کو بلا کر مشاعرہ بازی کرتے ہیں۔ عنقریب یہ مشاعرہ ہونے والا ہے۔ کوشش کروں گا کہ اس میں غزلیں سنانے کا موقع مل جائے۔

”خرکار“ کے جس شمارے میں میری غزل شائع ہو، اس کی دس کاپیاں قیمتاً بھجوا دیا کیجیے۔ اپنا پرانا قلم پھینک دیجیے۔ میرے ایک دوست کراچی جانے والے ہیں، ان کے ہاتھ نیا قلم بھجواؤں گا۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

نیاز مند
خلیل بے خود

(۵)

کراچی ۳/نومبر ۱۹۹۳ء

عزیز گرامی قدر!

خوش رہیے۔ گزشتہ مہینوں میں آپ نے اردو دنیا میں جو نام پیدا کیا ہے، اس پر میں جتنا فخر کروں کم ہے۔ آپ کے غزلوں کی تعریف میں ”خرکار“ کے دفتر میں روزانہ آٹھ دس خط موصول ہوتے ہیں۔ فرحت ناگ پوری نہایت توجہ سے آپ کے لیے فکر سخن کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہفتے میں دو دن صرف آپ ہی کا کام کرتے ہیں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ وہاں کے مشاعروں اور شعری نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اور بطور شاعر آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ آپ کے اس خیال سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے کہ آپ کا مجموعہ کلام اب شائع ہو جانا چاہیے۔ ڈاکٹر منیف ذوق کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک آپ کا مجموعہ شائع نہیں ہوگا، اس وقت تک اہل ادب کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کس درجے کے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ فیض کے بعد آپ ہی وہ شاعر ہیں جس کے ہاں عصری حسیت عروج پر نظر آتی ہے۔ آپ کا دیوان میں مکتبہ خرکار سے چھاپوں گا۔ اگر کچھ رقم پیشگی مل جائے تو فوراً کتابت شروع کرا دی جائے گی۔ ان شاء اللہ دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی۔

آپ نے رسالے کے خریدار بنانے میں خرکارنوازی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کا شکریہ ادا کر کے میں آپ کے خلوص کو آلودہ رسمیات نہیں کرنا چاہتا۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو ایسی نیکیوں کی مزید توفیق دے۔ آمین۔

دعا گو

مینا لکھنوی

(۶)

دبئی ۲۲/ دسمبر ۱۹۹۳ء

بزرگوار محترم!

آپ کا خط سیروں خون بڑھا دیتا ہے۔ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے دیوان کی اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمائی ہے۔ اخراجات کی آپ بالکل پروانہ کریں۔ بس اس کا خیال رکھیں کہ گیٹ اپ ایسا ہو کہ جو بھی دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر حنیف ذوق میری شاعری کے بارے میں اتنی عمدہ رائے رکھتے ہیں۔ مجھے فیض کے برابر جگہ دینا ان کے صاحب علم و نظر ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ڈاکٹر صاحب میرے دیوان کا دیباچہ لکھ دیں۔ اس سلسلے میں جو خدمت میرے لائق ہو تحریر فرمائیے۔ فلیپ آپ کس سے لکھوائیں؟ میری حقیر رائے یہ ہے کہ دائیں طرف کا فلیپ آپ خود لکھیں اور بائیں طرف کا حضرت فرصت ناگ پوری سے لکھوائیں۔ آپ دونوں بزرگ میرے دائیں بائیں ہوں گے تو میرے ادبی قد و قامت میں اضافہ ہوگا۔ عقبی سرورق پر میری تصویر ہونی چاہیے اور تصویر کے نیچے میرے حسب حال میرا ہی کوئی شعر ہو۔ شعر کا انتخاب حضرت فرصت ناگ پوری پر چھوڑتا ہوں کہ وہ میرے شعری مزاج کو خوب سمجھتے ہیں۔

دیوان کے مصارف طباعت کا تخمینہ معلوم ہو جائے تو پوری رقم یک مشت ارسال کر دوں گا۔ فی الحال کام شروع کرنے کے لیے کچھ رقم بھیج رہا ہوں اور ہاں دیوان کی رونمائی کس انداز سے ہوگی؟ اس کی کچھ تفصیل لکھیے تا کہ میں اس جہت میں کوئی عملی اقدام اٹھا سکوں۔

آپ کا خادم

خلیل بے خود

(۷)

کراچی ۱۵/ جنوری ۱۹۹۴ء

عزیز مکرم! دعائیں۔ خط کا جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں اس دوران آپ ہی کے کام میں مصروف رہا۔ دس بارہ کاتبوں سے کتابت کے نمونے حاصل کیے اور ماہرین کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کیے۔ کوئی نمونہ پسند نہ آیا تو یہ طے پایا کہ آپ کا دیوان نوری نستعلیق میں کمپوز کرایا جائے۔ کام شروع ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ایک ماہ میں کمپوزنگ کا کام مکمل ہو جائے گا۔ توقع ہے کہ مارچ کے آخر تک کتاب چھپ جائے گی۔ اخراجات کا تخمینہ الگ کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ اسے آپ ملاحظہ کر لیجیے۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے دیباچہ لکھ دیا ہے اور اب وہ اس پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے آپ کی شاعری میں ترقی پسند عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اتنی اہم کتاب میں ایک دیباچہ کم پڑے گا۔ کم از کم ایک دیباچہ اور ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ اسلام آباد سے نظیر صدیقی نے محبوب خزاں کی شاعری پر ایک مضمون ''خرکار'' میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے جو خزاں کی شاعری سے زیادہ آپ کی شاعری کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے مضمون میں جہاں جہاں خزاں کا نام آیا ہے وہاں ہر جگہ میں نے آپ کا نام لکھ دیا ہے۔ خزاں کے جو اشعار نمونہ پیش کیے گئے تھے ان کی جگہ آپ کے اشعار درج کر دیے ہیں۔ نظیر صدیقی سے میرے مراسم بہت گہرے ہیں، اس لیے انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ جب میں انھیں اس دیباچے کا معاوضہ بھیجوں گا تو وہ بہت خوش ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ یہ پیشکش کریں کہ انھوں نے فیض پر جو مضمون لکھا تھا، اسے بھی مناسب قطع و برید کے بعد آپ کے حسب حال بنا لیا جائے۔

دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلے جلسہ ہوگا اور پھر عشائیہ۔ آج کل لوگ ایسی تقریبات میں عشائیے ہی کی وجہ سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کا تخمینہ بھیج رہا ہوں۔

اگلے سال ''خرکار'' کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کی گولڈن جوبلی منانے کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ کے دیوان کی رونمائی کے موقع پر ایک بروشر شائع کیا جائے گا جس میں صنعتی و تجارتی اداروں اور بنکوں کے اشتہارات ہوں گے۔ اشتہارات کی ساری آمدنی آپ کی طرف سے گولڈن جوبلی فنڈ میں بطور عطیہ دے دی جائے گی۔ اس سے ملک کے ادبی حلقوں میں آپ کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوگا۔ یہاں کے اداروں کے اشتہار تو میں حاصل کر لوں گا، البتہ خلیج کی ریاستوں سے اشتہارات آپ ہی کو حاصل کرنے ہوں گے۔ وہاں کے کئی ادارے یہاں کے اخبارات میں اشتہارات شائع کراتے

WWW.KITABOSUNNAT.COM

رہتے ہیں۔ اگر ایسے آٹھ دس اداروں کے اشتہار بھی مل جائیں تو گولڈن جوبلی شان دار پیمانے پر منائی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دیوان کی رونمائی میں آپ کی شرکت لازمی ہوگی۔ آپ یہاں تشریف لائیں گے تو آپ کے اعزاز میں دعوتیں بھی ہوں گی۔ ان دعوتوں کے اخراجات تخمینے میں شامل نہیں کیے گئے۔ یہ بات اس لیے آپ کے کان میں ڈال دی ہے کہ اخراجات کی یہ مد بھی آپ کے پیش نظر رہے۔

دعا گو

مینا لکھنوی

(١٣ جولائی ١٩٩٥ء)

ردّیات ادب کے سالانہ جائزے

اردو ادب کی تاریخ میں معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ میر تقی میر سے لے کر ڈاکٹر انور سدید تک شاید ہی کوئی اہم ادیب ہوگا جس کی اپنے کسی معاصر سے ان بن نہ ہوئی ہو اور طرفین نے ایک دوسرے کے خلاف دل کا غبار صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کیا ہو۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں کئی ادبی معرکہ آرائیوں کا ذکر نمک مرچ لگا کر کیا ہے اور آزاد سے تقریباً پچاس پچپن سال پہلے لکھنو کے ایک شاعر سعادت خان ناصر نے تو ''خوش معرکہ زیبا'' کے نام سے ایک پورا تذکرہ ہی لکھ ڈالا تھا جس میں متعدد ادبی معرکہ آرائیوں کا چشم دید احوال ملتا ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ''نقوش'' کا ادبی معرکہ نمبر تو اس موضوع پر ان سائیکلو پیڈیائی کام ہے۔ ان سب چیزوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی ادبی جھگڑا سال دو سال سے زیادہ نہیں چلا۔ فریقین میں یا تو صلح کرا دی گئی یا پھر دونوں تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔

اردو کا دلچسپ ترین ادبی معرکہ وہ ہے جو گزشتہ پچیس برسوں سے ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے درمیان جاری ہے۔ دونوں شریف آدمی ہیں مگر شرافت کا الگ الگ معیار رکھتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں سے محبت ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا معیار شرافت، ان دونوں کے معیار سے جداگانہ نوعیت کا ہے۔ سنا ہے آج کل لاہور میں معرکہ سدید و سلیم کی سلور جوبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا اور پھر اس کتاب کی تقریب رونمائی میں دونوں کو مدعو کیا جائے گا اور انھیں آمنے سامنے بٹھا کر اپنا اپنا موقف بیان کرنے کی درخواست کی

WWW.KITAABISTAN.COM

جائے گی بشرطیکہ کوئی موقف ہو۔ یہ بات ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ اکثر جھگڑے اختلاف رائے کی وجہ سے نہیں، افتادِ طبع کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔

کتاب کی اشاعت کی حد تک تو ہم اس تجویز سے متفق ہیں کہ بہت سی نادر و نایاب، دلچسپ اور فکر انگیز تحریریں ایک مرتبہ پھر پڑھنے کو مل جائیں گی اور دونوں کے بہت سے ”محاسن“ جنھیں ہم بھول چکے ہیں، دوبارہ ذہن میں تازہ ہو جائیں گے لیکن دونوں کو آمنے سامنے بٹھانے کی بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب دینے کی بجائے ہم ایک واقعہ بیان کیے دیتے ہیں۔

تیس بتیس سال پہلے کی بات ہے کہ مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھوں نے ایک ادبی کانفرنس منعقد کی اور اس میں جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کو مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ان دونوں میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ مصطفیٰ زیدی نے ان دونوں بزرگوں کو کراچی سے نواب شاہ لے جانے کا کام طفیل احمد جمالی کے سپرد کیا (افسوس کہ اب لوگ جمالی کو بھول گئے، ایک زمانے میں وہ اپنی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔) سفر ریل گاڑی سے کرنا تھا، اس لیے جمالی نے ایک گاڑی سے جوش صاحب کو روانہ کیا اور دوسری سے شاہد صاحب کو لے کر وہ خود نواب شاہ پہنچے۔ مصطفیٰ زیدی نے جمالی سے کہا: ”اگر آپ ان دونوں کو ایک ہی گاڑی سے لے کر آتے تو مجھے استقبال کے لیے دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔“ جمالی نے جواب دیا ”آپ کو زحمت کا تو خیال ہے لیکن اس کا خیال نہیں کہ اگر یہ دونوں بزرگ ایک ساتھ سفر کرتے اور راستے میں ان کے درمیان صلح ہو جاتی تو اس حادثے کا کون ذمہ دار ہوتا؟“

اس واقعے سے جو اخلاقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اس کی بنا پر ہمارا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی محفل میں یک جا نہیں ہونا چاہیے۔ آنکھ کی مروت بڑی ظالم چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی غلط فیصلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر مجوزہ کتاب کی تقریب رونمائی میں آمنے سامنے بیٹھ کر ان دونوں نے کوئی غلط فیصلہ کر لیا تو اردو ادب کی تاریخ کا دلچسپ ترین ادبی معرکہ قبل از وقت اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

اخبار ”جنگ“ لاہور کے ادبی صفحے کے نگران حسن رضوی اس قسم کے معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ۲۴/ اکتوبر کے اخبار میں ہمارے ممدوحین کا ایک مشترکہ انٹرویو شائع کیا ہے۔ مشترکہ ان معنوں میں کہ ایک ہی سوال نامہ دونوں کے سامنے رکھا گیا اور اس کے جوابات الگ الگ حاصل کیے گئے۔ اس انٹرویو کی تمہید میں حسن رضوی لکھتے ہیں: ”ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے درمیان ہونے والا

WWW.KITABOSUNNAT.COM

یہ مکالمہ خوف فساد کے پیشِ نظر دونوں کو کسی ایک جگہ آمنے سامنے بٹھا کر ریکارڈ کرنے کی بجائے الگ الگ جگہوں پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ تاہم ادب کے ان ممتاز ناقدین کے انٹرویوز ایک ساتھ شائع کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ادب کے سنجیدہ حلقوں کو ادب کے پیش منظر میں کام کرنے والے ادبی گروہوں اور ادبی مفادات نیز ان کے تصادم سے پیدا ہونے والی صورت حال سے آگاہ کیا جا سکے۔"

ان دونوں سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ ڈاکٹر انور سدید نے اس رسمی سوال کا جواب بھی رسمی سا دیا جو یہ ہے: "پڑھتے وقت ذہن میں کچھ نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، لکھتے وقت ان سوالات کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں" ہمارا تجربہ ڈاکٹر انور سدید سے بالکل مختلف ہے۔ ہم خالی الذہن ہو کر پڑھتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کوئی گرہ پیدا ہی نہیں ہوتی جسے کھولنے کے لیے لکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ لکھتے ہم اس لیے ہیں کہ ہمارے خالی الذہن ہونے کا دستاویزی ثبوت موجود رہے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمارے مقابلے پر خاصے خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس سوچنے والا ذہن ہے، ذہن میں سوالات ہیں، سوالات میں گرہیں ہیں اور ہر گرہ کی گرہ میں بے شمار ادبی مسائل ہیں۔ یہ سب مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں سوائے ایک مسئلے کے جس کا نام ہے ڈاکٹر سلیم اختر۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے حریف کی طرح ادیبانہ تکلف سے کام نہیں لیا۔ جو اصل حقیقت تھی صاف صاف بیان کر دی۔ فرمایا: "لکھنا میرے لیے ایک طرح کا نشہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ نشہ حدِ اعتدال سے بڑھ گیا ہے، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نشے سے انھیں کوئی نقصان پہنچا ہے۔ حالاں کہ نشہ اور نقصان لازم و ملزوم ہیں۔ ادب کا نشہ بھی کیا نشہ ہے کہ اس میں چور ہو کر لکھنے والا تو عالم سرور میں رہتا ہے اور سارے نقصان پڑھنے والوں کے حصے میں آتے ہیں۔

ایک سوال یہ تھا: "موجودہ عہد میں تنقید کو خوشامد سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ دونوں نے حیرت ناک حد تک اس سوال کا یکساں جواب دیا ہے۔ دونوں کا خیال یہ ہے کہ اگر کتابوں کی تقاریب رونمائی پر پابندی لگا دی جائے اور ادیبوں کے ساتھ شامیں منانے کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو تنقید ہی نہیں پورا ادب صحت مند ہو جائے گا۔

ہم نہایت ادب کے ساتھ دونوں ڈاکٹروں سے اختلاف کی جرأت کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریباتی تنقید نے ہمارے ادب کو ایک مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ لیکن اس تنقید کے بارے

میں کیا خیال ہے جو دوستوں کی کتابوں پر لکھی جاتی ہے اور جو جلسوں میں تو نہیں پڑھی جاتی لیکن رسالوں میں چھپوا دی جاتی ہے۔ دونوں ڈاکٹروں نے اپنے دوستوں اور ان کی بے شمار کتابوں پر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں دوستی کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تعریف جلسوں میں ہو تو بری، رسالوں میں ہو تو مستحسن۔ اگر تقریباتی یا فرمائشی تنقید کی طرح دوستانہ تنقید پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بہت سے نقاد لکھنے سے دست بردار ہو کر شریفانہ مشاغل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

دونوں ڈاکٹر ہر سال ادبی جائزے لکھتے ہیں جنھیں ڈاکٹر سلیم اختر ہماری خوشی کی خاطر ”ناجائزے“ کہنا پسند کرتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان سالانہ جائزوں کے حوالے سے جو سوال کیا گیا اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے اپنے حریف کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں:

”گارساں دتاسی کے بعد سے زیادہ سالانہ جائزے میں نے اور سلیم اختر نے لکھے ہیں۔“

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر ڈاکٹر انور سدید کو اپنی اور سلیم اختر کی تعریف ہی کرنی تھی تو بے چارے گارساں دتاسی کی روح کو شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دتاسی نے اردو کے مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر جو معلومات فراہم کیں، وہ ہمارے ادب کی تاریخ کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے دونوں ڈاکٹروں کی فراہم کردہ معلومات پر اس وقت تک اعتبار نہیں کیا جا سکتا جب تک دوسرے ذرائع سے ان کی تصدیق نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ڈاکٹروں کے سالانہ جائزے ادب سے زیادہ ردیات ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔

معترضین کی اس سفاکانہ رائے سے ہمیں اتفاق نہیں۔ گارساں دتاسی کی روح شرمندہ ہوتی ہے تو ہو، یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ڈاکٹروں نے جائزہ نگاری کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا ہے۔ اس فن کی قدر آج نہیں تو کل ضرور ہوگی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ ان جائزوں کا ”اصل فائدہ آج سے دس بیس برس بعد ظاہر ہوگا جب ان جائزوں کی مدد سے کتابوں کے سنین یا کوائف وغیرہ متعین کرنے میں مدد ملے گی۔“

بعض کج فہم معترض یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ان جائزوں میں جن کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ آئندہ دس بیس برسوں میں ضائع ہو چکی ہوں گی اور ان کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ یہ جائزے ہی رہ جائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کتابیں دس بیس برسوں بعد ضائع ہونے والی ہیں، ان کے بارے میں جائزے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر اس کی بھی کیا ضمانت ہے کہ دس بیس برس بعد یہ جائزے بھی ضائع نہیں ہو جائیں گے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM

معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز فانی ہے۔ اگر بہت سے فانی انسانوں کی سوانح عمریاں لکھی جاسکتی ہیں تو آئندہ بیس برسوں میں فنا ہو جانیوالی کتابوں کے سنین طباعت اور دیگر کوائف کیوں نہیں محفوظ کیے جاسکتے۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کریں گے۔ اگلے بیس برسوں میں "بفرض محال" "نظیر صدیقی کی ساری کتابیں ضائع ہو جائیں تو ہم دونوں ڈاکٹروں کے سالانہ جائزوں کی مدد سے ضائع شدہ کتابوں کا سراغ لگاسکتے ہیں بشرطیکہ اس کام سے پہلے خود جائزے ہی ضائع نہ ہوگئے ہوں۔

ان جائزوں کے ذریعے ڈاکٹر سلیم اختر نے جو نقصانات اٹھائے ہیں، ان کی تفصیل انہی کے الفاظ میں یہ ہے: "جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میری بہت سی مخالفتیں، دشمنیاں اور گالیاں صرف اس سالانہ ادبی جائزوں کی وجہ سے ہیں۔ کتنی ہی کوشش کرو تمام کتابوں کا تذکرہ ناممکن ہوتا ہے کیوں کہ کتابوں تک رسائی ہی ناممکن ہوتی ہے۔ اب جس کتاب کا ذکر رہ گیا وہ ساری عمر کے لیے دشمن بن گیا..... اس جائزہ نگاری میں میرے لیے سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔"

ہماری دلی ہمدردیاں ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ ہیں۔ افسوس کہ انھیں ان کی محنت کا صلہ مخالفتوں، دشمنیوں اور گالیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر برا نہ مانیں تو ہم مشورہ دیں گے کہ انھیں قناعت سے کام لینا چاہیے۔ جتنا صلہ اب تک مل چکا ہے آئندہ زندگی میں اسی کو کام میں لائیں، مزید کی ہوس نہ کریں، صرف وہی ادبی کام کریں جسے آنے والے برسوں میں نا جائزوں کی وجہ سے نہیں اپنی قدر و قیمت کی وجہ سے یاد رکھا جائے۔

(١٦ نومبر ١٩٩٥ء)

شاعری پر شب خون

شمس الرحمن فاروقی اردو کے ان چند نقادوں میں سے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں رجحان ساز نقاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی محمد حسن عسکری بھی دے چکے ہیں۔ جنھوں نے ایک مرتبہ یہ لکھا تھا کہ حالی کے بعد اردو تنقید فاروقی کے ذریعے ایک نئے معیار سے آشنا ہوئی ہے۔ فاروقی کا مطالعہ حیران کن حد تک وسیع ہے۔ وہ بیک وقت مشرق و مغرب کی ادبی روایات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انھیں عروض اور معانی و بیان جیسے بے برکت علوم پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔

فاروقی ۱۹۶۶ء سے رسالہ ''شب خون'' شائع کر رہے ہیں گزشتہ تین دہائیوں میں اس رسالے نے جدید ادبی رجحانات کو متعارف کرانے میں اور جدید ادیبوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ''شب خون'' رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آب یاری کر رہی ہے۔ جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفات ارضی کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں، اسی طرح ''شب خون'' سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔

جدیدیت اور جدیدیوں سے ہماری کوئی ذہنی قربت نہیں ہے۔ ہم پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ ہمیں کسی جدید چیز میں اس وقت تک کوئی خوبی نظر نہیں آتی جب تک اس پر قدامت کی گرد جم نہ جائے۔ فاروقی کو بھی ہم نے اسی لیے پسند کیا ہے کہ انھیں لکھتے ہوئے ۴۰، ۴۵ برس گزر چکے ہیں۔ اپنی ساری قدامت پسندی کے باوجود ہم ''شب خون'' کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ جب بھی اس کا تازہ شمارہ آتا ہے تو ہم سب کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے کے بعد بھی سب کام چھوڑنے پڑتے ہیں کیوں کہ کچھ دنوں تک ہم اس لائق نہیں رہتے کہ کوئی کام کر سکیں۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے ''شب خون'' کے پانچ شمارے ایک ساتھ ملے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ دولت بھی وہ جس کے بارے میں یگانہ نے کہا تھا:

دنیا کا کیا بھروسا، دولت کا کیا ٹھکانا
دولت تو دولت آخر لٹنے کی نوبت آئی

سو اس دولت کو بے دریغ لٹانے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

''شب خون'' کے تازہ شماروں میں سے کسی ایک میں اختر الایمان کا وہ معرکہ آرا انٹرویو بھی شائع

ہوا ہے جس میں انھوں نے اقبال، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے کئی شاعروں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہترین اردو شاعری، پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ اختر الایمان کا یہ فیصلہ پاکستانی شاعروں کو ضرور ناگوار گزرے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ ہماری شاعری کا مطالعہ کیے بغیر یک طرفہ فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہوں، اختر صاحب نے جو فیصلہ دیا ہے، اس کے لیے انھیں پاکستانی تو کیا، ہندوستانی شاعری بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ فیصلہ اختر صاحب نے اپنی شاعری کے حوالے سے دیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں، اگر وہ بھوٹان کے باشندے ہوتے تو پھر بہترین شاعری وہیں ہو رہی ہوتی۔

چوں کہ ہم نے انصاف پسند طبیعت پائی ہے، اس لیے ہمارے دل نے یہ گواہی دی کہ اختر الایمان جیسا بڑا شاعر غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے یقیناً اس کی بنیاد ٹھوس دلائل پر نہیں ٹھوس حقائق پر ہوگی۔ صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہم نے ''شب خون'' کے پانچویں شماروں میں شائع شدہ غزلوں کو بغور پڑھا۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اختر صاحب مطالعے کے بغیر جس نتیجے پر پہنچے تھے، مطالعے کے بعد ہمیں اسی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اب ہماری بھی یہی رائے ہے کہ بہترین اردو شاعری ہندوستان ہی میں ہو رہی ہے، پاکستانی شاعر خواہ مخواہ اپنا اور پڑھنے والوں کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ ہندوستانی شاعروں کی تقلید کر کے اپنی شاعری کو بہتر بنائیں، ورنہ کوئی دوسرا آبرومندانہ شغل اختیار کریں تاکہ سیاست کی طرح شاعری بھی ہمارے ملک کی رسوائی کا باعث نہ ہو۔

ہندوستان کی اردو شاعری کی خصوصیات کو ایک کالم میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس کے لیے دفتر درکار ہوں گے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر خاص خاص خوبیوں ہی کی طرف اشارہ کریں گے تاکہ کسی حد تک یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کی اردو شاعری، پاکستان کی شاعری سے کیوں بہتر ہے اور عالمی ادب کی سطح پر اس کی الگ شناخت کیا ہے۔ ہم بحث کے دوران صرف شعر درج کریں گے، شاعروں کے نام نہیں بتائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے صرف نام ہی الگ الگ ہیں، باقی سب کچھ یعنی کلام اور انداز بیان وغیرہ ایک ہی جیسا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلیں کسی ایک شاعر نے لکھ کر بہت سے شاعروں کے نام سے چھپوا دی ہیں۔ ممکن ہے یہ ''ایک شاعر'' خود شمس الرحمٰن فاروقی ہوں۔ انھوں نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ ان کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ ۲۰۔۲۵ مختلف ناموں سے غزلیں لکھ دیں۔ بہر حال اصل شاعر کوئی بھی ہو، ہم شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلی چیز جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر کو نئے نئے مضمون سوجھتے ہیں یا یوں کہیے کہ خاصی دور کی سوجھتی ہے: مثلاً

کپڑوں کی الماری کھولے کھڑا ہوں میں حیران
نہیں ہے میرے ناپ کا اس میں کوئی ایک لباس

کسی دوسرے کے کپڑوں کی الماری کھول کر حیران ہونا ایک بالکل نیا خیال ہے۔ اپنے کپڑوں کی الماری شاعر نے شاید اس لیے نہیں کھولی کہ اس میں سوائے خلعت سخن کے کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا رقیب کے کپڑوں کی الماری کھول لی۔

حیران ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کو چونکنے کا بھی شوق ہے اس شوق کی خاطر فرماتے ہیں:

رستے میں کچھ تو ایسا ہو جس کو دیکھ کر چونک پڑیں
اور نہیں تو دو کاریں ہی آپس میں ٹکرا جائیں

جس راستے میں کاروں کے ٹکرانے کا منظر دیکھنے کی خواہش ہے، وہ راستہ کالج کی طرف جاتا ہے کیوں کہ جناب شاعر ابھی زیر تعلیم ہیں۔ ایک شعر میں انھوں نے اپنا تعلیمی نصاب بھی بتا دیا ہے:

میرے کالج میں ہر جانب ترا ہی نام لکھا ہے
تجھے ہی پڑھنے جاتا ہوں تجھے ہی پڑھ کے آتا ہوں

جو شاعر دوران تعلیم ایسے عمدہ شعر کہہ سکتا ہو، تعلیم کی تکمیل کے بعد تو معلوم نہیں وہ کیا قیامت ڈھائے گا لیکن قیامت ڈھانے سے پہلے بھی اسے کچھ ضروری کام کرنے ہیں: مثلاً دو کام تو اس شعر میں بتائے ہیں:

نیش نو صوتیات میں رکھ دو
مغز جاں بھی دوات میں رکھ دو

ایک کام یہ بھی ہے:

چھت پر کبوتروں کے لیے صرف تھوڑی دیر
مشکل سہی یہ کام مگر کر لیا کریں

شاعر کو صرف کبوتروں سے نہیں، ہر طرح کے پرندوں سے دلچسپی ہے۔ یہاں تک کہ اسے باتوں اور مداراتوں کے پرندے بھی اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ تواضع بھری باتوں کے پرندے
ان لبوں پر مداراتوں کے پرندے

پرندوں کے علاوہ اسے ہر طرح کے جانوروں سے بھی لگاؤ ہے اور اس نے ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے، خصوصاً کتوں، بلیوں اور خچروں پر تو ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ انھیں بلا تکلف میر کے بہتر نشتروں کا جواب سمجھنا چاہیے:

شہر کے سڑتے ہوئے ملبے میں
بلی کیا ڈھونڈ رہی ہے دیکھو

گھورتا کیا ہے کمینے کتے
سونگھتا کیا ہے کمینے کتے

سوچنے کا کوئی علاج نہیں
سوچتا کیا ہے کمینے کتے

نسب پر ہم نشینوں کے ہے اتراتا
شجاعت جنگ کا خچر معاذ اللہ

ہم تو سمجھتے تھے کہ پرندوں، چرندوں، درندوں اور گزندوں پر بہترین شاعری ساقی فاروقی نے کی ہے کیوں کہ خود اس کا شمار ادبی گزندوں میں ہوتا ہے لیکن اب معلوم ہوا، ساقی کو اس مقام تک پہنچنے میں خاصا وقت درکار ہوگا جہاں تک دبستان شب خون والوں کی رسائی ہے۔

غزل میں صرف اڑتے پرندے اور بھاگتے ہوئے جانور ہی دکھائی نہیں دیتے، چلتی ہوئی جوتیاں اور کھڑی ہوئی بسیں بھی نظر آتی ہیں:

جرابیں اور جوتیاں تو اس کی
سفر کے سارے عذاب میرے

سب تھکے ہارے لوگوں کو گھر چھوڑ کر
اپنے اڈوں پہ خالی بسیں رہ گئیں

دوسرا شعر علامتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ شعروں کو خالی بسیں سمجھنا چاہیے کیونکہ مسافرانِ معانی اپنے اپنے گھروں کو جاچکے ہیں۔

شب خونیوں نے غزل کا دامن اتنا وسیع کردیا ہے کہ اس میں مشرق سے مغرب تک، جنوب سے شمال تک اور جنوری سے دسمبر تک کی ہر چیز سما گئی ہے:

تمام رنج و ملال اوڑھے
بدن نے سب ماہ و سال اوڑھے
میں مغربوں کے سفر میں مشرق
جنوب میں بھی شمال اوڑھے
لہو میں سلگا کے جون موسم
ملے دسمبر میں شال اوڑھے

ان شعروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شال میں لپیٹ کر بھی اچھے شعر کہے جاسکتے ہیں۔

اوڑھنے بچھونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شاعری میں ایسے فلسفیانہ مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے جن پر پوری پوری کتابیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ صرف دو دو مصرعوں میں بات مکمل کردی گئی ہے:

محفل میں رات گیت یہ تھا مجھ سے وصل کر
گویا مغنیہ کو کوئی کام ہی نہیں

گناہ کھلتے ہیں میرے کس کس آنگن میں
یہ بھید مرنے سے پہلے مجھے بتانے ہیں

مگر شاعر نے یہ بھید نہیں بتائے، البتہ اس نے ایک اور اہم راز فاش کردیا ہے:

گئے سال کی روشنی پی گیا
نئے سال کا یہ کیلنڈر سیاہ

غزل میں پینے پلانے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں، نئی بات یہ ہے کہ غیر معروف غزل میں قافیہ مصرعے کے آخر میں آتا ہے، لیکن مندرجہ بالا شعر میں شروع میں آیا ہے۔ ''گئے'' اور'' نئے'' سے دونوں مصرعوں کا آغاز صوتی اعتبار سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی شاعر غزل کی ہیئت میں نئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے۔

ہم نے اب تک جو شعر پیش کیے ہیں، وہ موضوعات اور لفظیات کے اعتبار سے جدید ترین ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبان کی شاعری نہیں کی جا رہی۔ کی جا رہی ہے اور نوح ناروی سے بہتر کی جا رہی ہے:

کہیں بھی تو کیا اس سے سب جان کر کے
اڑا دے گا ایران توران کر کے
سمجھ بوجھ کے خوب پہچان کر کے
وہ جب مجھ سے بولا تو انجان کر کے

اسی طرح سہل ممتنع کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً

پس دیوار سایہ دھوپ ننگی
چلے آؤ میاں کوئی نہیں ہے

سہل ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اس شعر کو نثر میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی نثر میں ہے۔ معنوں میں تبدیلی کی بھی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ تبدیلی اسی چیز میں کی جا سکتی ہے جو موجود ہو۔

ہم نے اوپر جو شعر مثلاً درج کیے ہیں، ایسے ہی تقریباً دو سو شعر اور بھی ''شب خون'' کے پیش نظر شماروں میں موجود ہیں، لیکن ان شعروں کو نقل کرنے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے، اس کے فقدان کے سبب ہم نقل نویسی کی مزید خدمت انجام دینے سے معذور ہیں، لہٰذا پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ تھوڑے لکھے کو بہت جانیں اور یہ مان لیں کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر شاعری ہو رہی ہے۔

WWW.KITAABISTAN.COM

نمونۂ کلام

ابیات

☆ غم ہی لے دے کے میری دولت بیدار نہیں
یہ خوشی بھی ہے میسر کوئی غم خوار نہیں

☆ راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی زندگی سفر میں ہے

☆ اس شہر میں بن آئی ہے کیا بوالہوسوں کی
لیتا ہی نہیں نام کوئی اہل جنوں کا

☆ غم کے لمحے اگر نہ ملتے ہمیں
زندگی کتنی مختصر ہوتی

☆ اس کا کمرہ مہکتا تھا کس کی یادوں سے
وہ کون شخص تھا کیا تھا کہاں سے آتا تھا

☆ یہ بخل کیا ہے خداوند آسمان و زمین !
ہر ایک سمت ہے تو اور میں کہیں بھی نہیں

☆ شہر بستے ہیں خیالوں میں میرے
مجھے تنہائی نے سمجھا کیا ہے

☆ ہزار بار خود اپنے مکاں پہ دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

☆ تمام عمر کی تنہائیاں سمٹتی ہیں
یہی مرے درودیوار کا مقدر تھا

☆ کسے خبر ہے ، کہاں، کس دیار میں گزری
وہ زندگی جو تیرے انتظار میں گزری

☆ جو وصل و ہجر کا قصہ نہ درمیاں ہوتا
ہر ایک لمحہ محبت کا رائیگاں ہوتا

☆ تقاضے دل کے اگر جسم سے جدا ہوتے
تو وصل و ہجر کے لمحے گریز پا ہوتے

☆ زندگی اپنی کچھ اس طرح سے گزری ہے کہ تو
مل بھی جاتا تو ترا راستہ دیکھا کرتے

☆ بجھتی رہیں شمعیں بھی ڈوبا کیے تارے بھی
لیکن غم جاناں ہم تجھ سے کبھی ہارے بھی

☆ شام فراق بھی گئی، صبح وصال بھی نہیں
عشق وہاں ہے اب جہاں تیرا خیال بھی نہیں

☆ فقیر گوشہ نشیں اپنی ذات میں گم ہے
اب ایک اور ہی عالم نظر میں رہتا ہے

☆ ہر راستے کی ہے ایک منزل
اور گمرہی بھی ایک رستہ ہے

☆ خود سے بھی توڑ چکا ہوں تعلق اپنا
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں

☆ غزل کے لہجے میں ہوتی تھی گفتگو اس سے
وضاحتوں میں بھی ابہام رہ ہی جاتا تھا

☆ دل جس کو تلاش کر رہا ہے
وہ مجھ سے جدا ہی کب ہوا ہے

☆ نظر چرا کے وہ گزرا قریب سے لیکن
نظر بچا کے دیکھتا بھی جاتا تھا

☆ کبھی ہوا ہے، کبھی روشنی، کبھی دستک
عجیب سایہ سا اک میرے گھر میں رہتا ہے

☆ وفا کے باب میں اس سے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا

☆ میں کیسے ان خود فریب آنکھوں کو شام ہی سے اداس کرلوں
چراغ یہ خود بخود بجھیں گے تمام شب انتظار کر کے

☆ یاد آگیا کسی کی نگاہوں کا التفات
سایہ جہاں جہاں بھی سرہ گزار تھا

☆ اے کاش بتا دے کوئی شوریدہ سروں کو
ہر سایہ ترا سایۂ دیوار نہیں ہے

☆ ملا تو ایسے ملا جیسے جسم، جاں سے ملے
بچھڑ کے یہ بھی نہ پوچھا کہ حال کیسا ہے

WWW.KITAABISTAN.COM

غزل

معنیٔ زیست تک رسائی دے　　یا پھر اس قید سے رہائی دے
ناشناسوں کو جو خدائی دے　　وہ ہمیں کاسۂ گدائی دے
اس اندھیرے میں ایک جگنو بھی　　مہر تاباں ہے گر دکھائی دے
وہ خموشی ہے چونک اٹھتا ہوں　　اپنی آواز اگر سنائی دے
میری آنکھوں کو آئینہ تو کیا　　اب انھیں عکس آشنائی دے
اس بہانے ہی کر لے یاد مجھے　　اس کو توفیق بے وفائی دے
اب یہ آنکھوں کا حال ہے تجھ بن　　دیکھوں سب کچھ نہ کچھ دکھائی دے
یہ تصوف نہیں ہے تجربہ ہے　　خود کو دیکھوں تو وہ دکھائی دے
میں اسے دیکھوں، اپنے آپ کو وہ　　اب جہاں تک جسے دکھائی دے

WWW.KITAABISTAN.COM

غزل

یہی نہیں کہ وہ بے تاب و بے قرار گیا
مری رگوں میں بھی اک زہر سا اتار گیا

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

وفا کے باب میں اس سے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا

ہوائے سرد کا جھونکا بھی کتنا ظالم تھا
خیال و خواب کے سب پیرہن اتار گیا

WWW.KITAABISTAN.COM

غزل

قدم اٹھے تو عجب دل گداز منظر تھا
میں آپ اپنے لیے راستے کا پتھر تھا

دل ایک اور ہزار آزمائشیں غم کی
دیا جلا تو تھا، لیکن ہوا کی زد پر تھا

ہر آئینہ مری آنکھوں سے پوچھتا ہے یہ
وہ عکس کیا ہوئے، آباد جن سے یہ گھر تھا

ہر اک عذاب کو میں سہہ گیا، مگر نہ ملا
وہ ایک غم جو مرے حوصلے سے بڑھ کر تھا

یہ وہم تھا کہ مجھے وہ بھلا چکا ہو گا
مگر ملا تو وہ میری ہی طرح مضطر تھا

ہزار بار خود اپنے مکاں پہ دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

تمام عمر کی تنہائیاں سمیٹی ہیں
یہی مرے درودیوار کا مقدر تھا

اداس راتوں میں، پیہم سلگتی صبحوں میں
جو غم گسار تھا کوئی تو دیدۂ تر تھا

غزل

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مُڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا
کتنے چہروں پہ رہا عکس مری حیرت کا
مہرباں مجھ پہ ہوئے آئینہ پیکر کیا کیا
وقت کٹتا رہا مے خانے کی راتوں کی طرح
رہے گردش میں یہ دن رات کے ساغر کیا کیا
چشم خوباں کے اشاروں پہ تھا جینا مرنا
روز بنتے تھے، بگڑتے تھے مقدر کیا کیا
پاؤں اٹھتے تھے اسی منزل وحشت کی طرف
راہ تکتے تھے جہاں راہ کے پتھر کیا کیا
رہ گزر دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا
آزرانہ تھے مری وحشت دل کے سب رنگ
شام سے صبح تلک ڈھلتے تھے پیکر کیا کیا
اور اب حال ہے یہ خود سے جو ملتا ہوں کبھی
کھول دیتا ہوں شکایات کے دفتر کیا کیا

غزل

جو مثل باد صبا پاس سے گزر جائے
کبھی ہمیں بھی وہ پہچان کے ٹھہر جائے
گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے
یہ کیا طلسم ہے میں اس کو دیکھ بھی نہ سکوں
کہ جس کے جلووں سے دامان چشم بھر جائے
تو میرے دل میں مثال چمن مہکتا ہے
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے
میں آئینہ ہی نہیں، عکس بھی ہوں لیکن تو
وہ روشنی ہے جو دامن کشاں گزر جائے
ہے ایک خواب مری خود فریب آنکھوں میں
اگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے!

غزل

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خواب رواں ہے سو گزر جائے گا

ہر گزرتے ہوئے لمحے سے یہی خوف رہا
حسرتوں سے مرے دامن کو یہ بھر جائے گا

دل شفق رنگ ہوا ڈوبتے سورج کی طرح
رات آئے گی تو ہر خواب بکھر جائے گا

شدت غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا

چند لمحوں کی رفاقت ہی غنیمت ہے کہ پھر
چند لمحوں میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا

اپنی یادوں کو سمیٹیں گے بچھڑنے والے
کسے معلوم ہے پھر کون کدھر جائے گا

یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی ہی جن کا
زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جائے گا

غزل

گزر گئے ہیں جو دن ان کو یاد کرنا کیا
یہ زندگی کے لیے روز روز مرنا کیا
مری نظر میں گئے موسموں کے رنگ بھی ہیں
جو آنے والے ہیں ان موسموں سے ڈرنا کیا
بجھے ہوئے درودیوار کو بھی رونق دے
یہ خواب بن کے مری آنکھ سے گزرنا کیا
مثالِ اشک سرِدامن حیات ہوں میں
مری روانی ہی کیا، اور مرا ٹھہرنا کیا
ہجوم جلوہ سے جس راہ پر چراغاں تھا
جو بجھ گئی ہے تو اس راہ سے گزرنا کیا
مثال نقش قدم اپنی حیرتوں میں ہوں گم
وہ جا چکا ہے تو پھر انتظار کرنا کیا
گزر رہی ہے، غنیمت ہے زندگی، مانا
مگر یہ ایک ہی انداز سے گزرنا کیا

غزل

ساتھ کچھ دور چلا دولت دنیا کی طرح
پھر مجھے چھوڑ گیا، نقش کف پا کی طرح
خواب آنکھوں میں ہیں بن برسی گھٹائیں جیسے
اور آنکھیں، کسی تپتے ہوئے صحرا کی طرح
خلوت دل میں ہیں دنیا کے سبھی ہنگامے
پھر بھی تنہا نہیں کوئی دل تنہا کی طرح

WWW.KITAABISTAN.COM

غزل

درد کی رہ گزار پر چھوڑ کے یوں تو جا مجھے
پھر نہ دکھائی دے کہیں کوئی بھی راستا مجھے
سوز دوام کا صلہ، میری طرح کسے ملا
جس کے لیے جلا تھا میں خود وہ بجھا گیا مجھے
ختمِ سفر پہ بھی انھیں طے شدہ مرحلوں میں ہوں
کون کہاں بچھڑ گیا، کون کہاں ملا مجھے
دل کو اداس کر گئی ایک نگاہ التفات
سارے جہاں کی بے رخی دے گئی یہ صلہ مجھے
بوالہوسانِ شہر کو مژدہ کہ یہ ہجوم رنگ
میرے لیے ہی تھا مگر راس نہ آ سکا مجھے
عہد جنوں کی ساعتیں ، خواب نما حقیقتیں
یاد جب آ گئیں تو پھر یاد نہ کچھ رہا مجھے
لمحۂ عافیت کوئی بن نہ سکا نشان راہ
لے کے پھری کہاں کہاں عمر گریز پا مجھے

مآخذ

۱۔ خامہ بگوش۔ ایک مطالعہ، از وحید الرحمٰن خان،
اکادمی بازفت، اردو بازار کراچی؛ جولائی ۲۰۰۴ء

۲۔ مجلّہ ''دنیازاد'' کراچی؛ مدیر۔ شنزاد

۳۔ مجلّہ 'مخزن۔۹' لاہور؛ مدیر، ڈاکٹر وحید قریشی؛
جلد: ۵، شمارہ ۱: قائد اعظم لائبریری، لاہور، ۲۰۰۵ء

۴۔ مجلّہ 'مخزن۔۱۰' لاہور؛ مدیر، ڈاکٹر وحید قریشی
جلد: ۵، شمارہ: ۲: قائد اعظم لائبریری، لاہور؛ ۲۰۰۵ء

۵۔ ہفت روزہ 'ہماری زبان' نئی دہلی (بھارت)؛ مدیر، خلیق انجم؛
جلد: ۶۴، شمارہ: ۳۸، ۳۹، ۴۰: انجمن ترقی اردو، نئی دہلی (بھارت)، ۸ تا ۲۸، اکتوبر ۲۰۰۵ء

۶۔ ماہنامہ 'الحمرا' لاہور؛ مدیر اعلیٰ، شاہد علی خاں:
جلد: ۶، شمارہ: ۲ : دفتر الحمرا، ۲۴ جے بلاک ''المروت'' ماڈل ٹاؤن، لاہور فروری ۲۰۰۶ء۔

۷۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' مرتبہ: مظفر علی سید:

۸۔ ''مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ'' مرتبہ خلیق انجم: مقالہ
مشفق خواجہ۔ خود فراموش شاعر'' از مخمور سعیدی؛ ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر، نئی دہلی (بھارت)
دسمبر ۱۹۸۵ء

۹۔ سہ ماہی 'الزبیر' بہاول پور؛ مدیر: ڈاکٹر شاہد حسن رضوی؛
جلد: ۴۷، شمارہ ۱، ۲: اردو اکیڈمی، بہاول پور؛ ۲۰۰۶ء

۱۰۔ ماہنامہ شاہکار میگزین (احیائے علوم)؛ مدیر: سید قاسم محمود؛
جلد: ۱، شمارہ: ۸: ادارہ نشاۃ اسلامیہ، اقبال ایونیو، جوہر ٹاؤن۔II، لاہور۔

MUSHFIQ KHAWAJA
FANN AUR SHAKHSIYYAT

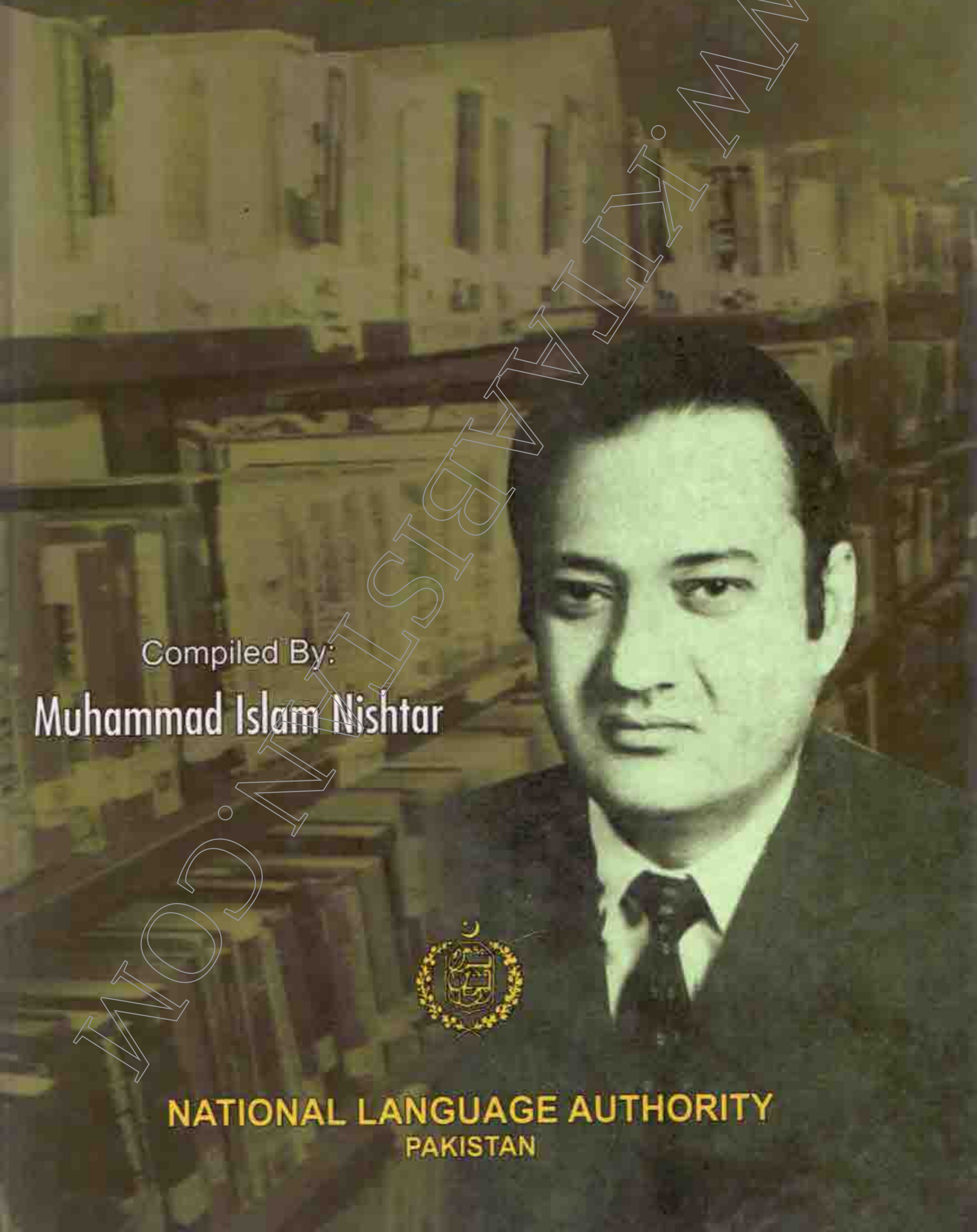

Compiled By:

Muhammad Islam Nishtar

NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY
PAKISTAN

WWW.KITAABISTAN.COM